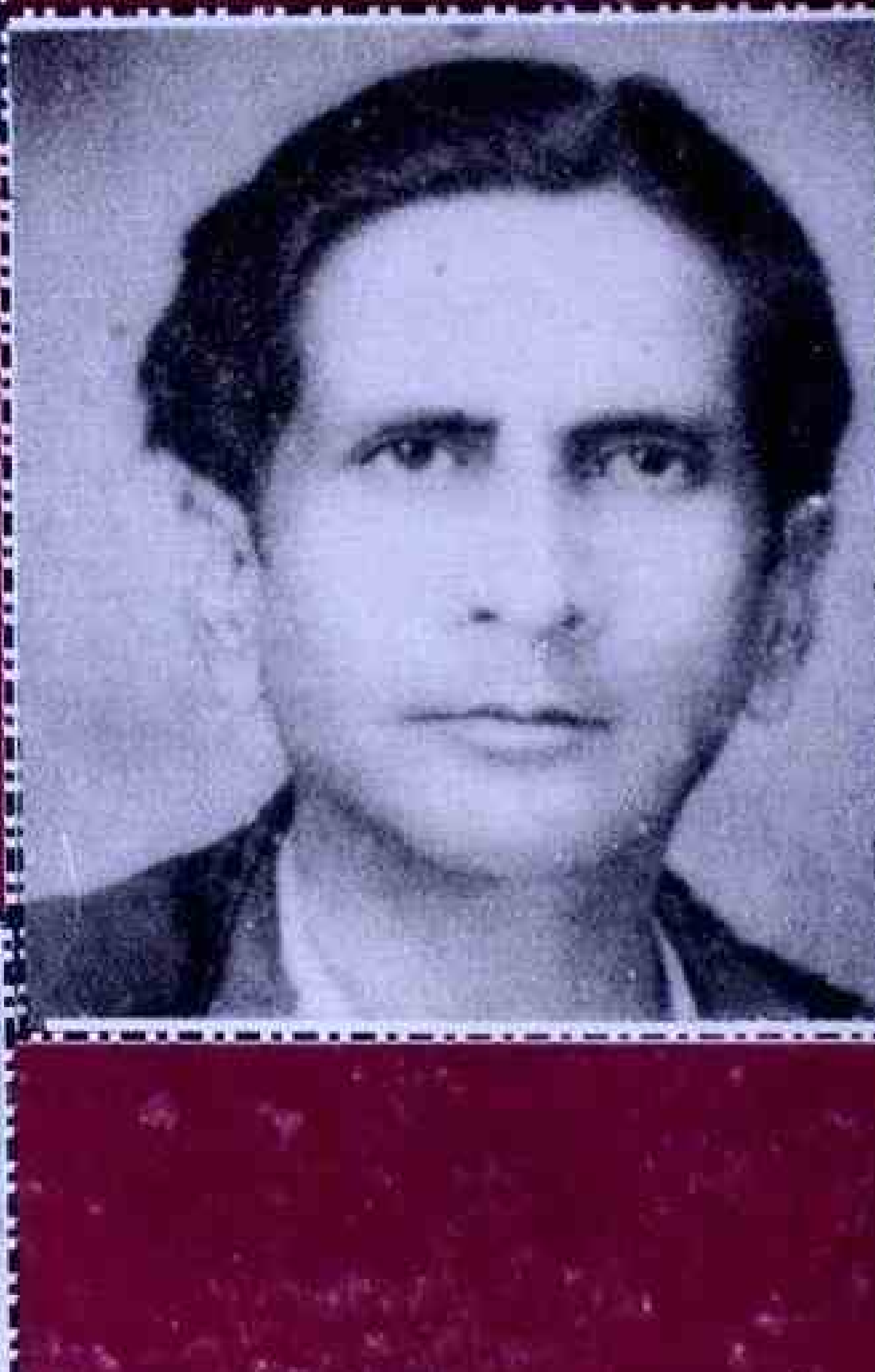
ہم ساتھ تھے





حمیدہ سالم



ہم ساتھ تھے

(اسرار الحق مجاز، انصار الحق ہروانی اور صفیہ جان نثار اختر)

ہم ساتھ تھے

(اسرار الحق مجاز، انصار الحق ہروانی اور صفیہ جان نثار اختر)

HaSnain Sialvi

حمیدہ سالم

انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۴۸۷

سنہ اشاعت ۱۹۹۹ء
قیمت .... ۱۲۵/=
بہ اہتمام .... اختر زماں
کمپوزنگ .... جاوید رحمانی، عارفہ خانم
طباعت .... ثمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی

Ham Sath The

(Asrarul Haq Majaz, Ansarul Haq Harwani
Aur Safia Jan Nisar Akhtar)

By : Hamida Salim

Price : Rs. 125/-

1999

Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
URDU GHAR : 212, Rouse Avenue, New Delhi-2

انتساب

امّاں اور ابّا کے نام

فہرست

حرفِ آغاز

ہم ساتھ تھے (اسرار الحق مجاز، انصار الحق ہروانی اور صفیہ جان نثار اختر) اس کتاب کی مصنفہ حمیدہ سالم صاحبہ کے بہن بھائیوں کی انتہائی دل چسپ داستان ہے۔ ان میں سے دو یعنی مجاز اور صفیہ اردو ادب اور انصار الحق سیاست کی معروف شخصیتیں ہیں اس کتاب پر اظہارِ خیال سے پہلے ضروری ہے کہ میں حمیدہ سالم صاحبہ کے بارے میں کچھ عرض کر دوں۔ حمیدہ سالم کے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں ان میں سب سے بڑی بہن عارفہ خاتون تھیں۔ ان کے بعد مجاز پھر انصار، صفیہ اور سب سے چھوٹی خود حمیدہ سالم۔

آج سے تین سال قبل حمیدہ سالم کی خودنوشت ''شورشِ دوراں'' شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کی تحریر میں پختگی کے ساتھ ساتھ بلا کی دل کشی بھی تھی کتاب کی طرزِ تحریر سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ حمیدہ سالم کی پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب میں بہت سلیقے سے زندگی کے واقعات بیان کیے گئے تھے خاص طور سے مجاز اور صفیہ (صفیہ اختر) کا تذکرہ بہت دل چسپ اور موثر طریقے سے کیا گیا تھا۔ لیکن ادب کی ان دونوں اہم شخصیتوں یعنی مجاز اور صفیہ اختر کا ذکر اتنا مختصر تھا کہ پڑھنے والے کو تشنگی کا احساس ہوتا تھا۔ اور یہی احساس خود حمیدہ سالم کو بھی تھا۔ اسی لیے انھوں نے ''ہم ساتھ تھے'' کے عنوان سے اس

کمی کو پورا کرنے کے لیے ایک دوسری کتاب کا خاکہ تیار کیا جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اس کتاب میں حمیدہ سالم نے اپنے بہن بھائیوں کے حالات بہت شگفتہ، دل چسپ اور دل نشیں انداز میں بیان کیے ہیں۔

کتاب کا آغاز خاندان کے مختصر حالات سے ہوتا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب جاگیر داری نظام نے دم توڑنا شروع کر دیا تھا۔ حمیدہ سالم کا تعلق اس خاندان سے تھا جو انگریزوں کے ذریعے لائے جانے والے سرمایہ دارانہ صنعتی نظام کے بالمقابل ان نئی سماجی اور ثقافتی اقدار کو اپنانا چاہتا تھا، جو روایت شکنی کے ساتھ ساتھ انسان دوستی اور سماجی انصاف سے عبارت تھا۔ لیکن جاگیر داری نظام کی ان روایات سے یکسر دامن چھڑانا، جن کی جڑیں ان کی تہذیب میں اندر تک پیوست تھیں، مشکل تھا۔ اس دور کے روشن خیال طبقے کے سب ہی لوگ اس ذہنی کش مکش کا شکار تھے۔

ابتدا میں اس خاندان میں خوشحالی تھی۔ زمینیں تھیں، خاصی جائداد تھی۔ آمدنی خاطر خواہ تھی۔ حمیدہ سالم کے والد سرکاری ملازم تھے اور اچھی خاصی تنخواہ ملتی تھی۔ حمیدہ سالم نے بڑی ایمانداری اور سچائی کے ساتھ اپنے خاندان کے حالات بیان کیے ہیں۔ خوشیاں بھی غم بھی۔ کامیابیاں بھی اور ناکامیاں بھی۔ جاگیر دارانہ نظام کے ٹوٹ کر بکھرنے کا نتیجہ زمین دار گھرانوں میں اس مفلوک الحالی کی شکل میں سامنے آیا جو باڑھ کے پانی کی طرح آہستہ آہستہ ان کے گھروں میں داخل ہوتی گئی۔ اس خاندان کے جو لوگ اس خستہ حالی سے بے طرح متاثر ہوئے ان میں شاید سب سے زیادہ دردناک قصہ ہمارے محبوب ترین شاعر اسرار الحق مجاز کا ہے۔

حمیدہ سالم صاحبہ نے اپنے خاندان کے جو حالات بیان کیے ہیں وہ کیفیت اتر پردیش کے تقریباً تمام زمین دار گھرانوں کی تھی اس لحاظ سے بھی اس کتاب کی بہت اہمیت ہے۔ حمیدہ سالم نے اپنے خاندان کے بہت سے دل چسپ واقعات بیان کیے ہیں۔ مثلاً سید مسعود غازی اور زہرا کی رومان پرور اور دل چسپ داستان بیان کر کے مجاز اور زہرا انصاری کے اس رومان کی تفصیل پیش کی ہے جو الف لیلیٰ کی داستانوں کی طرح اردو والوں کے دل و دماغ کا حصہ ہیں۔

مذہبی تقریبات جو اس عہد کی تہذیبی روایات کا اس قدر اہم حصہ تھیں جیسے دلّی کی پھول والوں کی سیر اور حضرت نظام الدین اولیا اور امیر خسرو کی ستر ہویں، ان کے ذکر سے بھی

حمیدہ سالم نے کئی خوب صورت تہذیبی مرقعے تیار کیے ہیں جیسے حضرت مخدوم شیخ العالم شیخ عبدالحق کے عرس کی تفصیلات اور خاص طور پر اس سلسلے میں سدا سہاگن کی تفصیل۔ اسی طرح نبی خانے کے چراغ دان کی تقریب۔ ایک بارہ دری تھی۔ وہاں ایک صندوق تھا، جس میں رسول پاک کا موئے مبارک رکھا ہوا تھا۔ یہ تقریب بارہ دن تک ہوتی تھی۔ دن کو میلاد کی محفلیں اور رات کو قوالیاں۔

محرم کی تقریبات کا ذکر انتہائی دل چسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

حمیدہ سالم نے اس عہد کی سماجی، ثقافتی، مذہبی اور اقتصادی زندگی کی بھرپور تصویر پیش کی ہے۔ کاشتکاروں، کسانوں اور کھیتوں پر کام کرنے والے مزدوروں، زمین داروں، تعلقداروں اور جاگیرداروں کے غیر انسانی احساس برتری کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

حمیدہ سالم نے اس کتاب میں اپنی والدہ اور والد کا ذکر قدرے اختصار کے ساتھ کیا ہے۔ یہ ذکر کتاب میں بس کہیں کہیں آتا ہے لیکن مختصر ذکر بھی اس انداز سے کیا گیا ہے کہ ان دونوں شفیق شخصیتوں کے نقوش ہمارے ذہن نشیں ہو جاتے ہیں اور ہمیں ان سے ذہنی لگاؤ ہو جاتا ہے۔

مجاز، انصار ہروانی اور صفیہ جان نثار اختر تینوں نے شہرت حاصل کی۔ مجاز اور صفیہ جان نثار اختر نے اردو شعر و ادب میں نام پیدا کیا لیکن انصار ہروانی جو بہن بھائیوں میں چوتھے نمبر پر تھے۔ ادب اور شاعری کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ انھیں کم عمری ہی سے سیاست میں دل چسپی پیدا ہو گئی۔

انصار ہروانی اپنے سب بہن بھائیوں کی طرح لڑکپن سے ترقی پسند اور آزاد خیال تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کے اعلا طبقوں کی لڑکیوں کو یا تو بالکل تعلیم نہیں دی جاتی تھی یا گھر پر قرآن شریف اور تھوڑی بہت اردو پڑھائی جاتی تھی۔ لیکن اس خاندان نے جاگیرداری خاندان کی روایتوں سے بغاوت کر کے لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کو بھی تعلیم کے لیے گھر سے باہر نکالا۔

ایسے آزاد خیال والدین کے علاوہ بھائیوں کو بھی عزیز و اقارب کے طعنے تشنے برداشت کرنے پڑتے تھے۔ لیکن انصار ہروانی اور مجاز دونوں اہل خاندان کے اس رویے سے بے نیاز رہے۔ جب اُن کی بہنوں حمیدہ سالم اور صفیہ کی تعلیم کا مسئلہ درپیش ہوا تو انصار

ہروانی تعلیمِ نسواں کے حامی ہونے کے ناطے پیش پیش تھے۔ داخلے کے فارم لانا، انھیں بھرنا اور مقررہ وقت پر انھیں داخل کرنا انھیں کی ذمہ داریاں تھیں۔ بہنوں کی ابتدائی تعلیم میں ان کا بڑا ہاتھ رہا۔

انصار صاحب کو اپنی بہنوں سے بہت محبت تھی۔ اس محبت کا اظہار اس طرح بھی ہوا۔ شادی سے پہلے کے صفیہ جان نثار اختر کا نام صفیہ خاتون اور حمیدہ سالم کا نام حمیدہ خاتون تھا۔ اُس زمانے میں مغربی تہذیب کے زیرِ اثر لڑکی کے نام کے ساتھ شادی سے پہلے باپ کا اور شادی کے بعد شوہر کا نام لگایا جانے لگا۔ انصار صاحب نے صفیہ کو صفیہ سراج اور حمیدہ کو حمیدہ سراج کر دیا۔

انصار ہروانی صاحب پوری کوشش کرتے رہے کہ ان کی بہنیں اعلا تعلیم حاصل کریں۔ حمیدہ سالم نے اپنی تعلیم کے بارے میں ایک واقعہ لکھا ہے۔ جب وہ علی گڑھ سے ہائی اسکول کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر چکیں تو اعلا تعلیم کا مسئلہ سامنے آیا گھر والوں کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اُنھیں لکھنؤ کے کرامت حسین کالج میں داخل کیا جائے یا اُسی شہر کے آئی ٹی کالج میں۔ آئی ٹی کالج کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ امریکن مشنری کی سرپرستی میں چل رہا تھا۔ اسٹاف میں زیادہ تر لوگ امریکہ کے ہی تھے۔ اساتذہ میں عورتیں ہی نہیں مرد بھی تھے۔ یہ سب کچھ تو تھا، لیکن کرامت حسین کالج کے مقابلے میں آئی ٹی کالج کا تعلیمی معیار بلند تھا۔ والدین مسلمان لڑکیوں کو کرامت حسین کالج میں داخل کرتے تھے۔ کیوں کہ اِس کالج میں پردے کا سخت انتظام تھا۔ حمیدہ آئی ٹی کالج میں داخلہ لینا چاہتی تھی، لیکن اِس کالج میں اعلا طبقے کی آزاد خیال اور مغربی تہذیب کے دِلدادہ خاندانوں کی لڑکیوں ہی کو داخلہ ملتا تھا۔ جب والدین حمیدہ سالم کو اس کالج میں داخل کرنے پر راضی ہو گئے تو پھر معلوم ہوا کہ داخلہ لینا آسان نہیں ہے۔ کالج والے طالبات کو بہت ٹھوک بجا کر لیتے تھے۔ انصار ہروانی صاحب پرنسپل سے ملے اور حمیدہ سالم کے سرٹیفکٹ اور سنہرے تمغے دِکھا کر اُنھیں متاثر کر لیا۔ اِس طرح حمیدہ سالم کی اعلا تعلیم کا آغاز ہوا۔

انصار ہروانی کو لڑکپن ہی سے سیاست سے دل چسپی تھی اور وہ کانگریس کے بہت اچھے ورکر اور پھر رہنما رہے تھے۔ انھوں نے بہت پہلے پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کی بیگم کو اپنے خلوص سے متاثر کر لیا تھا۔ کملاجی، ہروانی صاحب پر بہت مہربان تھیں اور اُن پر بھروسہ کرتی تھیں۔ ہروانی صاحب بھی کملاجی کی بے انتہا عزت کرتے تھے اور انھوں نے

اپنے ذہن میں کملاجی کو ہندوستان کی آئیڈیل عورت کا درجہ دے رکھا تھا۔ ہروانی صاحب اندرا گاندھی جی سے بھی بہت قریب تھے اور اپنی ماں کی طرح اندرا جی بھی ان پر بہت اعتماد کرتی تھیں۔ پنڈت نہرو بھی اپنی بیوی اور بیٹی کی طرح انصار صاحب کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اسی لیے عرصے تک انصار صاحب لکھنؤ کے نیشنل ہیرالڈ میں کام کرتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ فیروز گاندھی سے اندرا جی کی شادی کے راستے میں جو رکاوٹیں تھیں انھیں دور کرانے میں انصار صاحب کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔

انصار صاحب نے لڑکپن ہی سے سیاست میں حصّہ لینا شروع کر دیا تھا اور وہ قید و بند کی آزمائشوں سے گزرنے لگے تھے۔ آزادی کے بعد وہ پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے اور اس حیثیت سے انھوں نے بہت اہم رول ادا کیا۔

حمیدہ سالم نے انصار ہروانی کی زندگی کے واقعات بڑی ایمان داری سے اس طرح لکھے ہیں کہ انصار ہروانی کی پوری زندگی ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ انصار ہروانی اور مجاز دونوں شراب نوشی کے شکار ہو گئے تھے۔ اگر انصار ہروانی کو شراب نوشی نے تباہ نہ کر دیا ہوتا تو وہ ہندوستان کی قومی زندگی میں غیر معمولی عہدے پر فائز ہوتے۔ انصار ہروانی کی حد سے بڑھی ہوئی شراب نوشی کا ذکر کر کے حمیدہ سالم نے بڑے دردناک انداز میں اپنے اِن دو غیر معمولی ذہین، حساس دانش ور بھائیوں کے بارے میں لکھا ہے:-
"لگتا ہے کاتبِ تقدیر نے میرے دونوں بھائیوں کی تقدیریں ایک ہی قلم اور ایک ہی روشنائی سے لکھی تھیں۔ اُبھرے، چمکے اور بجھ گئے۔ ایسا کیوں ہوا اور کیوں کر ہوا اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔"

اردو شاعری میں جو مقبولیت اور شہرت اسرار الحق مجازؔ کو حاصل ہوئی وہ ان کے ہم عصروں میں کم لوگوں کو نصیب ہوئی۔ مجاز ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگوں میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ مجاز کے شیریں، دل کش اور رومانی نغموں اور انقلابی شاعری نے اردو دنیا کو ہمیشہ اپنی طرف متوجہ رکھا۔ مجاز کی شخصیت کے غیر معمولی بانکپن، خودداری، شرافت، وضع داری، انسان دوستی اور اس کے ساتھ بلا کی بذلہ سنجی نے ان کے عہد کی نوجوان نسل کو ان کا ہیرو بنا دیا۔ وہ اردو کے ایک ایسے شاعر ہیں جو مدتوں حسینوں کے دل کی دھڑکن بن کر رہے۔

اس کتاب میں مجازؔ کے بچپن اور جوانی کے بعض ایسے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں جو

ہمیں کہیں اور نہیں ملتے۔ کیسا خوب صورت تھا مجاز کا لڑکپن۔ بہنوں سے چھیڑ چھاڑ، اُن کی گڑیاں چھیننا، دوستوں کے ساتھ امرودوں اور آموں کے باغوں میں گھومنا، جلسوں، عرس اور محرم کی تقریبات میں اہتمام کے ساتھ شرکت، کسرت میں مصروف رہنا، وزنی سے وزنی چیزیں اٹھانا، یہ مشغلے تھے ایک خوش حال جاگیر دار خاندان کے نوجوان کے۔

مجاز بڑے لاڈ پیار سے پلے تھے۔ تمام بہنوں میں والدہ کا پیار سب سے زیادہ مجاز کو ملا تھا۔ وہ بڑی منتوں سے پالے گئے تھے۔ محرم کے دس دنوں میں مجاز سے وابستہ دس منتیں تھیں۔ مجاز کی والدہ دیوانگی کی حد تک ان کی حفاظت کرتی تھیں۔ توانا دماغ اور صحت مند جسم کے مالک۔ گھر والوں کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز۔ چوں کہ غیر معمولی ذہین تھے، اس لیے خاندان والوں کو اُن سے بہت امیدیں وابستہ تھیں میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ والد انھیں انجینئر بنانا چاہتے تھے، اس لیے انٹرمیجیٹ میں فزکس اور کیمسٹری کے مضامین دلوائے۔ بھلا ایک متوالے عاشق مزاج شاعر مجاز کا دل ان مضامین میں کیسے لگتا۔ بہ مشکل تمام انٹر پاس کرنے کے بعد علی گڑھ میں داخل کیے گئے۔ بی۔ اے میں سائیکلوجی، انگریزی اور اردو جیسے مضامین لیے۔ علی گڑھ میں آزادی ملی اور اس آزادی نے مجاز کی زندگی بدل دی۔ محبت میں مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے شراب نوشی کی لت پڑ گئی پھر شراب نے تو انھیں کہیں کا نہ رکھا۔ اس کا جو عبرت ناک انجام ہوا وہ ہم سب کے سامنے ہے۔

حمیدہ سالم نے مجاز کی شخصیت کی وہ تصویر پیش کی ہے جسے انھوں نے انتہائی قریب سے دیکھا تھا اور ۱۹۱۱ء سے ۱۹۵۵ تک یعنی تقریباً ۴۴ سال تک جتنا ایک بہن اپنے لاڈلے بھائی کو دیکھ سکتی ہے۔ مجاز کے سوانح، بچپن اور جوانی کی زندگی پر بہت کچھ لکھا گیا لیکن حمیدہ سالم نے جس محبت اور پیار سے ان کے حالات اور جس دردناک انداز میں ان کی آخری زندگی کا نقشا کھینچا ہے وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی۔

اس کتاب میں جادو (جاوید اختر) کے نام حمیدہ سالم کا ایک طویل خط بھی شامل ہے جس میں جادو کی والدہ، حمیدہ سالم اور مجاز کی سگی بہن صفیہ اختر کی زندگی پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ صفیہ غیر معمولی ذہین خاتون تھیں۔ بہ قول حمیدہ سالم وہ ردولوی اور شاید ضلع بارہ بنکی کی پہلی لڑکی تھیں، جنھوں نے بی۔ اے، بی۔ ٹی تک اعلا تعلیم حاصل کی اور پھر کچھ سال بعد ایم۔ اے کیا۔ انھوں نے انگریزی، اردو اور فارسی اپنے والد سے پڑھی تھی۔

حساب پڑھنے میں مجاز ان کی مدد کرتے تھے۔ صفیہ اردو کے صفِ اول کے شاعر جان نثار

اختر کی بیوی تھیں۔ حمیدہ سالم نے صفیہ اور جان نثار اختر کی ملاقات کا ذکر بہت دل کش افسانوی انداز میں کیا ہے۔ وہ جاوید اختر کے نام خط میں لکھتی ہیں:

"۱۹۴۲ء صفیہ آپا کی زندگی کے لیے بہت اہم ثابت ہوا۔ سلمیٰ آپا کے رشتے کے بھائی یعنی تمھارے باپ (جاں نثار اختر) اپنی کزن سے ملنے گرلس کالج کے ہوسٹل آئے۔ انھوں نے اپنے دوست مجاز کی بہن ہونے کے ناطے صفیہ آپا سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ سلمیٰ آپا سے ان کی دوست کا ذکر بھی سن چکے ہوں گے۔ یہ شام بھائی اختر اور صفیہ آپا کی ملاقات کی پہلی شام تھی۔ ایک کھوئی کھوئی سی شخصیت۔ اپنے سے بے نیاز اپنے ارد گرد سے بے نیاز۔ لہجہ دھیما دھیما اور نرم سا۔ حلیہ شرمیلا سا۔ پیشانی پر پڑے ہوئے کچھ الجھے اور بکھرے ہوئے بال جنھیں گاہے گاہے گردن کو جھٹکا دے کر ہٹانے کی کوشش۔ اس وقت کون جانتا تھا کہ ان کی پوری شخصیت ہی کچھ ایسے الجھاؤ اور بکھراؤ کا شکار ہے کہ سمیٹے نہیں سمٹ رہی ہے پر وہ تھک ضرور گئے ہیں اور سہارے کی خواہش رکھتے ہیں۔

غرض یہ کہ بھائی اختر کے شاعرانہ انداز شاعرانہ مزاج اور شاعرانہ حلیہ نے پہلی ہی ملاقات میں صفیہ آپا کے دل کو جیت لیا۔ عقل نے بھی حامی بھر دی کہ ایک ہم مذاق ہم ذوق ساتھی مل جائے، پیاسی زندگی کو اس سے زیادہ کیا چاہیے۔ بھائی اختر کی اس زمانے کی ہلکی پھلکی اور رومانی شاعری نہ جانے کتنی ادب نواز نوجوان لڑکیوں کا دل موہ چکی تھی۔ غرضیکہ صفیہ آپا اس پہلی ملاقات میں اُن کی ہو بیٹھیں۔ بھائی اختر بھی غالباً کوئی ایسا مقصد لے کر آئے تھے۔"

پہلی ملاقات کا واقعہ تو بہت دل چسپ انداز میں بیان کیا ہی ہے، لیکن جن لوگوں نے جان نثار اختر مرحوم کو دیکھا ہے وہی جانتے ہیں کہ حمیدہ سالم صاحبہ نے کتنے مختصر الفاظ میں جان نثار کا مکمل اور جامع خاکہ پیش کیا ہے۔ صفیہ ٹریننگ کالج میں لیڈی سپر وائزر کے

عہدے پر فائز رہیں۔

ان کی پرورش ایک روایتی جاگیر دار خاندان میں ہوئی۔ لیکن وہ غیر معمولی ذہین خاتون ہی نہیں تھیں بلکہ حیرت انگیز حد تک روشن خیال، ترقی پسند اور آزاد خیال تھیں۔ انھیں خود پر بہت اعتماد تھا۔ صفیہ باقاعدہ ادیب نہیں تھیں لیکن ان کے خطوط کا مجموعہ ''زیرِ لب'' ان کی کتاب ''حرف آشنا'' اردو ادب کا بیش بہا خزانہ ہے۔

صفیہ نے ''راہِ وفا پر جانے کتنی ٹھوکریں کھائیں، کتنی چوٹیں اٹھائیں، لیکن کبھی ہمت نہ ہاریں'' صفیہ ہمیشہ تازہ دم رہیں ان کے عزم، حوصلے توانائی اور دور اندیشی کا سب سے بڑا ثبوت اردو کے مشہور اور ممتاز شاعر جاوید اختر ہیں۔

حمیدہ سالم نقاد اور ادیب نہیں ہیں۔ ''شورشِ دوراں'' اور ''ہم ساتھ تھے'' سے پہلے شاید ان کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی، لیکن ان کی یہ دونوں کتابیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں زبان اور اظہار پر پوری قدرت حاصل ہے۔ وہ یقیناً ہمارے بے شمار ادیبوں اور نقادوں سے بہتر لکھتی ہیں۔

خلیق انجم

پیش لفظ

اس کتاب کا نام بہت ہی سیدھا سادا اور کچھ غیر شاعرانہ سا ہے۔ لیکن اپنے موضوع کے لحاظ سے مناسب ہے۔ اس میں میرے دو مضامین ہیں اور ایک خط ہے۔ مضامین ہیں اپنے دونوں بھائیوں پر اور خط ہے اپنی ایک بہن کے متعلق۔

شاید آپ یہ سوچ رہے ہوں کہ ایسی کون سی بہن ہوگی، جس کے دل میں اپنے ان بہن بھائیوں کی یادوں کا ذخیرہ نہ ہو جو اسے چھوڑ کر اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے منہ موڑ چکے ہیں۔ لیکن یہ بہنیں تو اس کی خواہاں نہیں ہوتیں کہ اپنی یادوں میں غیروں کو شریک کریں۔ نہ ہی اس کی توقع رکھتی ہیں کہ ان کے بہن بھائیوں کی شخصیت اور زندگی کی تفصیلات سے سب کو ہی دلچسپی ہو۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں توقع ہی نہیں بلکہ یقین رکھتی ہوں کہ لوگوں کو میری پیش کردہ تفصیلات سے دلچسپی ہوگی۔ کیوں کہ میرا ایک مضمون ہے ''اسرار الحق مجاز شاعر محفل وفا مطرب بزم دلبراں'' پر جس کا نام ادبی حلقے میں تعارف کا محتاج نہیں۔ جس کا مجموعہ کلام ''آہنگ'' اردو شاعری میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں نے اپنے اسی بھائی کے انتقال کے کچھ ہی دنوں بعد ''جگن بھیا'' کے نام سے ایک مضمون لکھا تھا۔ دل پر چوٹ لگی تھی اور اس چوٹ نے الفاظ کا جامہ پہنا تھا۔ سو یہ الفاظ لوگوں کے دلوں میں اتر گئے تھے۔ بارہا مجھ سے فرمائش ہوتی رہی کہ میں اپنے ان بھائی پر ایک مفصل مضمون لکھوں، اس کی نوبت اب آئی۔

میرا خط ہے اپنی بہن صفیہ جاں نثار اختر سے متعلق۔۔ یہ نام بھی اجنبی نہیں۔ ان کے خطوط کے مجموعے ''زیرِ لب'' اور ''حرف آشنا'' نے ان کو اردو خطوط نگاری کی تاریخ میں ایک امتیازی حیثیت دے رکھی ہے۔ یہ خطوط زندگی سے ایک کربناک لیکن دلیرانہ جدو جہد کی تصویر پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ بیش بہا ادبی صلاحیتوں کی عکاسی بھی کرتے

ہیں۔ بہت زمانے سے صفیہ آپا کے چھوٹے بیٹے اولیس (ڈاکٹر سلمان اختر) کا تقاضا تھا کہ میں ان کی ماں پر مضمون لکھوں ادھر ان کے بڑے بیٹے جادو (جاوید اختر) کا بھی اصرار ہوا۔ مضمون لکھنے کی سکت تو مجھ میں نہیں تھی۔ البتہ جادو کے نام ایک خط ڈالا۔ یہ سوال آپ ہی کے نہیں میرے ذہن میں بھی اٹھتا ہے کہ خط جادو کے نام کیوں؟ اولیس کے نام کیوں نہیں۔ اولیس کی فرمائش تو بہت زمانے سے تھی۔ غالباً اس کی دو وجہیں ہیں۔ جادو کی ماں کو اس سے دیوانگی کی حد تک محبت تھی۔ دوسری اور غالباً اہم تر وجہ یہ ہے کہ جادو کے بچپن کا خاصا طویل حصہ اس کی ماں کی بعض مجبوریوں کی وجہ سے میرے پاس گزرا اور اس کے دلکش اور دلچسپ بچپن نے میری اس ممتا کو تسکین پہنچائی، جس کی تشفی کے لیے میں اپنے بچپن میں گڈے اور گڑیوں کی دیوانی تھی۔ شاید غیر شعوری طور پر جادو کے نام میرا یہ خط اس کے اس احسان کا صلہ ہے۔ مجھے اعتماد ہے کہ اولیس جو اس وقت بین الاقوامی شہرت کا ماہر نفسیات ہے، میری ذہنی کیفیت کا بہتر تجزیہ کر سکے گا اور مجھ سے گِلہ نہیں کرے گا۔

اب رہا میرا دوسرا مضمون اپنے بھائی انصار الحق ہروانی پر۔ ان کے تعارف کے لیے بھی میں انگریزی زبان میں ان کی تصانیف " Before Freedom And After "اور " Gandhi To Gandhi "کا حوالہ دے سکتی ہوں۔ ان کا میدان ادب نہیں سیاست تھا۔ ان کی خدمات قلم سے نہیں عمل سے تھیں۔ انھوں نے اپنے وقت اور اپنی صلاحیتوں کو غلامی کی ان زنجیروں کے توڑنے میں لگا دیا جو صرف سیاسی آزادی کی ہی راہ میں حائل نہ تھیں۔ قلم اور سوچ کی راہ میں بھی حائل تھیں۔ میرے اس یقین سے متعلق فیصلہ کہ اُن سے آپ کی واقفیت کتنی ضروری ہے یا کتنی غیر ضروری۔ اگر آپ مضمون پڑھنے کے بعد کریں تو میں شکر گزار ہوں گی۔

میں نے بارہا لکھا ہے کہ ہم پانچ بہن بھائی تھے۔ یعنی میرے دو بھائی تھے اور دو بہنیں تھیں۔ میں نے اس کتاب میں اپنی بڑی بہن کے ذکر سے جن کو ہم چاروں آپا کہتے تھے، گریز کیا ہے۔ اس کی وجہ بھی بتاتی چلوں۔

ہماری آپا کا المیہ یہ تھا کہ وہ اس دور اور اس ماحول کی پیداوار تھیں، جس میں لڑکی بیٹی ہوتی ہے، بہن ہوتی ہے، بیوی ہوتی ہے، ماں ہوتی ہے، خود کچھ نہیں ہوتی۔ ہوش سنبھالتے ہی اس کے کانوں میں یہ بات ڈال دی جاتی ہے کہ وہ دوسروں کی امانت ہے۔ یعنی ایک کموڈیٹی ہے۔ ایک بے جان، بے زبان شے ہے جو کچھ سالوں بعد دوسروں کے سپرد کر دی جائے گی،

جس کی دنیا شادی سے پہلے ماں باپ کے گھر کی چہار دیواریوں تک اور شادی کے بعد سسرال کی چہار دیواریوں تک محدود ہوتی ہے ، جس کے فرائض شادی سے پہلے ماں باپ کی فرمانبرداری بہن بھائیوں کی خیال داری اور شادی کے بعد ساس سسر اور شوہر کی خدمت بچوں کی پرورش اور نگہداشت ہیں۔ اس سے انکار نہیں کہ بہت ہی قابل قدر ہیں یہ فرائض اور بہت ہی عظیم اہم اور متبرک۔ کاش اس فہرست میں اس کی بھی گنجائش ہوتی کہ عورت کے کچھ فرائض اپنی طرف بھی ہیں۔ بھلے وہ اپنے ترجیحی پیمانے پر انھیں اہمیت نہ دے، پر دوسرے تو اس کی اس قربانی سے باخبر ہوتے۔

اگر کوئی لڑکی خوش نصیب ہوئی اور ماحول قدر شناس ملا تو زندگی آرام و سکون سے گزر جاتی ہے اور اس پر عائد کردہ فرائض بخیر و خوبی انجام پا جاتے ہیں اور اس کی یہی کامیابی اُس کے اپنے لیے اور دوسروں کے لیے اس کی پہچان کے لیے کافی ہوتی ہے اور اگر لڑکی کے حصہ میں بدنصیبی آئی تو صبر و شکر سے اپنے مسائل اور اپنے دکھوں کو جھیلنا ہی اس کی عظمت کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ بے شک مسائل اور دکھوں میں کمی و بیشی ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی آزمائش میں بھی۔ بہر صورت وہ دھیرے دھیرے گھلتی رہتی ہے، مٹتی رہتی ہے اور اندر ہی اندر مرتی رہتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دکھوں کا بوجھ بڑھتا جاتا ہے اور صبر و شکر کا سبق کمزور پڑتا جاتا ہے۔ اس صورت میں وہ گلے میں پھندا ڈال کر زندگی کے خاتمے کی کوشش کرتی ہے۔ کبھی کبھی بغاوت کا جذبہ بھی صبر و شکر کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔ لیکن نتیجہ مختلف نہیں ہوتا۔ نند، ساس، سسر اور شوہر کی مدد بھی حاصل ہو جاتی ہے اور مٹی کا تیل اور ماچس کی ڈبیہ کام آجاتی ہے۔ اس نوعیت کی داستانیں آپ روز ہی اخباروں میں پڑھتے رہتے ہوں گے۔

ہماری آپا بھی انہی لڑکیوں میں سے ایک تھیں۔ جن کے حصہ میں بدنصیبی آئی تھی۔ ماں باپ کی پہلی اولاد تھیں۔ محبت، پیار سے پالی گئیں تھیں۔ قرآن مجید کے علاوہ اردو پڑھنا لکھنا اور تھوڑی سی فارسی کی تعلیم بھی باپ سے حاصل ہوئی تھی۔ گھرداری کے امور اور سلیقہ شعاری کی تربیت ماں سے ملی تھی۔ طبیعتاً باپ پر گئی تھیں۔ خاموش سنجیدہ اور متین۔ پیدائش کے چند ہی سال بعد دادا نے "پرائی امانت" کا مسئلہ حل کر دیا اور ان کی منگنی ان سے دو سال چھوٹے چچازاد بھائی سے کر دی گئی۔ چھ سات سال کی رہی ہوں گی۔ آنگن میں چارپائی پر بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں۔ اُڑتی ہوئی چیل کی تیز نگاہ ان کی پلیٹ میں رکھی ہوئی بوٹی پر پڑی اور اس کے جھپٹے کی زد میں آپا کی بائیں آنکھ آگئی۔ خون کی دھاریں بہہ نکلیں۔ طویل علاج معالجہ

کے بعد آنکھ کی صورت تو برقرار رہ گئی۔ لیکن اس کی بصارت کم و بیش ختم ہی ہو گئی۔ دادا کا انتقال ہو گیا اور ان کے ساتھ ان سے کیا ہوا وعدہ بھی دفنا دیا گیا۔ سو بچپن کی منگنی ٹوٹ گئی۔ منگنی کیا ٹوٹی قیامت آگئی۔ بہر حال بڑی پھوپھی آڑے آئیں اور بھائی بھاوج کی عزت بچا لے گئیں اور ہماری آپا بجائے چچازاد بھائی کے پھوپھی زاد بھائی کے سپرد کر دی گئیں۔

انکار نہیں کہ شوہر بے حد چاہنے والے تھے۔ اس حد تک کہ بیوی کا ایک لمحے کے لیے نگاہ سے اوجھل ہونا گوارا نہ تھا۔ میکے آنے پر پابندی۔ یہاں تک کہ میرے چچیرے بھائیوں سے ملنے پر بھی منادی۔ محافظت کی یہ انتہا۔ البتہ بطور معاوضہ ہر سال ایک بچہ عطا ہو جاتا تھا۔ شادی کے پانچ سال کے اندر چار اولادیں پیدا ہوئیں۔ بچا صرف ایک وہ بھی پولیو کا شکار۔ بچے کے علاج کے لیے بھی لکھنؤ آنے کی اجازت نہ مل سکی۔ دکھیا نانی نانا کو لال تیل کی شیشیوں کے پارسل پر ہی اکتفا کرنی پڑی۔

لکھنؤ اور اس کے قرب میں ملیریا کی جان لیوا وبا پھیلی ہماری بہن اور ان کے ساس و شوہر دونوں ہی زد میں آئے۔ آپا سخت جان تھیں، بچ گئیں۔ ملکیت رہ گئی مالک موت کا شکار ہوئے۔ بوڑھے ماں باپ کے جوان نیم مردہ بیوہ بیٹی اور یتیم نواسہ کو کلیجے لگایا۔ ہر طرح سے دلداری کی کوشش کی۔ لیکن وہ تو اندر ہی اندر کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ پے در پے انفلوئنزا کے حملے ہوئے۔ کھانسی نے طوالت پکڑی۔ دل تو چوٹ کھایا ہوا تھا، پھیپھڑے بھی زخمی ہو گئے۔ کئی دفعہ بھوالی سینی ٹوریم بھیجی گئیں۔ ہر طرف ہاتھ پیر مارے گئے، پر موت کے سامنے کس کی چلی ہے۔ ۲۰ رجون ۱۹۵۱ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ ان بہن سے ہم سب کو محبت ملی تھی، شفقت ملی تھی۔ اسرار بھائی سے بھی دس بارہ سال بڑی تھیں۔ ہم سب بہن بھائی کے لیے ماں کا درجہ رکھتی تھیں۔ میں بھلا ان کو کیوں کر بھول سکتی ہوں۔ ان کا نام عارفہ خاتون تھا۔ آج بھی مختلف روپ میں اور مختلف نام کی کتنی عارفہ خاتون کے قسم کی لڑکیاں آپ کے ارد گرد ہوں گی۔ کاش ہم اور آپ ان کی بدنصیبی کی سیاہی میں، کچھ کمی کر سکتے۔

غرضیکہ کتاب میرے بہن بھائیوں کی زندگی کی داستان آپ کے پیش خدمت ہے۔ میری اس کاوش کو آپ پسند کریں یا نہ کریں آپ کا حق ہے۔

اسرار الحق مجاز

اردو زبان کی شیرینی نفاست و نزاکت سے انکار ممکن نہیں اور یہی ہیں اس زبان کی وہ خصوصیات جو اس کے مستقبل کی ضامن ہیں۔ خواہ اسے کتنی ہی زہریلی دشمنی کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ کتنی ناعاقبت اندیش ہے یہ دشمنی جو ہر لمحہ اپنی قومی تہذیب کے اس خوبصورت اور قیمتی سرمایہ کی بربادی پر اُتارو نظر آتی ہے۔ اردو مشاعروں اور اور اردو غزلوں کی محفلوں کے مجمع اور ان کی مقبولیت اور مسلم سوشل فلموں کی کشش اس حقیقت کی گواہ ہے کہ اردو زبان کی وراثت کسی مخصوص طبقے، کسی مخصوص مذہب کے لوگوں تک محدود نہیں۔ یہ ہندوستان کی زبان ہے اور ہر وطن پرست ہندوستانی پر اس کی حفاظت کی ذمہ داری ہے۔ اگر یہ احساس زندہ رہا تو اردو زبان زندہ رہے گی۔

زبان زندہ رہی تو اس کا ادب اس کی شاعری بھی زندہ رہے گی اور دھیرے دھیرے ہی سہی اس سرمایہ میں اضافہ بھی ہوتا جائے گا اور اس پر تحقیق اور تنقید کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔ یہ سلسلہ جاری رہا تو ضرورت پڑے گی شناسائی کی۔ اس پس منظر اور اس ماحول سے جس میں ادیب و شعراء پلے بڑھے۔ ضرورت ہوگی واقفیت کی ان اقدار اور روایات سے جو ان ادیبوں اور شعراء کو ورثہ میں ملیں۔ جستجو ہوگی ان کے بچپن جوانی اور زندگی کے ان واقعات و حادثات سے جانکاری کی۔ جن کی چھاپ ان کی شخصیتوں پر پڑیں اور ان کی زندگی کی راہوں کے ان موڑوں سے پہچان کی جنھوں نے ان کی سوچ، ان کے شعور اور ان کے جذبات و احساسات کو متاثر کیا۔

اچھی اور معیاری شاعری کے لیے یہ کہا گیا ہے کہ باطن کی آواز اس کی محرک ہوتی ہے۔ پراثرِ کلام آورد نہیں بلکہ آمد کی دین ہے۔ لیکن کیا ایسا ممکن ہے کہ باطن کی آواز خارجی فضاء سے بے نیاز اور بے گانہ ہو اور آمد ارد گرد کے حالات سے غیر متاثر رہ سکے۔ دلوں میں اتر جانے

والے شاعر کے وہ احساسات و جذبات ذہنوں کو متاثر کرنے والا اس کا وہ شعور فکر جو اس کے کلام میں جھلکتا ہے، زندگی کی ان اونچ نیچ اور پیچیدگیوں سے غیر متعلق تو نہیں رہ سکتا، جن کا زندگی میں اسے سامنا کرنا ہوتا ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ انسان بہت کچھ جینس (Genes) اور عام زبان میں خون میں لے کر آتا ہے۔ لیکن ان خصوصیات کو زندگی کے خارجی حالات جلا بھی دے سکتے ہیں اور مسخ بھی کر سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ ماہر نفسیات کا ہے۔ یہاں ذکر تھا ادب و شاعر ہی کے تنقید نگاروں اور مبصرین کی ان ضروریات اور تقاضوں کا جس کا انھیں سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب وہ کسی ادیب یا شاعر کی تخلیق کے پرت در پرت جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کاوش میں الجھتے ہیں۔

غالباً اس سے تو کسی کو ہی انکار ہو کہ اسرار بھائی کے ڈیڑھ دو سو صفحات کے مجموعہ کلام "آہنگ" نے ان کو اردو شعراء کی صف میں ایک مخصوص جگہ دے دی۔ کسی نے ان کے کلام میں شیلے اور کیٹس کی جھلک پائی تو کسی نے بائرن کی۔ کسی کو ان کے اشعار میں شیلے کی بیتابی، کیٹس کی حسن پرستی نظر آئی تو کسی کو بائرن کا جوشیلا پن۔ شاعر کی حیثیت سے مجاز کا ادبی دنیا میں کیا مقام ہے۔ اس سلسلہ میں میرا کچھ کہنا جرأت بے جا ہی نہ ہوگی بلکہ حماقت کی انتہا ہوگی۔ مجھے اس اعتراف سے کوئی جھجھک نہیں کہ میرا کسی زبان کے ادب سے کبھی بھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ میرے لیے اس صورت میں مناسب یہی ہوگا کہ اس سلسلہ میں اپنے بھائی پر لکھے ہوئے ان چند ہستیوں کے مضامین کا سہارا لوں، جن کا اردو ادب کے تنقید نگاروں میں لازوال درجہ ہے اور جن کی رائے کے وزن اور اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ سو حسب ذیل ہیں چند اقتباسات۔

سید احتشام حسین مرحوم اپنے مضمون "مجاز" میں لکھتے ہیں۔ "انھوں نے قدیم اور مروّج شاعرانہ روایات اور اسالیب بیان کا احترام کرتے ہوئے اپنے سوزِ نفس سے ان میں تازگی، جدت و کیفیت پیدا کی ...... مجاز کے لہجہ کا دھیما پن رس کیف گھلاوٹ و غنائیت موضوعات کی عمومیت و عصریت سے مل کر شاعرانہ پیکر اختیار کرتے ہیں، جس نے مجاز کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے وہ بغیر کسی بحث کے تسلیم کرتا ہے کہ اس میں روح عصر جلوہ گر ہے۔ اس کے تجربوں میں بیسویں صدی کے حساس نوجوان کے تجربات کی جھلک ہے۔ اس کے موضوعات میں تصوریت اور مثالیت کے مقابلہ میں ارضیت اصلیت اور عمومیت کی فراوانی ہے۔"

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:-

"مجاز دراصل پرستارِ حسن ہے۔ وہ لیلائے انقلاب کا بھی مجنوں ہے۔ حسینوں کی ہر ادا کا رمز شناس ہے ۔ اس نے حسن کو ہر عالم میں دیکھا، ڈھونڈا چاہا اور پایا ہے ۔ اس بصیرت نے اس کے اشعار میں ایک سرمستی اور کیفیت بھر دی ہے ۔ الفاظ میں جادو پیدا کر دیا ہے اور اشعار کو پگھلا ہوا لاوا بنا دیا ہے۔"

قاضی عبد الستار لکھتے ہیں:

"مجاز اپنی نظموں اور غزلوں کا مختصر سا مجموعہ لے کر بزرگوں کی محفل میں آیا تو انھوں نے سروِ قد کھڑے ہو کر اس کے فن کا احترام کیا اور جب وہ نوجوانوں کی بزم میں آیا تو انھوں نے اپنے کارواں کے سالاروں کی صف میں بٹھالیا۔"

آہنگ کا دیباچہ فیض احمد فیض نے لکھا ہے۔ ان کی یہ چند سطریں بہت کچھ کہہ جاتی ہیں:

دیکھ شمشیر ہے یہ ساز ہے یہ جام ہے یہ — تو جو شمشیر اٹھالے بڑا کام ہے یہ

آگے وہ لکھتے ہیں مجاز کی شاعری ان تینوں اجزاء سے مرکب ہے غالباً اسی وجہ سے ان کا کلام زیادہ مقبول ہے۔ ہمارے بیشتر شعراء نے ان اجزاء میں ایک فرضی تضاد کی دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں۔ کوئی محض ساز و جام کا دلدادہ تو کوئی محض شمشیر کا دھنی۔ لیکن کامیاب شعراء کے لیے (آج کل کے زمانہ میں) شمشیر کی صلابت اور ساز و گداز دونوں ہی ضروری ہیں۔

دلبری با قاہری جادوگری است

مجاز کے شعر میں یہ امتزاج موجود ہے۔"

آہنگ کا انتساب یوں کیا گیا ہے۔

فیض و جذبی کے نام

جو

میرے دل و جگر ہیں

سردار و مخدوم کے نام

جو

میرے دست و بازو ہیں

اس انتساب کے بارے میں قاضی عبدالستار نے کسی جگہ لکھا ہے۔ "یہ الفاظ آہنگ پر خود ایک بے لاگ تنقید ایک انتہائی بامعنی اور باشعور جائزہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فیض اور جذبی دونوں ہی انفرادی تجربات کے پروردہ جذبہ کو عمومیت اور آفاقیت کی دشوار منزلوں سے گزار کر تفکر کے قریب لاتے ہیں۔ مخدوم و سرادر سردار زمین پر چل کر نئے افاقی موضوعات کی تلاش کرتے ہیں پھر اپنے آتشیں لہجے کی گھن گرج کا لباس پہناتے ہیں۔ مجاز نے ان دونوں کے درمیان اپنے مقام کا تعین کر کے ایک ادبی خدمت انجام دی ہے۔"

یہ تھیں اسرار بھائی کے کلام کے بارے میں چند ان نقادوں کی رائیں، جن کا اردو ادب میں نام و مقام ہے۔ ان سے کتنے اتفاق کی گنجائش ہے اور کتنے اختلاف کی، میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ البتہ میری ناچیز رائے اتنا ضرور کہتی ہے کہ کسی ادیب یا شاعر کی تخلیق کا جائزہ لیتے وقت اور اس کے محرکات اور موضوعات کو سمجھنے کے لیے ان ادیبوں اور شعراء کی زندگی کی ان چھوٹی چھوٹی اور بظاہر غیر اہم تفصیلات سے بھی مدد مل سکتی ہے جن سے کوئی قرب رکھنے والا ہی واقف ہو سکتا ہے۔ اگر اسے بے جا جسارت نہ سمجھی جائے تو میں یہ کہوں گی کہ جائزہ کی گہرائی تک پہنچنے میں ان چھوٹی موٹی تفصیلات کا اہم رول ہوتا ہے۔

اسرار بھائی سے ذاتی طور پر واقفیت رکھنے والوں میں دھیرے دھیرے کمی ہوتی جارہی ہے اور کمی کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ موت زندگی کی اٹل حقیقت ہے کسے مفر ہے اس سے اور کون ہے اس سے محفوظ۔ ان کے جاننے والوں میں سے آج چند جو ہیں وہ کل نہیں ہوں گے۔ یہ خلا بڑھتا ہی جائے گا۔

مبصروں اور تنقید نگاروں اور تحقیق کرنے والوں کے کام آتے ہیں، وہ مضامین وہ تحریریں جو وقتاً فوقتاً ان ادیبوں اور شعراء کے بارے میں اُن کے ہم عصر دوستوں اور عزیزوں نے لکھے اور وہ خطوط جو ان سب میں آپس میں لکھے گئے۔

میں نے اسرار بھائی پر چند مضامین لکھے ہیں جو ادھر اُدھر رسائل میں چھپے ہیں یا "یومِ مجاز" کے موقعہ پر پڑھے گئے ہیں۔ وقت کے گزرتے ان کی دستیابی مشکل سے مشکل تر ہوتی جارہی ہے۔ جانے میری اس خوش فہمی میں کتنی جان ہے اور اس گمان میں کتنی صحت کہ اسرار بھائی سے متعلق میری وہ یادیں جو میرے دل و دماغ کی گہرائیوں میں دبی ہوئی ہیں اور میرے لیے ایک قیمتی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں، ادبی حلقہ سے تعلق رکھنے والوں کے لیے کسی موقعہ پر کام آسکتی ہیں۔

یہ یادیں گاہے گاہے ابھرتی ہیں اور ان آنسوؤں میں تبدیل ہو جاتی ہیں جو پی لیے جاتے ہیں یا ان آہوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں جو دبالی جاتی ہیں۔ بس دل و دماغ پر ایک عجیب سی کیفیت چھوڑ جاتی ہیں جس میں لذت بھی ہے اور اذیت بھی۔ ان یادوں کو الفاظ کا جامہ دینا میرے لیے بہت ہی مشکل کام ہے۔ لیکن پھر بھی کوشش کر رہی ہوں، اس توقع کے سہارے کہ شاید کسی وقت کسی موقعہ پر یہ بہتر مقصد پورا کر سکیں۔

کہتے ہیں کہ شخصیت دو عناصر کے اثرات کا مرکب ہے۔ خون جسے آج کی زبان میں جینس(Genes) کہتے ہیں اور ماحول۔ خون خاندانی سلسلہ کی دین ہے اور ماحول اس فضا اُن اقدار، اُن روایات کا نام ہے، جن کے سایہ میں بچہ پلتا بڑھتا اور پنپتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں شخصیت کے منفی اور مثبت خصوصیات میں سے کچھ تو بچہ کو ورثہ میں ملتی ہیں اور کچھ اس ماحول کی دین ہوتی ہے، جس میں وہ سانس لیتا ہے۔ کس کا پلہ بھاری ہوتا ہے اور کس کا ہلکا اور کس حد تک وہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس ناپ تول کی ذمہ داری اور اس کا فیصلہ ماہر نفسیات کے سپرد۔ میرے سامنے تو اس وقت محض یہ مقصد ہے کہ میں آپ کو اس خاندان اس گھر کے بارے میں کچھ بتاؤں، جس میں میرے بھائی پیدا ہوئے۔ اُن افراد سے ملاؤں جن کے زیر سایہ اور جن کے ساتھ وہ پلے بڑھے۔ ان جگہوں ان گلیوں اور ان کوچوں میں لے جاؤں جہاں ان کا بچپن کم عمری اور جوانی گزری۔ ان اقدار ان روایات سے جانکاری کرواؤں جو انھیں اپنے ورثہ میں ملیں۔

ہمارا آبائی وطن اودھ کا ایک مشہور قصبہ ردولی ہے جو فیض آباد اور لکھنؤ کے درمیان واقع ہے۔ نسبتاً فیض آباد سے قریب تر۔ اس قصبہ کے نام کی جو وجہ تسمیہ بتائی جاتی ہے، اس سے اس نام کا جو رُخ سامنے آتا ہے، اس کی یاد ہماری پچھلی نسلوں کو ہو تو ہو زمانہ حال میں اس پر بالکل پردہ پڑ چکا ہے۔ البتہ ایک مخصوص و مختصر حلقہ ردولی کو ردولی شریف کہہ کر ضرور یاد کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی دور میں اس کا اصلی نام رودِولی تھا اور بگڑ کر ردولی بن گیا۔ یہ جگہ عالموں بزرگوں پرہیزگار و عبادت گزار ہستیوں کی رہائش گاہ تھی۔ ان کا زیادہ تر وقت تحصیل علم و ریاضت و عبادت میں گزرتا تھا۔ ان کی ضروریاتِ زندگی بہت ہی مختصر اور سادہ تھیں اور ان کی ذمہ داری آس پاس کے عقیدت مند کاشتکاروں نے اپنے سر لے رکھی تھی۔ جس کے معاوضہ میں ان کو بزرگ ہستیوں کی سرپرستی اور رہبری ملتی تھی۔ سو غالباً قصبہ ردولی کی ابتدا سے یہ خصوصیت رہی کہ یہاں کی آبادی کا براہِ راست کھیتی باڑی سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ آس پاس کے کھیتوں کی پیداوار جو عقیدت مند کسانوں کی محنت اور آبیاری کی دین تھی

ردولی کے باشندوں کے رزق کا ذریعہ تھی۔

دھیرے دھیرے وقت کے ساتھ ردولی کی فضا اور ماحول پر مادیت پرستی کا رنگ چڑھنے لگا اور اس کے روحانی اور صوفیانہ رنگ پر حاوی ہوتا گیا۔ یہاں کے باسی دینی و علمی مشاغل سے دور ہوتے گئے اور دنیاوی جنجال میں پھنستے گئے۔ مزدوروں اور کسانوں کی خون پسینے کی کمائی سے اپنی بنیادی ضروریات ہی نہیں بلکہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کا رجحان بڑھتا گیا۔ ابتدائی دور کی یاد دہانی کے لیے صرف مزارین، عرس و فاتحہ در و درہ گئے اور اس کے ساتھ ساتھ پیری مریدی کی رسم ورسومات۔

ہم سب بہن بھائیوں کی پیدائش ردولی کی اُس فضا اور اس ماحول میں ہوئی جس میں جاگیرداری نظام کی چمک دمک تھی، نزاکت و نفاست تھی، لیکن یہ حُسن ظاہری تھا۔ اندر اندر گھن لگ رہے تھے، بنیادیں کھوکھلی ہو رہی تھیں۔ دوسروں کی محنت کے بل بوتے زندگی کی دیدہ زیب تہذیب کی یہ چمک۔ تقریبوں اور تہواروں پر ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی خواہش اور ساتھ ہی ساتھ زمینداری کی ایک اور خصوصیت مقدمہ بازیوں کا چسکا۔ یہ ڈھانچہ کھڑا رہتا تو کیوں کر۔ اس کو تو ایک دن بیٹھ جانا ہی تھا۔ آج جائیے تو ردولی میں ہر طرف ملبہ کے ڈھیر نظر آتے ہیں اور یہ ملبہ ہے اُن بلند و بالا پھاٹکوں کا، اُن کشادہ بارہ دریوں دالانوں اور سہ دریوں کا جس میں زمیندار خاندان اپنی پوری آن و بان کے ساتھ رہتے تھے۔ نسلوں سے چلی آئی ہوئی ریتوں اور رواجوں کو دل و جان سے نباہتے تھے۔ یہاں ان بارہ دریوں کے کھنڈر ہیں، جن میں عرس بارہ وفات و شب براءت پر قوالیوں اور میلادوں کی محفلیں جمتی تھیں اور اصلی گھی کا حلوہ اور آدھ آدھ کلو کے لڈو تقسیم ہوتے تھے۔

ہم نے آنکھ کھولی تو ردولی کے باشندوں کو دو طبقوں میں تقسیم پایا۔ تعلقدار و زمیندار جن کے لیے ہاتھ پیر چلانے کا سوال نہ تھا۔ فصل کی تیاری پر لگان کی وصولی۔ یہ تھی اُن کی واحد ذمہ داری۔ اس کام کے لیے بھی منشی مقرر تھے۔ گاؤں جانے کی ضرورت سیر و شکار کو چھوڑ کر کبھی کبھار ہی پیش آتی تھی۔ دوسرا طبقہ تھا اُن پیشہ وروں کا جن کا قصبہ میں قیام زمینداروں کی روزمرہ کی سہولتیں پوری کرنے کے لیے لازمی تھا۔ مثلاً نائی، دھوبی، منہیار، کمہار، تیلی، دُھنیے، میراثی، قوال وغیرہ وغیرہ۔ یہ پرجا کہلاتے تھے اور صاحبِ جائداد شرفاء۔ ان شرفاء کی آبادی ردولی کے مرکزی حصہ کے چند محلوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اُن محلوں کے نام تھے: قضیانہ، صوفیانہ، خواجہ ہال، بنی خانہ ناموں کی یہ نوعیت شاید کبھی یہاں کے باسیوں کو اپنے

سالار، مخدوم زادہ، سنجری، عباسی
کے نام رہ گئے

بزرگ اعلیٰ خواجہ افتخار ہارونی کی یاد دلا دیتی ہوں جن کا سلسلہ خواجہ معین الدین چشتی کے ساتھ جڑا تھا اور جن کی امتیازی پہچان تھی اُنکی عبادت وریاضت، علم دوستی ونیکی وشرافت۔

خواجہ ہال کے ایک حصہ میں ایک بہت ہی بلند و بالا پھاٹک میں داخل ہو کر ایک میدان تھا جس میں ایک ہی خاندان کے چار چھ گھر تھے۔ خواجہ ہال کا یہ حصہ بنی خانہ کہلاتا تھا۔ میدان کے بائیں طرف قدرے اونچائی پر ایک دوہری بارہ دری تھی دو طرفہ چھ دروں کے دالان تھے اور پشتی دیوار کے وسط میں ایک بڑا سا طاق تھا، جس پر سیاہی مائل ہرے رنگ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس طاق میں ایک لکڑی کا صندوق رکھا ہوا تھا جس کے اندر روایت اور عقیدہ کے مطابق حضرت سرور کائنات کا موئے مبارک محفوظ تھا۔ ماہ ربیع الاوّل میں بارہ دن میلاد، نعتیہ قوالیوں کی محفلوں اور چراغاں کی ذمہ داری اسی احاطہ میں رہنے والے تین خاندانوں میں تقسیم تھی۔

مجاز کے دادا ... نانا

ان تین خاندانوں میں ایک خاندان ہمارے دادا اور نانا چودھری احمد حسین اور کرامت حسین کا تھا جو آپس میں حقیقی بھائی تھے۔

یہ خاندان بنی خانہ کے جس گھر میں رہتا تھا۔ اسی گھر کی ایک سہ دری میں لال پردے کے پیچھے اُنیس اکتوبر ۱۹۱۱ء میں آپ کے شاعر مجاز پیدا ہوئے۔ ان کی شاعری اور ان کی شخصیت پر ورش کا کیا اور کتنا اثر رہا اور ماحول کا کس حد تک فیصلہ آپ کے سپرد میں تو اس سلسلہ میں تھوڑی بہت اپنی واقفیت بھر تفصیلات ہی پیش کر سکوں گی۔

قصبہ ردولی کی تاریخ کے ساتھ ایک رومانی کہانی وابستہ ہے۔ اسرار بھائی کی زندگی کی کہانی بہت حد تک اس کہانی کو دہراتی ہے۔ کہتے ہیں ہر زمانہ ہر دور میں ہیر رانجھا، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد پیدا ہوئے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے روپ ان کے حلیہ اور ان کے نام بدل جاتے ہیں اور کبھی کبھی ان کے رول بھی۔

صدیوں پہلے کی بات ہے ایک دین دار عبادت گزار بہادر و شجاع شخصیت سید سالار مسعود غازی نام ردولی کے قریب ایک گاؤں میں معہ اپنے دستہ کے خیمہ زن ہو گئے۔ اسلام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کے اصولوں کے مطابق انسان کی زندگی دو ایسے خانوں میں نہیں بٹی ہوئی ہوتی ہے جو ایک دوسرے سے غیر متعلق ہوں بلکہ ایک کی صحت دوسرے کی صحت پر مبنی ہے۔ مالک حقیقی سے قرب حاصل کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ انسان اپنے دنیاوی اور مادی تقاضوں سے منھ موڑ کر کسی خانقاہ میں اپنے کو بند کر لے یا کسی پہاڑ

کی کھو میں جا بیٹھے۔ اپنی طرف اور خدا کی پیدا کی مخلوق کی طرف اس کے کچھ فرائض ہیں اور ان کی ادائیگی بذات خود ایک عبادت ہے۔ سچا خدا پرست انسان وہ ہے جو روحانی اور دنیاوی تقاضوں میں ایک صحت مند توازن قائم رکھ سکے۔ سید مسعود غازی ایک ایسی ہی شخصیت کے مالک تھے۔ خوبرو بہادر جوان اور ساتھ ہی پاکباز اور عبادت گزار۔ ان کا مزار ردولی کے قریب کے ایک گاؤں سترکھ میں ہے اور ہر سال ان کا عرس منایا جاتا ہے اور ہزاروں کی تعداد میں معتقد جمع ہوتے ہیں۔

جس گاؤں میں سید مسعود غازی خیمہ زن ہوئے تھے۔ وہاں ایک بوڑھے نیک و شریف بڑھئی رہتے تھے۔ ان کے ایک اکلوتی بیٹی تھی خوب صورت، خوب سیرت الہڑ اور جوان۔ صبح شام گھر کے چولہے کا ایندھن جمع کرنے باغ کی طرف جاتی تھی اور سید صاحب کے خیموں کی طرف سے گزرتی تھی۔ اس لڑکی کا نام زہرہ تھا۔ مسعود اور زہرہ کی آنکھیں چار ہوئیں اور کیوپڈ اپنا تیر چلا گیا اور دونوں ہی دل کی بازی ہار بیٹھے۔ زہرا اپنی معصومیت اپنی دلکشی اور شوخی کی وجہ سے پورے گاؤں کی ہی لاڈلی تھی۔ سید صاحب کی شرافت نجابت اور دلیری و بہادری سے پورا گاؤں متاثر تھا۔ غرض یہ کہ ایک شام آبادی کے بزرگ سر جوڑ کر بیٹھے اور ان دو محبت سے گھائل دلوں کو یکجا کرنے کا فیصلہ کر دیا گیا۔ شادی کی تاریخ کا تعین ہو گیا۔ سید مسعود غازی اور زہرہ کے دلوں کی دھڑکنیں تیز تر ہو گئیں۔ گاؤں میں اپنی حیثیت بھر بیٹی کی رخصتی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ زہرہ کی ہمجولیاں ڈھولک پر برہا کے گیت گانے میں اور چھیڑ چھاڑ میں لگ گئیں۔

قسمت کچھ اور ہی تماشا دکھانے پر اُتارو تھی۔ قبل اس کے کہ نکاح کے دو بول ادا ہوں اور وصل کا خواب اصلیت کا روپ دھار لے، سلطنتِ اودھ میں جنگ کا نقارہ بج گیا۔ دل کے تقاضوں پر فرض کی آواز حاوی رہی اور غازی صاحب نواب صاحب کا حکم پاتے ہی بلا کسی تاخیر کے میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہو گئے اور سترکھ کے میدان میں جامِ شہادت سے سرخرو ہوئے۔ زہرہ کے دل کی کلی کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئی اور وہ تمام عمر اپنے محبوب کی یاد کو دل سے لگائے زندگی کے دن کاٹتی رہی۔ باوجود لاکھ سمجھانے بجھانے اور زور دباؤ کے کسی سے اپنا پلو باندھنے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ یہاں تک ان کے بالوں کی چمکیلی سیاہی برفیلی سفیدی میں تبدیل ہو گئی۔

یہ درد بھری اور خوب صورت کہانی جس بستی سے وابستہ ہے، وہ آج بھی کٹی باغ کے نام سے

جانی جاتی ہے اور وہاں ہر سال زہرہ بی بی اور مسعود غازی کی شادی کی طے شدہ تاریخ پر ایک میلہ لگتا ہے۔ ستر کھ کے کچھ باشندے باراتی بن کر آتے ہیں اور ان کی خاطر مدارات کی ذمہ داری کٹی باغ اور ارد گرد کی آبادی پر ہوتی ہے۔ میلے کے آخری دن زہرہ بی بی کا ڈولہ نکلتا ہے۔ سجی دھجی پالکی کے ارد گرد فوجی لباس میں کچھ نوجوان ہوتے ہیں اور پیچھے کچھ لوگ ایک چھپر کھٹ اٹھائے ہوئے اور صندوق اٹھائے ہوئے ساتھ ہوتے ہیں اور کچھ لمبے لمبے بانس سے جن کے سرے پر لال ناڑے سے لال چندری کے دوپٹے بندھے ہوئے، باراتیوں کا رول ادا کرتے ہیں، ڈھول تاشے بجانے والوں کا مجمع ساتھ ہوتا ہے۔

کٹی باغ کے میلے کے موقعہ پر خواہ دو ہی دن کے لیے سہی ہماری اماں کو ضرور ردولی آنا پڑتا تھا۔ اسرار بھائی کے تقاضوں کے سامنے ان کے لیے انکار ممکن ہی نہ تھا۔ کٹی باغ پہنچ کر سنتے ہیں کہ اسرار بھائی کی ضد ہوتی تھی کہ وہ باراتیوں میں شامل ہوں گے جو خوش و خرم اور اودھم مچاتے نظر آتے تھے۔ لیکن روایت کے مطابق ان کا تعلق زہرہ بی بی کے میکہ والوں سے تھا جن کو بیٹی کی رخصتی کے موقعہ پر آبدیدہ اور دل شکستہ ہونا چاہیے اور وہ چاہتے تھے کہ ان باراتیوں کے مجمع میں شریک ہوں جو خوش و خرم دلہن کو رخصت کرا کے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ کم عمری میں تو وہ کامیاب ہو جاتے تھے کہ کسی صورت کٹی باغ کے میلے وہ ڈھول تاشہ بجانے والوں کے مجمع میں گھس جائیں۔ لیکن جوانی میں قسمت نے انھیں وہی رول دیا جو زہرہ بی بی کی رخصتی کے وقت ان کا ہونا چاہیے تھا۔ ایک مستقل دل کی چوٹ حصہ میں آئی۔

اس وقت کسے معلوم تھا کہ وہ دل کی بازی اس حسینہ کے عشق میں ہاریں گے جس کا نام زہرہ ہی ہوگا۔ الھڑ اور شوخ و شرارہ اپنے زمانہ کی نامور سیاسی ہستیوں کی لاڈلی۔ بجائے گاؤں کے دلی کی ایک شاندار کوٹھی کی باسی، فرائض کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی۔ یہ پیکر حسن و لطافت تو پہلے ہی کسی پلو میں باندھ دی گئی تھی۔ سو روایتی کہانی اور اس کہانی میں فرق یہ رہا کہ کٹی باغ کی زہرہ بی بی کا رول اسرار بھائی کے حصہ میں آیا۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ اس کا قوی امکان تھا کہ اسرار بھائی کا نام مسعود ہوتا۔ سنا ہے کہ ہمارے دادا منتظر تھے کہ ان کے یہاں پوتا ہو اور وہ اس کا نام مسعود رکھیں۔ پر ہماری ماں نے ان کی خواہش پوری نہ کی۔ پے در پے لڑکیاں پیدا کیں، جو چند دن چند ماہ اس دنیا میں سانس لے کر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ آخر کو ہمارے دادا نے اپنے نواسے کا نام مسعود رکھ دیا۔ اسرار بھائی اس نام سے محروم ضرور رہے۔ لیکن کہانی کی زہرہ بی بی کی طرح وہ اپنی معصوم اور پاکیزہ

محبت کو آخری سانس تک سینہ سے لگائے رہے۔

اسرار بھائی کی شخصیت اپنے (Genes) جینس سے کس حد تک متاثر ہوئی۔ اس سلسلہ میں اگر اپنے کچھ بزرگوں کا ذکر کروں تو نامناسب نہ ہوگا۔ میرے ابا جان ان بزرگوں کا ذکر بہت ہی تعظیم اور فخر کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ ہمارے دادی کے والد اخوند منور علی عربی و فارسی کے چوٹی کے عالم تھے۔ اُن کی شہرت سن کر نواب اودھ نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ان کو اپنے دربار میں بلایا تھا اور اُن کو منور الدولہ کے لقب سے نوازا تھا۔ ان کا رہائشی گھر بہت ہی شاندار اور وسیع تھا۔ پیدائشِ اطفال کے لیے اور دنیا سے رخصت ہونے والوں کے غسل کے لیے الگ الگ کوٹھریاں تھیں جو عام طور پر مقفل رہتی تھیں اور بروقت ضرورت ہی کھلتی تھیں۔ سنا ہے کہ کسی وقت اس پر سنہری بُرجی بھی لگی ہوئی تھی۔ اپنی اکلوتی بیٹی کو یعنی ہماری دادی کو جن کا نام لطافت النساء تھا، پیار سے دل آرا بیگم کہتے تھے۔ غالباً یہ عرفیت لکھنؤ کی درباری تہذیب کی دین تھی۔ دوسرے بزرگ زاہد علی صاحب تھے جن کا ذکر اس سلسلے میں ضروری ہے۔ خواہ اپنے وقت میں وہ بلیک لسٹیڈ ہی کیوں نہ رہے ہوں۔ انھوں نے گھربار چھوڑ زمینداری سے منھ موڑ کر سپاہ گری کا پیشہ اختیار کیا تھا اور غدر میں شہید ہوئے تھے۔ سو اگر میں یہ کہوں کہ درس و تدریس سے لگاؤ اور اپنی مٹی سے محبت ہمیں کچھ حد تک اپنے خون سے ملی تو بے جا نہ ہوگا۔ ازراہ تذکرہ یہ بتانا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ تقسیم ہند کے بعد ہمارے خاندان سے سوائے چچا زاد بھائیوں کی دو عدد لڑکیوں کے جن کی شادی غیروں میں ہوئی تھی، کسی نے بھی پاکستان کا رُخ نہیں کیا۔

ہمارے دادا چودھری احمد حسین اپنے وقت کے بہت ہی سمجھدار اور پڑھے لکھیلوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ کہتے ہیں حساب و کتاب و معاملہ فہمی میں ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ قرب و جوار کے لوگ اُن سے مشورہ لینے آتے تھے۔ زمینداری کے مسائل منٹوں میں سلجھا دیتے تھے۔ ایک دور میں اسرار بھائی بھی حساب میں مہارت رکھتے تھے۔

ہمارے دادا کی سات اولادیں تھیں۔۔ چار بیٹے تین بیٹیاں۔ ایک بیٹے اور ایک بیٹی کا جوانی میں انتقال ہو گیا تھا۔ غالباً میری پیدائش سے پہلے۔ سو مجھے تو اپنے دو تایا اور دو پھوپھیاں ہی یاد ہیں۔ بڑے تایا کے سپرد زمینداری کی دیکھ بھال کر دی گئی تھی۔ ان کا قیام ہمارے گاؤں سہنی میں ہی رہتا تھا۔ دوسرے چچا ردولی میں اپنے ننہالی گھر کے ایک حصہ میں رہتے تھے۔ انتہائی ذہین اور باذوق تھے۔ لیکن ان کے طور طریق ڈگر سے بالکل ہی ہٹ کر تھے۔ طبیعت

کے نیک لیکن انتہائی دل پھینک۔ زندگی کی ہر خوب صورتی سے دِل چسپی لیکن ان کے حصول کے لیے محنت سے گریز۔ رقص اور موسیقی سے انتہائی دل چسپی سنتے ہیں کہ راتیں کوٹھوں پر گزرنے لگی تھیں۔ جائداد کا خاصا حصہ ان چکروں میں گنوادیا۔ آخر کار بہن بھائی ان کے پیروں میں شادی کی بیڑیاں ڈالنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ قسمت سے بیوی بہت ہی سمجھدار اور سلیقہ شعار ملیں اور شوہر کو راستہ پر لے آئیں۔ ہم سب ان چچا کو عمو جان کہتے تھے۔ یہ اپنی زندہ دلی اور کھلنڈرے پن کی وجہ سے بچوں میں بہت ہی مقبول تھے۔

ان چچا کے ساتھ ایک خاندانی روایت وابستہ ہے اور بچپن میں ہم سب کو سنائی جاتی تھی۔ کہتے ہیں کہ بنی خانہ کی بارہ دری کے دو طرفہ دو منزلہ کمرے تھے۔ ان میں سے ایک کی اوپری منزل میں ایک جنات بابا رہا کرتے تھے۔ جو ایک طرح سے خاندان کے مربی اور سرپرست تھے۔ جنات بابا کہیں سے ایک نئی نویلی دلہن اٹھالائے۔ غالباً وہ تنہا رہتے رہتے اکتا گئے تھے۔ خاندان کے بچوں کے لیے ایک تفریح کی صورت پیدا ہو گئی۔ بار بار وہ بارہ دری میں جاتے اور جنات بابا کو پکار کر دُلہن نمائی کی فرمائش کرتے۔ آخر کار وہ تنگ آگئے اور جھنجھلا کر ایک چھوٹی سی کنکری اٹھائی اور بچوں کی طرف پھینک دی۔ ایک بچے کی پیشانی پر اس کنکری کی چوٹ لگی۔ وہ لڑکا کون تھا اور اس پر کیا اثر ہوا۔ یہ تو پتہ نہیں البتہ اس عقیدہ نے جڑ پکڑی کہ ہر نسل میں ایک اولاد نرینہ ایسی ضرور ہوئی جو نارمل نہ تھی۔ ذہین ہوشیار، ہاتھ پیر سے ٹھیک ٹھاک لیکن وقت کے طور طریق، خاندانی ریت ورواج، اقدار اور روایتوں کے تقاضوں سے بے نیاز۔ اپنی راہ میں مگن۔ ہمارے عمو جان کو اسی نوعیت کی پیداوار سمجھا جاتا تھا اور بچپن میں اسرار بھائی بھی بزرگوں کی نظروں میں اسی سلسلہ کی کڑی سمجھے جاتے تھے۔ مزاج کے لاأبالی افتاد کی ذمہ داری جنات بابا کی کنکری پر ڈالی جاتی تھی۔

ہماری پھوپھیاں اپنی ذہانت اور تیزی کی وجہ سے قصبہ میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی تھیں۔ اس دور میں لڑکیوں کے لیے قرآن شریف پڑھنا کافی سمجھا جاتا تھا۔ اس کی ذمہ داری عام طور سے گھر کی بزرگ خواتین پر ہوتی تھی۔ بہت شوق ہوا تو شدھ بدھ اردو پڑھنا سیکھ لیا۔ لکھنے کا ہنر لڑکیوں کے لیے معیوب ہنر سمجھا جاتا تھا۔ شاید اندیشہ یہ رہا ہو کہ جانے کس وقت جذبات کے بہاؤ میں آجائیں اور اپنی ہم عمر خاندان کے لڑکوں کے ساتھ پرچہ بازی کا سلسلہ شروع ہو جائے اور خاندان کی بدنامی ہو۔ ہماری پھوپھیوں نے اپنے ماں باپ سے چھپ کر جانے کیسے گاؤں کے ان منشیوں اور کارندوں سے مدد لے کر جو زمینداری کے مسائل لے کر دادا کے پاس آتے تھے، ہندی لکھنا سیکھ لی تھی۔

ہمارے والد کا نام سراج الحق تھا۔ ماں باپ کی سب سے چھوٹی اولاد۔ دوسرے بہن بھائیوں سے قدرے مختلف، نہایت سمجھدار، بُردبار اور محنتی۔ سیدھے پن کی حد تک نیک اور شریف۔ گاؤں کی رعیت نے انھیں اللہ میاں کی گئو کا نام دے رکھا تھا۔ دوربین باپ نے بھانپ لیا تھا کہ ان کا یہ بیٹا زمینداری کے لیے موزوں نہیں۔ کسانوں سے ان کی محنت کی کمائی کا بیشتر حصہ لگان کی صورت میں وصول کر لینا اور اس پر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنا اس کے بس کا روگ نہیں۔ ہمارے ابا کی قسمت اور یقیناً آنے والی نسل یعنی ہم سب کی خوش نصیبی ایک تعلقدار کے گھر بیٹوں کو انگریزی پڑھانے فیض آباد سے ایک استاد بلائے گئے۔ اس وقت فیض آباد اودھ کا دارالسلطنت تھا اور اکثر "صاحب لوگ" فیض آباد سے لکھنؤ آتے جاتے ردولی سے گزرتے تھے۔ لڑکوں کو شد بدھ انگریزی آجائے تو برا نہ تھا۔ آقاؤں کی خاطر داری میں سہولت ہوگی۔ غالباً یہ تھا مقصد۔ ہمارے دادا نے بھی اپنے چھوٹے بیٹے کو ان استاد کے پاس بٹھادیا۔ تعلقدار صاحب کے بیٹے تو پیچھے رہ گئے، ہمارے باپ نے اپنی محنت اور لگن سے استاد جی کو اتنا متاثر کیا کہ انھوں نے تیاری کروا کر اپنے اس شاگرد کو پرائیویٹ طور پر فیض آباد سے ہائی اسکول کے امتحان میں بٹھلادیا۔ ابا بہت ہی اچھے نمبروں سے پاس ہوئے۔ قصبہ کے پہلے میٹرک پاس تھے۔ عزیزوں اقربا اور بزرگوں نے ان کے گلے میں ہار پھول ڈالے۔ باپ کی ہمت بڑھی۔ استاد کے اصرار اور مشورہ سے لکھنؤ بھیجے گئے اور انھوں نے اے ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کی اور پورے قصبہ کے لیے باعثِ فخر بنے۔

ہمارے باپ کی ردولی کے زمیندارانہ حلقہ کی پہلی شخصیت تھی جو خاندانی پیشہ زمینداری کو چھوڑ سرکاری ملازمت کے لیے وطن سے باہر نکلی۔

ان کی پہلی ملازمت جھانسی میں محکمہ تعلیم کی تھی۔ لیکن جھانسی گلے کی پھانسی اتنی دور گویا سمندر پار۔ کام ان کی پسند کا تھا، طبیعت اور مزاج کے لیے موزوں۔ لیکن دوری گھر والوں کی برداشت سے باہر تھی۔ سعادتمندی کا تقاضہ یہی تھا کہ اس ملازمت کو خدا حافظ کہیں۔ دوسری ملازمت لکھنؤ کی تھی، لیکن اکسائز ڈیپارٹمنٹ کی، اُسے بھی چھوڑنا پڑا۔ وجہ دل چسپ تھی۔ حکیموں کی دوائیں اور شربت شیشی بوتلوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائی جاتی تھیں۔ ضمیر فروشوں کی پیداوار ہر دور ہی میں رہی۔ مسئلہ کمی اور بیشی کا رہا۔ دواؤں اور شربت کے نام پر دیسی شراب کی بوتلیں بھی ادھر سے ادھر ہو جاتی تھیں۔ ٹیسٹ کے لیے آلے تو تھے نہیں۔ شک کی صورت میں ابا کو بوتل کھولنا پڑتی تھی اور اندر کے مال مسالے کو چکھنا پڑتا تھا۔ اس صورت میں شراب کا زبان سے چھو جانے کا امکان تھا۔ اس اندیشہ نے اس

نوکری کو بھی چھوڑنے پر مجبور کیا۔ قسمت بھی ہنس رہی ہوگی کہ اس نمازی پرہیزگار کی دونوں ہی اولادیں اس لعنت کا شکار ہوں گی۔

ان دونوں نوکریوں کو چھوڑنے کے بعد بارہ بنکی میں وکالت شروع کی۔ ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری تھی۔ آزاد پیشہ کے دل سے قائل تھے لیکن طبیعت میں وہ تیزی طراری نہ تھی جو ایک وکیل کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ نہ ہی ذہن کا وہ رجحان جو جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا سکے۔ غرض یہ کہ وکالت چل نہ پائی پھر لکھنؤ واپس ہوئے اور محکمہ رجسٹری میں کام شروع کیا اور اس محکمہ میں ریٹائرمنٹ تک جمے رہے۔

ہماری ماں بالکل ہی ان پڑھ تھیں۔ زمینداری اور جائداد کے کاغذات پر انگوٹھے اور سیاہی سے کام لیتی تھیں۔ پڑھ نہیں سکی تھیں، دستخط نہیں کر سکتی تھیں لیکن جاہل کسی لحاظ سے نہ تھیں۔ انتہائی پریکٹیکل، معاملہ فہم، دور اندیش، ذہین اور تیز۔ زمینداری کے تمام مسائل اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے تھیں۔ کسانوں کے نام کس کے پاس کتنی زمین ہے، اس پر کتنا لگان واجب ہے، کتنا ادا ہوا ہے اور کتنا بقایا ہے۔ کس باغ میں کتنے درخت ہیں وغیرہ وغیرہ یہ ساری تفصیلات ازبر تھیں۔ پردے کے پیچھے بیٹھ کر گاؤں کے منشی حاجی صاحب سے پورا حساب کتاب لیتیں۔ ہزاروں کا حساب انگلیوں کی مدد سے ہو جاتا۔ ضروری صلاح مشورہ دیتیں۔ ان پڑھ یوں رہ گئیں کہ ماں باپ کی اکلوتی اور بے تحاشا لاڈلی اولاد تھیں۔ پانچ سال کی عمر پر بسم اللہ ہوئی اور قرآن شریف کے لیے ایک استانی جی کے سپرد کر دی گئیں۔ بھلا کسی بچہ کا کھیل کود چھوڑ الف زبر آ اور بے زبر با میں دل لگا ہے۔ چار چھ ہی دن گزرے تھے۔ روزانہ ہی روتی پیٹتی جاتیں اور منہ بسورتی ہوئی واپس ہوتیں۔ منتوں مرادوں کی پیداوار تھیں کئی بہن بھائیوں کے ضائع ہونے کے بعد بچی تھیں۔ اسی بنا پر ان کا نام نبی بخشی رکھا گیا تھا عرفیت بگن تھی اور عام طور پر بگن بی ہی کہلائیں۔ بہرحال ان کے ماں باپ سے ان کا اس طرح دکھی ہونا دیکھا نہ گیا اور یہ کہہ کر "مارو گولی ایسی پڑھائی پر بٹیا کا منہ بالکل چمچہ سا ہو گیا ہے۔" اُستانی جی کے پاس سے اٹھالی گئیں ہمارے باپ نے لاکھ زور لگایا کہ وہ کم از کم دستخط کرنا ہی سیکھ لیں ارادہ کی مضبوط تھیں۔ بھلا شادی کے بعد کوئی کتاب کاپی لے کر بیٹھا ہے۔ سو کسی صورت راضی نہ ہوئیں۔ اگر وہ کوئی بات طے کر لیتی تھیں تو ان کو اپنی جگہ سے ہلانا بہت دشوار ہوتا تھا۔ عام طور پر ان کے فیصلے سوچ سمجھ کر ہی ہوتے تھے۔

ہم دونوں بہنوں کے انگریزی اسکول میں داخلے وہ بھی ایسا اسکول میں جو میم کی سرپرستی میں

چل رہا تھا، اس دور میں اور ہماری ماں کے حلقہ میں کوئی معمولی حادثہ نہ تھا۔ جانے انھیں کتنے ہی طنز اور طعنوں کا سامنا کرنا پڑا ہو گا لیکن انھوں نے کسی بات کی پرواہ نہ کی اور اپنی جگہ جمی رہیں سو ہم لوگوں کے حق میں ان کی یہ خصوصیت مفید ثابت ہوئی۔ ہماری بڑی بہن کے شوہر کا انتقال ہوا۔ عجیب ہی دل دکھانے والی رسمیں تھیں۔ بھائیوں کو بہن کے سر سے رنگین ڈوپٹہ اتار کر سفید ڈوپٹہ ڈالنا ہوتا تھا اور بھاوجوں کے سپرد نند کی کلائیوں کی چوڑیاں اتار کر انھیں توڑنے کی ذمہ داری تھی۔ بیٹی کی چوڑیوں کے ساتھ ہماری ماں نے بھی اپنی چوڑیاں اتار دیں۔ خاندان کے بزرگ لاکھ سمجھاتے رہے۔ ایک سونے کی چوڑی ہی ڈال لیں۔ ان کا ننگے ہاتھ ہونا بد شگونی اور نحوست ہے اور زد میں ان کا سہاگ آسکتا ہے۔ پر انھوں نے کسی کی سن کر نہ دی۔ میری یاد میں وہ آپا کے ساتھ ہمیشہ سفید پوش اور ننگے ہاتھ ہی رہیں۔ ارادہ کی مضبوطی کے ساتھ ان کے مزاج میں تیزی بھی تھی۔ کسی کی الٹی سیدھی سن کر ان کے لیے خاموش رہنا ممکن نہ تھا۔

سو یہ تھیں ہمارے جینس (Genes) کی خصوصیات۔ ہم نے کیا پایا اور کیا کھویا۔ اپنے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ انکساری کا تقاضہ مانع ہے۔ لیکن سوچتی ہوں کہ ماں باپ کے ساتھ ناانصافی ہو گی اگر میں یہ نہ کہوں کہ انھوں نے بے شک اپنی اولادوں کے لیے ورثہ میں زمین جائداد بنک بیلنس نہیں چھوڑے لیکن شرافت اور ذہانت کا بے بہا سرمایہ ضرور چھوڑا۔ کاش اسرار بھائی نے باپ کی نیکی اور حلیمی کے ساتھ ساتھ ان کی محنت اور ریاضت کی خصوصیت بھی پائی ہوتی اور ماں کی ذہانت کے ساتھ ان کی دور بینی اور مصلحت اندیشی اور ارادہ کی مضبوطی اس صورت میں، اُن کی زندگی کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔

ہماری بڑی بہن آپا اور اسرار بھائی کے درمیان ایک اور بھائی تھے جو اپنی ابھرتی ہوئی جوانی میں موت کی نذر ہو گئے تھے۔ لکھنؤ سے اپنے دوستوں کے ساتھ ردولی کے باغ میں پکنک منانے آئے تھے۔ آموں کی فصل تھی موسم گرما کی چھٹیاں تھیں گئے ہنستے کھیلتے واپس ہوئی چار کاندھوں پر ان کی لاش، درخت کی ٹہنی کے لیے آموں کا بوجھ ہی کافی تھا، ان کا بوجھ نہ سہار سکی۔ اس حادثہ نے ماں باپ کو چکنا چور کر دیا۔ ماں اور بوڑھی نانی دوسرے بیٹے کے تحفظ میں دیوانگی کی حد تک لگ گئیں۔ کون سی منت ہو گی جو ان کے لیے نہ مانی گئی ہو، کون سے مزار تھے جن پر وہ نہ لے جائے گئے ہوں۔ کان میں چھید کیا گیا جس میں بندہ ڈال دیا گیا اور غالباً گیارہ سال کی عمر میں اجمیر شریف لے جا کر اتارا گیا۔

ہمارے جیسے گھروں میں بچوں کی پرورش کی زیادہ تر ذمہ داری ماؤں کی سرپرستی میں بواؤں کی ہوا کرتی تھی۔ یہ بوائیں آج کی آیاؤں کی طرح نہ تھیں کہ آج آئیں اور کل گئیں ان کا سلسلہ بھی خاندانی نوعیت رکھتا تھا۔ ہماری بوا عبادن کی ماں نے ہماری ماں کو پالا تھا اور ان کی ماں نے غالباً ہمارے نانا یا نانی کو۔ ہماری یہ بوا عبادن بہت ہی پیاری شخصیت تھیں۔ گوری چٹی، دبیز جسم کی۔ مرتے دم تک لکھنؤ آنے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ اس اندیشہ کے تحت کہ کبھی ان کا جنازہ اس چوکھٹ سے محروم نہ ہو جائے۔ جہاں کا بقول ان کے انھوں نے نمک کھایا۔

اسرار بھائی کی پرورش کی ذمہ داری عبادن بوا پر ہی پڑنی چاہیے تھی لیکن کچھ یوں ہوا کہ ماں دیوانگی کی حد تک اسرار بھائی کی تحفظ میں لگی ہوتیں تھیں اور اس منتوں مرادوں سے پلی اولاد کو ایک لمحہ اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتی تھیں اور کچھ سنتے ہیں کہ اسرار بھائی کے پیدائش کے بعد ہی سے ایسے رنگ تھے کہ بھاری بھرکم بوا کے لیے اس کا سنبھالنا مشکل تھا۔ اسرار بھائی کی پیدائش کے تقریباً پونے دو سال بعد انصار بھائی پیدا ہوئے اور وہ ان بوا کے سپرد کر دیے گئے۔ وہ طبیعتاً سیدھے اور بھولے تھے۔ ان کے لیے بوا کی کہانیاں اور باتیں بوا کے پہلو سے چپکے رہنے کے لیے کافی تھیں۔

اماں بتاتی تھیں کہ اسرار بھائی پیدا تندرست ہوئے تھے لیکن موٹے پھولے پھالے اور گدیلے سے نہیں۔ دبلے لیکن مضبوط اور کسے ہوئے۔ روتے تھے تو کھال کھنچ جاتی تھی اور رگیں ابھر آتی تھیں اور چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔ آنکھیں چمکدار تھیں۔ رات کو لالٹین کی طرف نظریں جمائے رکھتے۔ لاکھ تھپکیاں دی جاتیں، لوریاں سنائی جاتیں۔ نیند سے جنگ جاری رکھتے۔ اسی شب بیداری کی بنا پر ان کی عرفیت جگن پڑ گئی۔ بعض ملازمین ان کو جگو میاں کہتے تھے۔ ہم دونوں بہنیں ان کو ''جگن بھیا'' کہتے تھے۔

سنا ہے کہ بچپن ہی سے اسرار بھائی کی کچھ ایسی سیمابی کیفیت تھی کہ ایک جگہ ٹھہرنا ان کے لیے محال تھا۔ بوا کے بس کا روگ تو تھے نہیں۔ ماں کو ان کا ساتھ دینے کے لیے کم عمر لڑکوں کا سہارا لینا پڑا۔ ایک لڑکا شرف الدین جو شرفو پکارا جاتا تھا۔ محض اس لیے تھا کہ ان کے ساتھ کھیل کود میں رہ سکے۔ شرفو اور اسرار بھائی کے درمیان دانت کاٹی روٹی کا رشتہ تھا۔ مستقل ضد رہتی تھی کہ اسی کے ساتھ اٹھیں بیٹھیں اور کھائیں پئیں۔ ان کے ذہن میں اونچ نیچ کا تصور پیدا کرنا ناممکن تھا۔ اکثر و بیشتر اس کے ساتھ باورچی خانہ میں کھانا کھا لیتے۔ سونے کے لیے اُس کا کھٹولا اُن کے پلنگ سے ملا کر ڈالا جاتا۔ ماں بتاتی تھیں کہ ایک دفعہ شرفو کو بخار چڑھا

بہت ہی تیز اور سرسامی قسم کا۔ ماں کو یہ اندیشہ کہ کبھی اُس کی بیماری لاڈلے بیٹے کو نہ لگ جائے اور بیٹے کی یہ ضد کہ وہ شرفو کے پلنگ کے پاس سے نہیں ہٹیں گے۔ ضد کے سامنے ہار ماں کی ہوئی۔ ڈانٹنے پیٹنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ بہلانا اور پھسلانا بھی کارگر نہ ہوا۔

یہ تو سنی سنائی بات ہے۔ اس سلسلہ میں میری اپنی ایک یاد ہے۔ مجھے بری طرح چیچک نکلی۔ بچوں کو ٹیکہ لگانے میونسپلٹی سے آدمی آیا تھا۔ ہمارے باپ لکھنؤ میں تھے۔ نانی نے اُسے اٹھنی یا روپیہ دے کر واپس کر دیا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے نرم گوشت میں سوئی چبھوئی جائے۔ یہ اُن کے حلق سے نہیں اُترا۔ بہر حال میں چیچک کا شکار بنی۔ اُس وقت بھی لوگوں کا احساس تھا کہ گھر میں ایک اس موذی بیماری کی گرفت میں آیا تو دوسرے بچ نہیں سکیں گے خصوصاً گھر کے بچے۔ جانے کیوں چیچک کو ماتا کا نام دیا جاتا تھا اور اس سے شدید قسم کا چھوت کا رشتہ تھا۔ میرا پلنگ دور کی سہ دری میں کر دیا گیا اور ململ کے ڈوپٹہ کا تھیلا سا بنا کر میرے گلے میں ڈال دیا گیا۔ جلن اور کھجلی کو دور کرنے کے لیے میری ماں اور نانی نیم کی نرم کونپلوں کی ٹہنیوں کو استعمال کرتی تھیں۔ اُن کی فراہمی تو اسرار بھائی نے اپنے سر لے ہی رکھی تھی۔ لیکن لوگوں کی آنکھ بچتے ہی وہ میرے کمرے میں ہوتے اور مجھے ہنسانے کی کوشش کرتے۔ آگے بھی یہ دیکھا کہ گھر میں کوئی بیمار ہوا اور اُن کے چہرے پر بدحواسی طاری ہو گئی اور ہر حالت میں اُس کی تیمارداری کو اپنی تفریحوں اور مشاغل پر ترجیح دی۔ اُن کی طبیعت کی یہ نرمی ہر حالت میں برقرار رہی۔

اسرار بھائی کے دل میں اگر ماں کی بے طرح محبت تھی تو باپ کی از حد عزت بھی۔ اول تو ہمارے باپ نے براہِ راست اپنی اولادوں کی تنبیہہ سے حد بھر گریز کیا۔ زیادہ تر اس قسم کی باتوں کے لیے بیوی کا ذریعہ استعمال کرتے تھے۔ اگر اسرار بھائی سے کبھی بھی انھوں نے ان کے مستقبل کے بارے میں کوئی بات چیت کی بھی تو ہمیشہ ہی بیٹے نے سر جھکا کر کوئی جواب نہیں دیا۔ اس حد تک لحاظ تھا کہ ترنم سے اُن کے سامنے اپنا کلام سنانے سے بھی گریز کرتے تھے۔ گھر میں بوتل لانے کا کیا سوال کبھی ابا کے سامنے سگریٹ نہیں پی۔ ایک دفعہ غالباً شوکت تھانوی نے ابا سے کہا مجاز ذرا زیادہ پینے لگے ہیں، انھیں روکیے۔ نصیحت فضیحت کی ذمہ داری اماں غریب کے سپرد تھی۔ یہ بات بھی انھیں کے ذریعہ اسرار بھائی تک پہنچی۔ انھوں نے شوکت تھانوی سے جا کر کہا یار دو نسلوں سے دوستی رکھنا تمہارے بس کا روگ نہیں۔ تم تو ایک کو چن لو۔

جہاں تک شکل وصورت کا تعلق تھا اسرار بھائی پر ماں باپ دونوں ہی کی چھاپ تھی۔ باپ سے لمبا قد اونچی ناک اور پتلے ہونٹ تھے اور ماں سے چہرے کی بناوٹ اور چہرے پر ذہانت کی چمک، جس نے دھیرے دھیرے ماں بیٹے دونوں کا ہی ساتھ چھوڑ دیا اور اداسی کی گہرائی میں تبدیل ہو گئی۔

اسرار بھائی کے کلام پر رائے کا اظہار کرنے والوں نے ان کے لہجہ میں جذبات کی گرمی کے ساتھ ایک سکون بخش، دھیمے پن، نرمی اور گھلاوٹ وغنائیت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ یہ نرمی یہ گرمی صرف ان کے لہجہ تک محدود نہ تھی۔ یہ ان کے طور طریق اُن کی شخصیت کی ایک خصوصیت تھی۔ ہر چھوٹے بڑے کے لیے اُن کے پاس محبت وخلوص کی گرمی تھی۔ جس کا اظہار نہایت ہی دبے، دھیمے اور معصومیت کا رنگ لیے ہوئے انداز میں ہوتا تھا۔ کسی نے ایک جگہ لکھا ہے ”مجاز پر غصہ کرنا اس سے خفا ہونا تو ممکن ہی نہ تھا۔ اُن کی خصوصیات پر روشنی ڈالنے کے لیے ہم بھائی بہنوں کے آپسی تعلقات کا ذکر کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

سنا ہے کہ ہم پیدا تو گیارہ بہن بھائی ہوئے تھے۔ لیکن کچھ تو آنکھ کھولتے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ البتہ ایک بھائی نے سولہ سترہ سال کی عمر میں ایکاایکی زندگی سے منھ موڑا اور گھر کی فضا پر غم وصدمہ کا دھندلا پن چھوڑ گئے۔ باقی رہے ہم تین بہنیں اور دو بھائی۔ ان سب میں بڑی تھیں آپا، عارفہ خاتون ہمارے ماں باپ کی پہلی اولاد۔ ان کی اور اسرار بھائی کی عمر میں کم وبیش تیرہ چودہ سال کا فرق تھا۔ جوانی میں بیوہ ہو کر چار سال کی یتیم اولاد کو لے کر ماں باپ کے پاس آ گئی تھیں۔ قدرت نے ان کے ساتھ جو بے انصافی کی تھی، اُس کا مداوا تو ماں باپ کے بس کا روگ تھا نہیں۔ بس بھر زخم پر مرہم پاشی کی کوشش کرتے رہے۔ ماں نے گھرداری کی تمام ذمہ داری واخراجات کی رقم اُن کے سپرد کر دی اور خود ایک مشیر کار کا رول اختیار کیے رہیں۔

اسرار بھائی سمیت ہم سب کے لیے وہ بہن کی جگہ ماں کا درجہ رکھتی تھیں۔ اسرار بھائی ماں سے ضدیں کر لیتے تھے۔ جانتے تھے کہ روٹھ جائیں گے تو ضرور منالئے جائیں گے اور دیر سویر ضد پوری ہو ہی جائے گی، لیکن آپا بے جا لاڈ کی قائل نہ تھیں۔ اسرار بھائی ادب ولحاظ کی لکیر کا پاس بھی رکھتے تھے۔ اسرار بھائی کو پتنگ بازی کا بہت شوق تھا۔ مانجھا، ڈور، پتنگ مفت تو نہیں آتی تھی۔ آپا کو خوش رکھنے میں ان کا فائدہ تھا۔ اکنی دونّی تو انھیں حاصل ہو ہی جاتی تھی

اور اُن کی فرمائش حد سے تجاوز کر جاتیں تو انکار بھی ہو جاتا تھا اور اسرار بھائی خاموشی سے واپس ہو لیتے۔

جس طرح سے آپا کی طرف ان کا رشتہ خوردی بزرگی کا تھا۔ میرا ان کا درمیانی رشتہ بھی کچھ اسی نوعیت کا تھا۔ میرے لیے ان کا رول بگ برادر کا تھا۔ وہ مجھ سے تقریباً دس سال بڑے تھے۔

اسرار بھائی کی نمایاں خصوصیت تھی طبیعت کی وہ سادگی اور معصومیت جو ان کو عمر کے ہر دور میں بچوں میں بچہ بنا دیتی تھی۔ ان میں کچھ ایسی کشش تھی کہ بچے ان کی طرف کھنچتے تھے اور وہ بچوں کی طرف۔ وہ ہمارے کھیل کود میں برابر شریک ہوتے تھے۔ گویا گڈے کی شادی ہو وہ قاضی کے رول میں ہماری مدد کو تیار اور موتیا کے ہار اور گیندے کے پھول، بول گڈے بول تجھے نکاح قبول کہتے کہتے ہماری گڑیا کی چٹیا ان کے ہاتھ میں ہوتی اور وہ ہوا میں ناچتی نظر آتی۔ ہم ہنڈیاں پکا رہے ہوتے تو کھٹاس مٹھاس چکھنے کے بہانے وہ آ پہنچتے اور ہماری ہانڈی آدھے سے زائد خالی ہو جاتی۔ پر ہم اُن سے روٹھتے تو کیوں کر خفا ہوتے تو کیسے، اپنا ہی نقصان ہوتا۔ انھیں کی مدد سے تو ہمیں اپنی گڑیوں کے کپڑوں کے لیے وہ رنگ برنگی کترنیں ملتی تھیں جو ماں اپنی بقچی میں ہماری پہنچ سے باہر رواغ کے اونچے ترین طاق پر رکھتی تھیں۔ وہی تو دوپہر کو سہ دری میں سوتی ہوئی بوا کے پلو میں بندھی کنجی حاصل کر کے جنس کی کوٹھری سے ہماری ہنڈیوں کے گڑ گھی اور چاول مہیا کرتے تھے۔

آج بھی برسات کے موسم میں آسمان پر بادل دیکھ کر اپنے بچپن کی برسات یاد آجاتی ہے۔ ساون کا مہینہ ہم لڑکیوں کے لیے خوشیوں اور رنگینیوں کا پیام لاتا تھا۔ زمانہ بدل گیا، ریت رواج بدل گئے۔ قصبہ اور گاؤں بھی کیوں کر محفوظ رہتے۔ وہاں کے بچے بھی اب پکنک کے نام سے واقف ہو گئے ہوں گے۔ ہمارے بچپن میں تو زندگی کی یکسانیت کو دور کرنے کے لیے وہ تہوار تھے جن کا تعلق موسم سے تھا یا وہ عرس و میلے اور محرم میں تعزیوں اور تابوتوں کے جلوس جو ردولی کی تہذیب کی خصوصیت تھے یا پھر شادی بیاہ، کن چھیدن، نک چھیدن، بسم اللہ وغیرہ کے قسم کی تقریبیں۔

ساون کے مہینہ میں ہمارے خاندان کے ہر گھر میں ایک دن بہت ہی گہما گہمی سے منایا جاتا تھا۔ بہانہ تھا ہم کمسنوں کے لیے تفریح اور ہنسی مذاق کا موقعہ پیدا کرنا۔ ہمیں صلاح مشورہ دینے کے بہانے خاندان کی بڑی بوڑھیاں بھی یکجا ہو جاتی تھیں۔ تیاریاں بہت پہلے سے شروع ہو جاتی تھیں۔ موسم رنگین ہو اور کپڑے مرے اور سوئے ہوئے ایسی بھی کیا

بدمذاقی۔ ہری اور لال پیلی چندریاں رنگ ریزوں کے یہاں سے رنگوائی جاتی تھیں۔ لاکھ سے بنے روپہلے اور سنہرے شاہانوں اور رنگ برنگی چوڑیوں کے تقاضوں کے لیے منیہارنیوں کے پاس دوڑتے دوڑتے گھر کے نوکروں کے پاؤں تھک جاتے تھے۔ سلیقہ مند لڑکیاں خود مل بیٹھ کر لہریا دوپٹہ رنگتیں۔ پورا مہینہ ہی رنگینی اور تفریح کا ہوتا۔ آج اپنے گھر ساون کی تقریب ہے تو کل دوسرے کے گھر۔ کن کن کو بلایا جائے گا، کیا پکوان پکیں گے، ان کی کیا مقدار ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ یہ ہوتے تھے وہ مسائل جس کے لیے بزرگوں سے مشوروں کا سہارا لینا ہی پڑتا تھا۔ سو ہوتا تو تھا یہ فنکشن بن بیاہی لڑکیوں اور نئی نویلی دلہنوں کا لیکن مائیں، خالائیں اور ساسیں بھی اپنا رول رکھتی تھیں اور خاندان کے سارے ہی بزرگ اپنی متانت اور بزرگی کو برقرار رکھتے ہوئے کم عمروں کی زندہ دلی سے پوری طرح محظوظ ہوتے تھے۔ اینٹوں کے چولہے بنتے، بڑی بڑی کڑھائیاں چڑھائی جاتیں اور انواع اقسام کے پکوان تلے جاتے۔

اس موقعہ پر اسرار بھائی اپنے ہم عمر رشتہ دار ساتھیوں اور کم عمر نوکروں کے ساتھ آگے آگے نظر آتے۔ کوٹھریوں سے بڑی کڑھائیاں، جھولے کے لیے مضبوط رسّی اور شیشم کا تختہ نکلوانا ان کی ذمہ داری تھی۔ ہر گھر کے لیے یہ اشیا ضروریات میں شامل تھیں۔ ساون کا دن منانے کے موقع پر نکالی جاتیں اور بعد میں بحفاظت تمام رکھ دی جاتیں۔

ہمارے ہی خانہ کے زنان خانہ اور مردان خانہ کے درمیان ایک اونچا ٹیلا تھا اور اس پر ایک بہت ہی پرانا نیم کا درخت اس کی مضبوط ترین شاخ کا انتخاب اور اس پر رسا پھینک پھینک کر جھولا ڈالنا اسرار بھائی معہ اپنے ساتھیوں کے اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے اور چھین جھپٹ کر مزیدار پکوان کا زیادہ حصہ اپنا لینا اپنا حق۔ معاوضہ میں ہمیں اپنے جھولے پر ان کے پینگیں مارنے کا مطالبہ ماننا پڑتا تھا اور یہ لوگ ہم لڑکیوں کے اعصاب کی آزمائش پر اتارو ہو جاتے تھے۔ پینگیں اونچی سے اونچی تر ہوتی جاتی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ ہماری چیخیں بھی ہمارے ساون کے ملہار کے سر و تال ان چیخوں میں گم ہو جاتے۔ جب شور و غلا اور چھیڑ چھاڑ حد کو پار کرنے پر ہوتا تو بزرگوں کی محبت آمیز ڈانٹیں آڑے آتیں۔

یہ اسرار بھائی کی عمر کے اس دور کی بات ہے جب ان کی شخصیت شوخی و شرارت اور زندہ دلی سے بھرپور تھی۔ ردولی میں اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ آنکھ مچولی، گلی ڈنڈا اور کبڈی کھیلنا۔ لکھنؤ میں پاس پڑوس، ساتھیوں کے ساتھ کرکٹ اور ہاکی کی پریکٹس کرنا اور لونگ جمپ اور ہائی جمپ کی بازی لگانا ان کے محبوب مشغلے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ پتنگ بازی کا بھی از حد شوق تھا۔

اس زمانہ میں گھر کی خواتین میں پچیسی نام کا ایک کھیل بہت ہی عام تھا۔ اس کھیل کو آج کے لوڈو کا ہم وزن سمجھنا چاہیے۔ اس کھیل میں چار افراد شریک ہو سکتے تھے۔ چار رنگ کے لکڑی کے بنے ہوئے مہرے ہوتے تھے۔ بساط خواتین خود گھر میں تیار کرتی تھیں۔ وہ جتنی سلیقہ شعار اتنی ہی رنگین اور خوبصورت ان کی بساط۔ بڑے لوگوں کے یہاں یہ کام مغلانیاں انجام دیتی تھیں۔ ہماری ماں کو پچیسی کا بہت شوق تھا۔ گھر داری کی ذمہ داریوں سے فرصت ہوتے ذرا اپنے اس مشغلے سے دل بہلاتیں۔ اسرار بھائی اس کھیل میں ان کے ساتھ شریک ہونے کے لیے ہر لمحہ تیار رہتے تھے اور وہ زیادہ تر جیتتے تھے اور ماں کو ہمیشہ شکایت رہتی کہ انھوں نے بے ایمانی کی ہے۔ کوڑیاں ہاتھ سے پھینکی جاتی تھیں اور ان کے اُلٹے سیدھے ہونے پر مہروں کی چال کا دارومدار تھا۔ اسرار بھائی تیزی سے کچھ ایسا کرتب دکھا جاتے جو ان کے مہروں کی تیز رفتاری میں مددگار ہوتا۔

اسرار بھائی شطرنج کھیلنے میں بھی بہت ماہر تھے۔ ہمارے کچے احاطہ کے گھر کے پڑوس میں ایک خاتون آکر رہی تھیں۔ بہت ہی مہذب، سلیقہ شعار اور اپنے زمانہ کے لحاظ سے پڑھی لکھی۔ ہم سب ان کو باجی کہتے تھے۔ کچھ بیمار رہتی تھیں۔ حکیم کے مشورے پر کھلی ہوا کی تلاش میں پرانے لکھنؤ کی کسی گلی کی حویلی سے منتقل ہو کر ہمارے پڑوس میں آئی تھیں۔ ان کی بوڑھی ماں اور چند بوائیں ساتھ تھیں۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے زیادہ تر بستر پر رہتی تھیں۔ شطرنج میں ماہر تھیں۔ اسرار بھائی اپنے خالی وقت کا خاصا حصہ ان کے ساتھ شطرنج کھیلنے میں گزارتے تھے۔ کھیل کے شوق کے ساتھ ساتھ بیماروں کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ انھیں باجی کے پاس کھینچ لے جاتا تھا۔ باجی کو فارسی، عربی کی شاعری پر بھی خاصا عبور حاصل تھا۔ شاید انھوں نے اس کھلنڈرے لڑکے کے اندر چھپے ہوئے شاعر کو بھانپ لیا ہو۔ بہر حال وہ اسرار بھائی سے بے حد محبت رکھتی تھیں۔ وہ اسرار بھائی کو ان پھل پھلاریوں اور قوت پہنچانے والی اشیاء میں شریک کر لیتی تھیں جو انھیں اپنی صحت کے لیے تجویز کی جاتی تھیں۔

یہ تو تھیں ان کی کم سنی کی باتیں۔ آگے چل کر جب حالات نے ان کی زندگی پر اداسی کا پردہ ڈھانپ دیا، اس وقت بھی ان کی بچوں میں بچہ بن جانے کی خصوصیت زندہ رہی۔ ہم سب کے بچوں کے ساتھ وہ اسی طرح کھیلتے تھے جس طرح وہ میرے اور ابو[1] کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ کسی وقت وہ پتنگ اُڑاتے اور ابو ڈور اور مانجھے کی چرخی لیے ان کے پیچھے ہوتے تھے اور دونوں مل کر یہ کاٹا وہ کاٹا کے نعرے لگاتے تھے۔ اب ہمارے بچے ان کے چاروں طرف گھیرا

---

[1] عبدالمعروف نعمانی ہمارے بھانجے بڑی بہن کے بیٹے

لگائے رہتے تھے۔ ابو کا بڑا بیٹا بچپن میں بہت ہی شریر اور قابو سے باہر تھا اور وہی ان کا سب سے لاڈلا تھا۔ ایسا لگتا تھا گویا بچے خواہ گھر کے ہوں یا باہر کے ان کی فطری بچپن اور معصومیت سونگھ لیتے تھے اور ان کے ساتھ لگ لیتے تھے۔ ہمارے بھانجے کے بچوں نے از خود انھیں بچو دادا کہنا شروع کر دیا تھا۔

آج کے زمانے میں لوگ موسم گرما میں نینی تال، مسوری، شملہ چلے جاتے ہیں۔ ہم اپنے بچپن میں گرمیوں کی تعطیل میں کچھ دنوں کے لیے اپنے گاؤں سہنی یا اپنے نانہالی گاؤں حیدر گنج چلے جایا کرتے تھے۔ سہنی میں ہمارے ابا نے دو کمروں کا ایک پکا مکان بنوا رکھا تھا۔ یہاں پہنچنے پر چودھری کے بیٹوں کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ نسلوں سے رائج یہ روایت تھی کہ کاشتکاروں کے بزرگ مالک کو سلام کرنے آتے تھے اور ان کے بیٹوں کے ہاتھوں میں چونی اٹھنی روپیہ اپنی حیثیت کے مطابق رکھ جاتے تھے۔ غریب جانے اپنی کن ضرورتوں کو کاٹ کر یہ پیسہ نکالتے ہوں گے۔ گاؤں پہنچنے پر اسرار بھائی کو ان پیسوں کا شدید طور پر انتظار رہتا تھا۔ یہ نذرانے وہ بہت ہی خوشی خوشی قبول کرتے تھے۔ یہ بات الگ ہے کہ یہاں ان کا حلقہ احباب انھیں کاشتکاروں کے لڑکوں کا تھا اور یہ پیسے اسی حلقہ پر خرچ ہوتے تھے جو باغوں اور کھیتوں میں ان کے پیچھے پیچھے ہوتا تھا۔ کس درخت پر امرود زیادہ ہیں کس پر کم۔ کس باغ کی کچی امبیاں کھٹی ہیں اور کس کی میٹھی اور اسی نوعیت کی دوسری معلومات فراہم کرنے میں ان کی مدد کرتا تھا۔ اپنے اس حلقہ احباب میں انھوں نے کبھی اس کی تمیز نہ کی کہ کون کس ذات پات سے ہے اور کتنا پھٹے حال۔ جتنا چست و چالاک نڈر اور زندہ دل اتنا ہی ان سے قریب۔

گاؤں میں کوریوں، چماروں اور نیچی ذات کے لوگوں کے نہانے کے لیے الگ تالاب تھے۔ ہمارے بڑے چچا کو جو مستقل طور پر اسی گاؤں میں اپنی رہائش اختیار کیے ہوئے تھے اسرار بھائی اکثر ان تالابوں میں غوطہ کھاتے نظر آتے تھے۔ اس کان سنی اس کان اڑائی پرانی عادت تھی۔ سمجھانا بجھانا بے سود تھا۔

یہ تھیں اسرار بھائی کے بچپن کی وہ باتیں جن میں سے زیادہ تر اپنے بزرگوں سے سنی تھیں۔ میری اور ان کی عمر میں جو فاصلہ تھا، اُس کی بنا پر میری طرف اُن کا رویہ محبت بھری سرپرستی کا تھا۔ میری پڑھائی کے سلسلہ میں اُن کا میرے اوپر جو احسان ہے، اسے میں کبھی بھی بھول نہیں سکتی۔ میرے دل پر یہ ایک ایسا نقش ہے جو انمٹ اور انمول ہے۔

بچپن میں میری تمام تر دل چسپی گڑیوں سے ہنڈ کلیوں سے یا خاندان کے ننھے منے بچوں کی دیکھ بھال سے تھی۔ یہ بچے بھی میرے لیے گڈے گڑیا ہی تھے، جاندار سو زیادہ دل چسپ۔ میں پڑھائی لکھائی سے دور بھاگتی تھی۔ مولوی صاحب مجھ سے عاجز اور میں مولوی صاحب سے۔ ان کی آمد پر یا تو میں غائب ہو جاتی تھی یا میرا بغدادی قاعدہ۔ ایک دن میری حرکتوں پر اُن کا پارہ اتنا چڑھا کہ انھوں نے میرے گال پر ایک زناٹے دار چانٹا لگا دیا اور مجھے گھسیٹ کر کھڑا کر کے بولے۔ جاؤ اپنی ماں سے کہہ دو کہ میں تمہیں نہیں پڑھا سکتا۔ ان کا اس وقت کا خوفناک چہرہ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ روتی اور بلکتی ہوئی میں اندر آئی۔ میری ماں خود ان پڑھ تھیں۔ لیکن ہم سب کی پڑھائی میں بہت ہی سخت گیر، بہت ہی دردناک انداز میں بولیں "نہ صورت کی نہ شکل کی پڑھو گی بھی نہیں تو کون پوچھے گا۔" جانے مولوی صاحب کے چانٹے کی چوٹ زیادہ شدید تھی یا ماں کے اس مایوس کُن لہجہ کا، اشارہ تھا محرومی ان زیورات اور لچکے گوٹے لگے اُن ریشمی کپڑوں سے جو اس عمر میں شادی کے ہم معنی تھے۔ اس دور میں ہم لڑکیاں سات آٹھ سال کے ہوئے نہیں کہ تمام آرائشوں سے محروم کر دیے جاتے تھے۔ ڈوپٹہ میں گوٹا لگانا، پیر میں مہندی لگانا ممنوع قرار دے دیا جاتا تھا۔ سرمہ مسّی افشاں تو دور کی باتیں تھیں۔ ان کی بناوٹ اور سجاوٹ کی تمام خواہشیں اُن کی شادی تک ملتوی کر دی جاتی تھیں۔ انکار نہیں کہ اُس وقت اس محرومی کا تصور میرے لیے بہت بھیانک رہا ہو گا۔ غرضیکہ میری گریہ وزاری میں اضافہ ہوتا ہی چلا گیا۔

اسرار بھائی آنگن میں بیٹھے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ اٹھے اور اماں سے بولے یہ کل سے مولوی صاحب کے پاس نہیں جائے گی۔ میں اسے پڑھاؤں گا۔ ہمارے اینڈ حسن کی کوٹھری میں ایک ٹوکری رکھی تھی جس میں پرانے اخبار و رسائل وغیرہ ڈال دیے جاتے تھے۔ اسرار بھائی اس کوٹھری میں گئے اور اس میں سے ایک بادامی سے رنگ کی اردو کی پہلی کتاب نکال لائے اور میری پڑھائی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ لے لی۔ جانے یہ جادو ہم دونوں کے باہمی جذباتی لگاؤ کا تھا یا اُن کے پڑھانے کا ڈھنگ کا۔ میری تو کایا ہی پلٹ گئی اور میں پڑھائی میں چل نکلی۔ اردو انگریزی حساب سب ہی کچھ پڑھانے کی ذمہ داری انھوں نے اپنے سر لے لی اور ایک سال میں، میں اس قابل ہو گئی کہ علی گڑھ گرلس اسکول میں میرا داخلہ تیسری کلاس میں ہو گیا۔ مجھے اب تک وہ موضوع یاد ہیں، جن پر وہ مجھ سے چھوٹے چھوٹے مضامین لکھواتے تھے اور میری ہمت افزائی کی خاطر سب کے سامنے پڑھوا کر سنتے تھے۔ مثلاً "میرا گھر"، "ساون کا مہینہ"، "میری گڑیا" وغیرہ وغیرہ۔ اگر اسرار بھائی نے میری پڑھائی کی ذمہ داری اپنے سر نہ

لی ہوتی تو میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ میں بھی خاندان کی اپنی ہم عمر دوسری لڑکیوں کی طرح گھر کی چہار دیواریوں کو اپنی حد اور چولہے چکی کو اپنا مقدر سمجھتے ہوئے گھٹی ہوئی زندگی گزار رہی ہوتی۔

کبھی کبھی اب بھی مجھے کھٹک ہوتی ہے کہ جس بھائی کا میری پڑھائی میں اتنا اہم رول رہا۔ اُس کی ایک چھوٹی سی خواہش میں پوری نہ کر سکی۔ ایم۔ اے کرنے میں لکھنؤ سے علی گڑھ آئی اور مجھے پتا چلا کہ ڈیپارٹمنٹ کی جغرافیائی مقامیت کی وجہ سے مجھے اپنے پسندیدہ مضمون تاریخ سے محروم رہنا پڑے گا۔ ڈیپارٹمنٹ کی عمارت ایس۔ ایس۔ ہال کے ہوسٹل کے وسط میں تھی۔ سو اس میں کوئی ایسا عقبی دروازہ نہ تھا کہ لڑکیاں صنفِ مخالف کی بد نگاہی سے محفوظ رہ کر اس میں داخل ہو سکیں۔ اسرار بھائی کی خواہش ہوئی کہ میں اردو میں داخلہ لے لوں۔ شاید میرے بچپن میں لکھے ہوئے مضامین سے میری صلاحیتوں کے سلسلہ میں انھیں کچھ زیادہ ہی خوش فہمی پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ ادب خواہ اردو کا ہو یا انگریزی کا میرے بس کا روگ نہیں۔ سو میں نے ان کا مشورہ رد کر دیا اور اقتصادیات کا انتخاب کیا۔ شاید اچھا ہی ہوا۔ کون جانے دباؤ میں آکر میں نے اردو میں داخلہ لے لیا ہوتا اور نالائق و انتہائی بدذوق ثابت ہوتی، انھیں شرمندگی ہی اٹھانی پڑتی۔

اسرار بھائی سے دو سال چھوٹے تھے انصار بھائی اور انصار بھائی سے پونے دو سال چھوٹی تھیں صفیہ آپا۔ سچ پوچھیے یہ تین تھے اوپر تلے کے۔ ان دونوں سے اسرار بھائی کا جو ربط تعلق تھا وہ اس سے بہت مختلف تھا، جو ان کا بڑی بہن اور میرے ساتھ تھا۔ آپا کی طرف وہ ادب و لحاظ کا رشتہ رکھتے تھے اور میری طرف محبت و سرپرستی کا۔ برعکس اس کے تینوں اوپر تلے کے بھائی بہنوں میں یگانیت بھی تھی اور مخالفت بھی۔ کبھی بے طرح قربت اور کبھی بے طرح دوری۔ لڑائی جھگڑے بھی اور دوستی بھی۔ غرضیکہ اپنائیت بھی بیگانیت بھی۔ اس رشتہ کی نوعیت کو محبت و نفرت کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اسرار بھائی سے نفرت کرنا تو کسی دور میں کسی کے لیے ممکن نہ ہوا۔

میرے لیے ان دونوں بھائیوں میں جو قدر مشترک تھی وہ باپ کی طبیعت کی نیکی اور شرافت تھی ورنہ بظاہر رجحانات اور دلچسپیوں کے لحاظ سے وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ اسرار بھائی کے لیے ایک منٹ نچلا بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ وہ اچھل کود اور الہڑ دھتّے کے قائل۔ خواہ گلی ڈنڈا ہو یا کبڈی، فٹ بال ہو یا ہاکی، ہائی جمپ ہو یا لونگ جمپ، مہارت کے خواہاں۔ دوسری طرف انصار بھائی کی دلچسپی باتیں بنانے اور باتیں سننے سے کرید کرید کر سوالات

کرنے سے۔ بڑوں سے اور بزرگوں کی گفتگو میں شریک ہونے سے۔ یہی تھے اُن کی طبیعت کے وہ رجحانات، جنھوں نے آگے بڑھ کر سماجی اور سیاسی شعور کی صورت اختیار کی۔ سنتے ہیں کہ چار پانچ سال کے تھے۔ میلاد کے خاتمے پر کھڑے ہو کر اپنی تقریر بازی سے بڑی بوڑھیوں کے لیے لطف کا سامان مہیا کرتے تھے۔

اکثر ہوتا آیا ہے کہ چھوٹا بڑے کی نقل کرنا اور اس کا جیسا بننا اپنے لیے لازمی سمجھتا ہے۔ سو انصار بھائی بھی کسی میدان میں اسرار بھائی سے پیچھے رہنا عزت کے خلاف سمجھتے تھے۔ لیکن ہوتا یہ تھا کہ اگر پتنگ بازی ہے تو منٹوں میں اسرار بھائی کی پتنگ آسمان کی چھوتی نظر آتی تھی اور انصار بھائی ڈور کو جھٹکے دیتے رہ جاتے تھے اور پتنگ غریب زمین پر سر پٹختی نظر آتی تھی۔ اگر آنگن میں چارپائی کھڑی کر کے ہائی جمپ کا مسئلہ ہوتا تو بڑے بھائی کے جمپ کی اونچائی بڑھتی چلی جاتی اور چھوٹے بھائی ہانپتے کانپتے چارپائی تک پہنچتے اور رُک جاتے۔ بے عزتی کا احساس ہاتھ لگتا اور ساتھ ہی بڑے بھائی کے طنز اور قہقہے۔ غرضیکہ اکثر اوقات ان کھیلوں کا خاتمہ کھسیاہٹ اور دھینگا مشتی پر ہوتا۔ میں بہت چھوٹی تھی۔ لیکن ایک دفعہ کا واقعہ مجھے بھی یاد ہے۔ انصار بھائی کچھ اس بری طرح کھسیا گئے تھے کہ بڑے بھائی سے اس طرح چمٹ گئے کہ چھٹائے نہ چھوٹیں۔ چہرہ سرخ اور آنکھوں میں آنسو اور کچھ بس نہ چلا تو اسرار بھائی کی قمیض دانتوں سے تار تار کر دی۔ ایسی صورتوں میں ہوتا یہ تھا کہ خفت کے ساتھ ماں کی ڈانٹ بھی ان غریب کے ہاتھ لگتی تھی۔

بڑے ہونے پر دونوں بھائیوں کے درمیانی تعلقات نے ایک خوش گوار کی صورت اختیار کر لی تھی۔ دونوں کو ایک دوسرے کی صلاحیتوں اور اہلیتوں کا احساس ہو گیا تھا اور ان کی قدر دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ بظاہر دونوں کے راستے تو الگ الگ تھے۔ ایک کا میدان شعر و شاعری آرٹ و ادب، دوسرے کا سماجی مسائل اور سیاسی گتھیاں۔ لیکن شعور و فکر میں بنیادی یگانیت تھی۔ اس لیے راستوں میں ٹکراؤ کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اگر ایک نے عملی طور پر جنگ آزادی میں حصہ لیا، اجارہ داری کے خلاف آواز اٹھائی تو دوسرے نے اپنے قلم سے انھیں مقاصد کو انجام دیا۔

ان دونوں کا حلقہ احباب بھی تقریباً ایک ہی تھا۔ نوجوانوں کا وہ گروہ جو فرسودہ نظام کی جڑیں اکھیڑنے اور نئے نظام کو وجود میں لانے پر کمر بستہ تھا۔ کوئی اس کاوش میں قلم سے کام لے رہا تھا تو کوئی عمل سے۔ کوئی ادب برائے ادب کے خلاف ادب برائے زندگی کی چھان بین اور بحث مباحثوں میں مبتلا تو کوئی برطانوی حکومت کے خلاف جلسہ اور جلوسوں میں شریک اور

جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانے پر کمر بستہ۔

یہ دوست اکثر و بیشتر شام کو ہمارے گھر اکٹھا ہوتے تھے۔ شام کی چائے کے ساتھ گھر کے بنے ہوئے نمک پارے گرما گرم سوجی کا حلوہ اور کبھی کبھی قیمہ بھرے سموسے مل جاتے تھے اور ان کی پاکٹ منی بھی محفوظ رہتی تھی۔ پھر گرلس کالج اور عبداللہ لاج کا قرب تھا، تصورِ جاناں کو بھی تسکین پہنچتی تھی۔ اس وقت عبداللہ لاج ایک پرستان کی حیثیت رکھتا تھا۔ عبداللہ سسٹرس حسین بھی تھیں اور بے نقاب بھی، سماجی اور معاشرتی مسائل سے دل چسپی کے بہانے ان نوجوانوں میں سے اکثر کی رسائی بھی آسان تھی۔

اسرار بھائی اور انصار بھائی میں گو کہ ذہنی یگانگت تھی اور ایک دوسرے سے قرب و محبت لیکن جہاں تک میرا قیاس ہے اس قسم کی دوستی اور بے تکلفی نہ تھی جو عمر کے اتنے کم فاصلے کے بہن بھائیوں میں ہونی چاہیے۔ اس نوعیت کا قرب نہ تھا کہ وہ اپنے رومانس اور عشق کے مسائل میں ایک دوسرے کے شریک ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ اس قسم کی دوستی اسرار بھائی کی بھائی اختر[1] اور جذبی بھائی سے تھی اور انصار بھائی کی باچھو[2] بھائی جان سے۔

صفیہ آپا اسرار بھائی سے پونے چار سال چھوٹی تھیں۔ لیکن رجحان اور دل چسپیوں کے لحاظ سے اُن سے بہت ہی قریب۔ ادب و لٹریچر سے لگاؤ، شعر و شاعری سے دل چسپی۔ اُن کے خطوط کے مجموعے "زیرِ لب" اور "حرف آشنا" ان کی ادبی صلاحیتوں کی عکاسی کے لیے کافی ہیں۔ انھیں فکر و بصیرت کی جو گہرائی اور زبان پر جو قدرت پائی جاتی ہے، اس نے ان کو ادبی دنیا میں ایک امتیازی حیثیت دے رکھی ہے۔ ان خطوط کا تاثر پڑھنے والوں کی دل کی گہرائیوں کو چھو لیتا ہے۔

بچپن ہی سے صفیہ آپا کا محبوب ترین مشغلہ تھا کتب بینی کوئی کتاب کوئی رسالہ ہاتھ لگا اور وہ کسی کونے میں چھپ گئیں۔ انتہائی ذہین تھیں اور ساتھ ہی ساتھ محنت اور ریاضت کی قائل تھیں۔ اگر اُن کی اس خصوصیت میں اسرار بھائی کی شرکت ہوتی تو اسرار بھائی کی زندگی کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔ ان کی طبیعت میں تو کچھ ایسا سیمابی پن تھا کہ دل لگا کر محنت کرنا ان کے بس کا روگ ہی نہ تھا۔ ان کی فطرت میں تساہلی بھی تھی، محنت و مشقت سے دور رہنے کا رجحان تھا۔ اس رجحان میں یقیناً اس لاڈ و پیار کا بھی ہاتھ تھا جس میں وہ پالے گئے تھے۔

---

[1] جاں نثار اختر

[2] خواجہ احمد عباس

گھر والوں اور کنبہ والوں کے لیے جو اہمیت اسرار بھائی کی تھی۔ اس کا مقابلہ انصار بھائی نہیں کر سکتے تھے تو بے چاری صفیہ آپا کس گنتی میں۔ ایک تو وہ لڑکی تھیں اور اس ماحول کی پیداوار جس میں اگر لڑکی لڑکے سے برابری کا خواب بھی دیکھے تو گناہ۔ جس میں اس کا بچپن بہت ہی مختصر۔ لڑکی چھ سات سال کی ہوئی نہیں کہ روک ٹوک کا سلسلہ شروع۔ ہنسی پر روک اونچی آواز پر ٹوک۔ کپڑے لتوں پر پابندیاں۔ کھیل کود پر بندش۔ غرض یہ کہ بیٹے بیٹیوں کی تربیت کے معیار ہی الگ تھے۔ بیٹا گھر والوں کی مہیا کردہ تمام سہولتوں کا بلا حیل و حجت حقدار بیٹی ان سہولتوں کی فراہمی کی ذمہ دار۔ صفیہ آپا کا مسئلہ یہ تھا کہ انھیں سلائی، کڑھائی اور گھرداری کے مشاغل سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔ کتب بینی چھوڑ اگر کسی تفریحی مشغلے کی طرف ان کا دل جاتا تھا تو یہ کشش انہیں اسرار بھائی کے حلقۂ احباب کی طرف کھینچتی تھی اور اس سلسلہ میں ان پر شدید پابندیاں تھیں اور کڑی نگاہ رکھی جاتی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ ماں باپ تعلیم نسواں کے قائل تھے اور وہ بے طرح ذہین۔ پڑھائی کے میدان میں آگے بڑھتی رہیں اور جیسا کہ ہمارے ابا اماں سے کہتے رہتے تھے۔ دیکھنا یہ لڑکی تمہارے لڑکوں سے آگے رہے گی، وہ اپنی محنت اور ذہانت کے بل بوتے امتحانوں میں فرسٹ پوزیشن لاتی رہیں۔ صورت حال یہ تھی کہ لڑکوں سے برتری کا دعویٰ تو الگ رہا، برابری کا اظہار خلافِ تہذیب تھا۔ اس ناانصافی کے خلاف اندر اندر کھولتی تھیں اور غبار نکلتا تھا مجھ پر یا بھائیوں کے ساتھ بحث و مباحثہ کی صورت میں۔ اگر اس نوعیت کے لڑائی جھگڑے حد کو پار کرنے لگتے تو اُن پر ڈانٹ پڑتی۔ اسرار بھائی سے رجحان اور مذاق کی ہم آہنگی تھی۔ اس لیے اکثر ٹکراؤ بھی انھیں سے ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے اماں کبھی کبھی عاجز آکر ان دونوں کی بول چال بند کروا دیتی تھیں۔ پر دو چار دنوں بعد غبار چھٹ جاتا تھا اور پھر وہی قربت پیدا ہو جاتی تھی۔

صفیہ آپا کے دل میں اسرار بھائی کی کتنی قدر اور کتنی محبت تھی، اس کا اندازہ بھائی اختر کے نام ۱۹؍ مئی ۱۹۴۰ء میں لکھے ہوئے ایک خط کے اس اقتباس سے کیا جا سکتا ہے۔ اسرار بھائی پر نروس بریک ڈاؤن کا دورہ پڑا ہوا تھا اور وہ دلی کی سڑکوں پر دیوانہ وار بھٹک رہے تھے۔ ''اختر میں جانتی ہوں تم اپنے معاملات میں چھوٹے چھوٹے کاموں میں دوسروں کے محتاج رہتے ہو، پھر بھی جب تم اس تباہی کو شدت سے محسوس کر رہے ہو تو جو کچھ کر سکتے ہو، اس میں دریغ نہیں کرو گے۔ میں آج ہی ایک تار دلواؤں گی (فیصلہ نہیں کر پائی ہوں کس پتے پر!) اور ایک لاہور اماں کی شدید علالت کا مناسب سمجھو تو تم بھی ساحر کو خط لکھو جواب طلب یا تار دو۔ یہی کہ اماں سخت علیل ہیں۔ اسرار بھائی کو تلاش کر کے بھیج دیں۔ میری عقل کام

نہیں کر رہی ہے۔ سینکڑوں باتوں کا جی چاہتا ہے۔ عمل میں لانے کے امکانات نظر نہیں آتے۔ اگر میرا دماغ یوں ہی متاثر رہا تو بچ جانو بچوں کو تنہا چھوڑ نکل کھڑی ہوں گی۔ بچے تو مجھے دوبارہ مل جائیں گے، ایسے بھائی کو کھو کر دوبارہ کہاں پاؤں گی۔" خط کے یہ آخری جملے اسرار بھائی کے ساتھ صفیہ کے جذباتی لگاؤ کی شدت کی عکاسی کے لیے کافی ہیں۔ عمر میں پختگی آنے کے بعد ان دونوں میں میرا خیال ہے کہ اس نوعیت کی دوستی اور بے تکلفی کا رشتہ پیدا ہو گیا تھا، جس کی کمی دونوں بھائیوں کے باہمی رشتہ میں تھی۔ ہر موقعہ پر ایک دوسرے کے مشیر کار اور مددگار۔

صفیہ آپا غریب ایک اور مصیبت کا شکار تھیں۔ لڑکیاں پندرہ سولہ سال کی ہو جائیں اور اُن کی شادی نہ ہو تو ماؤں کی راتوں کی نیندیں حرام ہو جاتی تھیں۔ سولہ سال سے آگے عمر بڑھی تو گویا قیامت ہی ٹوٹ پڑی۔ ماں باپ کی فکریں تو الگ رہیں۔ بظاہر بہی خواہ عزیز رشتہ داروں کے طنز آمیز صلاح مشورہ اذیت ناک صورت اختیار کر لیتے تھے۔ "بی بی کیا لڑکی کو ساری عمر گھر بٹھا کے رکھو گی۔ ایسی پڑھائی سے کیا حاصل، اس کی کمائی کھانا ہے وغیرہ وغیرہ۔" ویسے صفیہ آپا ناک نقشہ کی بہت تیکھی تھیں اور چہرہ پر ذہانت کی بے طرح چمک، لیکن رنگ بھر پیٹ سانولا تھا سیاہی کی طرف مائل۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ از حد ذہانت اور پڑھائی میں لڑکوں پر بازی لے جانے کی خصوصیت ان کی شادی کی راہ میں حائل ہو رہی ہو۔ آج بھی مرد خواہ کتنا آزاد خیال ہو۔ بیوی کی ذہنی برتری قبول کرنے سے پس و پیش کرتا ہے۔ بہر حال صفیہ آپا کی عمر بڑھ رہی تھی اور ماں باپ کی پریشانیوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کوئی بھی الٹا سیدھا پیام آتا، ماں کی بے چینی بڑھ جاتی۔ تفتیش اور تحقیق میں لگ جاتیں۔ ایسے موقع پر اسرار بھائی آڑے آتے اور اپنے دھیمے انداز میں ماں کو رشتہ کی ناموزونیت کا احساس دلاتے اور صفیہ آپا اطمینان کا سانس لیتیں۔ بھائی اختر کا پیام آیا۔ ماں تو بیٹی کی شادی کے لیے بے چین تھیں ہی، باپ نے بھی رشتہ کو مناسب سمجھا۔ سید خاندان کا لڑکا تعلیم یافتہ برسر روزگار، کالج کا لیکچرر اور کیا چاہیے۔ شاعر تھا تو کیا ہوا۔ اسرار بھائی سے مزاج اور طبیعت کے متعلق مشورہ لیا گیا۔ آج بھی دار السراج کے برآمدے میں ان کا ٹہلنا اور دھیمے دھیمے انداز میں ماں کے سوالوں کا جواب دینا مجھے یاد ہے۔ اسی گفتگو کے دوران انھوں نے صفیہ آپا سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔ "سوچ لو مزاج بہت جناتی ہے"۔ مجھے یقین ہے کہ بھائی اختر کے قریبی دوست ہونے کے ناطے انھیں اپنے دوست کی زندگی کی پیچیدگیوں اور فاطمہ بہن سے اُن کے اس قریبی تعلق کا علم رہا ہو گا، جس کے متعلق ان کے اپنے خاندان میں طرح طرح کی

افواہیں تھیں اور اس سلسلہ میں ان کی صفیہ آپا سے بات چیت ہو چکی تھی۔ انھیں معلوم تھا کہ ان سب حالات کو جانتے ہوئے بھی اُن کی بہن اپنا دل اُن کے دوست کی نظر کر چکی ہے۔ سو وہ چاہتے تھے کہ ان باتوں کی ہوا ابھی ماں باپ تک نہ پہنچے۔ جانتے تھے کہ ماں باپ جوان بیٹی کی شادی کے سلسلہ میں کتنے ہی فکر مند کیوں نہ ہوں۔ بقول بھائی اختر کی ایک رشتہ کی بہن کے زندہ مکھی نگلنے پر آمادہ نہیں ہو سکیں گے اور رشتہ سے انکار کی صورت میں صفیہ کے دل پر شدید چوٹ لگے گی۔ بس وہ اتنا ہی چاہتے تھے کہ بہن کو اس سخت و پیچیدہ راستہ سے آگاہ کرتے رہیں، جس کا وہ خوشی خوشی انتخاب کر رہی تھی۔

ایک چھوٹا سا واقعہ میری اپنی شادی سے متعلق ہے جس کا ذکر نامناسب نہیں۔ میری نظر میں اس دور کی روایات اور اقدار کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ واقعہ اسرار بھائی کی شخصیت کے ایک بہت ہی خوب صورت اور قابل قدر پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ علی گڑھ میں سالم اور میں دونوں ہی ایک ہی کلاس اور ایک ہی ڈیپارٹمنٹ میں تھے۔ کلاس میں ایک پردہ پڑا ہوا تھا۔ بلڈنگ کے عقبی دروازہ سے داخل ہو کر پردہ کے ایک طرف میں ہوتی تھی اور دوسری طرف اُستاد اور تمام لڑکے۔ لڑکیوں کا لائبریری میں قدم رکھنا تو الگ تھا۔ ڈیپارٹمنٹ کی سمینار لائبریری سے استفادہ کے لیے اپنے چپراسی کا احسان مند ہونا پڑتا تھا۔ "بی بی اس وقت کوئی لڑکا نہیں ہے۔ جلدی سے کتابیں دیکھ لیجیے۔" ہم اس جملے کے منتظر رہتے تھے۔ ماں کی طرف سے ہمارے لیے لکھنؤ اور ردولی میں پردہ کی پابندی لازمی تھی۔ علی گڑھ میں ہم قدرے آزاد تھے۔ میرے ساتھیوں میں اچھے اور سنجیدہ اسٹوڈنٹس میں سالم اور حمزہ علوی تھے۔ ان دونوں کو میری کسمپرسی پر ہمدردی تھی اور انھیں کے ذریعے میرے پاس ضروری کتابیں اور رسائل پہنچتے رہتے تھے۔ محمود صاحب کے گھر میری ان سے ملاقاتیں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ وقت گزرنے کے بعد میں لکھنؤ آ گئی اور کرامت حسین گرلز کالج میں پڑھانے لگی۔ سالم جرنلزم کی لائن اختیار کر کے دلی چلے گئے۔ اپنے وطن اعظم گڑھ جاتے ہوئے وہ لکھنؤ رُکتے اور مجھ سے ملنے آتے۔ اگر میرے گھر کوئی رشتہ دار یا ردولی کا باشندہ مہمان ہوتا تو سالم کو انصار بھائی یا اسرار بھائی سے ملاقات پر اکتفا کرنا پڑتا۔ سالم میری مجبوری سمجھتے تھے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے ماں باپ کو میری طرف سے کوئی دکھ پہنچے۔

ایک دفعہ سالم آئے اور اُن سے ملنے اسرار بھائی کے کمرہ میں گئی۔ اس ملاقات کے دوران سالم نے میرے ہاتھ ایک رقعہ تھمایا اور اصرار کیا۔ میں اسے پڑھوں۔ اس خط میں ان کے جذباتی لگاؤ کا اظہار تھا اور مجھ سے شادی کی خواہش کا۔ اتنے میں کمرے میں ایکا ایکی اسرار بھائی

داخل ہوئے۔ میں کچھ ایسی بوکھلائی کہ رقعہ اسی کمرہ میں چھوٹ گیا۔ رات بھر اس فکر میں نیند نہ آئی کہ رقعہ بڑے بھائی کے ہاتھ پڑے گا، کیسی رُسوائی ہوگی۔ صبح کو اسرار بھائی کے جانے کے بعد میں نے اس کمرہ کا کونہ کونہ چھان مارا۔ اس رقعہ کا نشان نہ ملنا تھا نہ ملا۔ البتہ کھڑکی کی کارنس پر جلے ہوئے کاغذ کی راکھ ضرور نظر آئی۔ میرے اعلیٰ ظرف بھائی نے اشارتاً مجھ پر اس کا اظہار نہیں کیا کہ میرے نام کا محبت نامہ ان کے ہاتھ لگا تھا۔ البتہ محمود صاحب کے ذریعہ میرے لیے جب سالم کا پیام آیا تو انھوں نے اور صفیہ آپا نے پُرزور حمایت کی اور ماں باپ کو کسی قسم کی تحقیق و تفتیش سے باز رکھا۔ دوسروں کے احساسات کا اس حد تک لحاظ کرنے والی شخصیت خود چوٹیں کھاتی رہی۔ واہ ری قسمت!

یہ تھا ہمارے سات افراد کا خاندان۔ ماں باپ، پانچ بھائی بہن اور ان کے آپسی رشتہ۔ اس خاندان کا تعلق تھا متوسط درجہ کے روایت پرست طبقہ سے۔ اسرار بھائی نے جس فضا میں آنکھ کھولی، اُس میں زمیندارانہ اور جاگیردارانہ نظام کی کھیتی لہلہا ضرور رہی تھی۔ لیکن اُس کی جڑیں خشکی اور کمزوری کی طرف مائل ہو چکی تھیں۔ قدیم اور جدید اقدار کا تصادم تھا۔ ایک کا جھکاؤ تھا اور دوسرے کا اُبھار۔ ہمارے ماں باپ اُن لوگوں میں سے تھے جو نئی اقدار کو اپنانا بھی چاہ رہے تھے پر پرانی اقدار سے یکسر بے نیاز بھی نہیں ہونا چاہتے تھے۔ سو اُن کے قدم سہم سہم اور تھم تھم کر اٹھ رہے تھے۔

جہاں تک میری یادداشت کام دیتی ہے۔ ابتدا میں ہمارے گھر میں خاصی خوشحالی تھی۔ زمین جائداد کی آمدنی اور ساتھ ہی ساتھ سرکاری نوکری کی تنخواہ۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس خوشحالی پر افسردگی کا ہلکا سا سایہ بھی تھا۔ گھر کی فضا میں وہ چونچالی نہ تھی جو ان حالات میں ہونی چاہیے تھی۔ اس کی وجہ تھی اسرار بھائی سے بڑی ایک جوان اولاد کی موت جس نے میری ماں سے اُن کی خوش دلی اور ہونٹوں کی مسکراہٹ چھین لی تھی اور جس نے باپ کی خاموشی اور سنجیدگی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ سوچتی ہوں کہ خوشی اور غم کی یہ ملی جلی فضا ہم سب کی اُٹھان کے لیے مفید ہی ثابت ہوئی۔ بچپن سے غیر شعوری طور پر ہم زندگی کے ان دونوں رُخوں سے واقف ہوتے رہے۔ اسرار بھائی کی حساس طبیعت پر اس فضا کی زیادہ ہی گہری چھاپ پڑی ہوگی۔

دھیرے دھیرے ہمارے گھر کی خوشحالی میں کمی ہوتی گئی۔ واقعات نے کچھ ایسا رُخ اختیار کیا کہ گھر کی فضا میں افسردگی کا اضافہ ہوتا گیا۔ تفصیلات آگے آئیں گی۔ یہاں میں بغیر کسی

جھجک کے یہ ضرور کہوں گی کہ ہمارے گھر کی فضا کی بنیادی صحت مندی کسی وقت بھی خطرہ میں نہیں پڑی اور اُس کی وجہ تھی ہمارے ماں باپ کا آپس کا سمجھوتہ۔ ہزار ہا باتوں پر اختلاف رائے ہوا ہوگا۔ ہم میں سے کسی نے ان کو ایک دوسرے پر غصہ کرتے ایک دوسرے پر چیختے چلاتے نہ سنا۔ کبھی ایک جھکتا تو کبھی دوسرا اور توازن قائم رہتا۔ اُن کی شخصیتوں کی وہ خصوصیات جو اختلافات اور ٹکراؤ کا باعث بنتی۔ ایک دوسرے کی کمی اور کمزوریوں کو پورا کرتی تھیں۔ ان دونوں کو اس کا احساس تھا اور یہی احساس ان دونوں کی آپس کی محبت اور عزت میں اضافہ کرتا رہا۔ دونوں نے مل کر بیٹیوں کے مستقبل کے سنہرے خواب دیکھے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے بکھرنے کے دکھ بھی سہے۔ سو یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اسرار بھائی جس گھر میں پیدا ہوئے اور پرورش پائی۔ اُس کی فضا میں محبت تھی خلوص تھا، ہم آہنگی تھی۔

اسرار بھائی کی پیدائش تو ردولی میں ہوئی لیکن باپ کی ملازمت لکھنؤ کی تھی۔ اس لیے سال کا کچھ حصہ ردولی میں گزرتا تھا اور کچھ لکھنؤ میں۔ چھوٹے تھے تو دونوں بھائیوں کا نام ردولی مخدومیہ اسکول میں لکھوادیا گیا تھا، سو گرمی کی چھٹیاں گزارنے لکھنؤ آتے۔ ذرا بڑے ہوئے تو بہتر تعلیم کی خاطر باپ نے انھیں لکھنؤ بلوالیا۔ ساتھ ہی ساتھ ماں کو بھی آنا پڑا۔ لیکن نام کافی عرصہ تک مخدومیہ اسکول کے رجسٹر پر چڑھا رہا۔ کچھ مواقع ایسے ہوتے تھے کہ اسکول میں چھٹی ہو یا نہ ہو، میری ماں کی ردولی میں موجودگی ضروری ہوتی تھی۔ بیٹے بھی ساتھ آجاتے تھے اور ان دونوں مخدومیہ اسکول بھیج دیے جاتے تھے۔ آج کی طرح حاضری واضری کی زیادہ پابندی نہ تھی۔

لکھنؤ تو تھا ہی تہذیب کا گہوارہ اپنے آداب اپنے طور طریق کے لحاظ سے اپنی زبان و شعر و شاعری کے لحاظ سے۔ لیکن قصبہ ردولی بھی کچھ ایسی خصوصیات رکھتا تھا کہ خطہ اودھ میں اس کی ایک امتیازی جگہ تھی۔ یہ اپنے مزاروں، زیارت گاہوں، عرس و میلوں کی وجہ سے آس پاس کی آبادی کے لیے ایک خاص کشش رکھتا تھا۔ اس کی جائے وقوع لکھنؤ اور فیض آباد کے درمیان ہے اور یہ دونوں ہی شہر اپنے اپنے وقتوں میں نوابانِ اودھ کے مسکن تھے۔ سو اُن کے رہن سہن کی چھاپ ردولی کی تہذیب پر پڑنی ناگزیر تھی۔ غرضیکہ یہاں کے ماحول کو نہ ہی شہری کہا جاسکتا تھا اور نہ ہی دیہی۔ اس میں صوفیانہ اور جاگیردارانہ تہذیب کا ایک خوب صورت اور نازک امتزاج تھا۔

اسرار بھائی کی شخصیت اور کلام کے سلسلہ میں اکثر لوگوں نے ان پر لکھنؤ اور ردولی کی تہذیب

کے اثرات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سو بے جا نہ ہو گا اگر میں ان جگہوں سے متعلق اپنے بچپن کی جو یادیں ہیں وہ آپ کے سامنے رکھوں:-

ردولی میں ایک بہت ہی مانے ہوئے عالم و فاضل بزرگ حضرت مخدوم شیخ العالم شیخ احمد عبدالحق کا مزار ہے، جن کا عرس جمادی الثانی میں بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے اور بلا تفریق مذہب و ملت قرب و جوار کے سارے ہی لوگ اس میں شریک ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ مجمع میں عقیدت مندوں پر تماشہ بینوں کی تعداد حاوی ہوتی جا رہی ہے اور اس عرس کی نوعیت ایک بڑے میلے کی سی ہو گئی ہے۔

ردولی کے ہر گھر میں مہینوں پہلے سے اس عرس کی تیاریاں شروع ہو جایا کرتی تھیں۔ آس پاس کے مضافات اور گاؤں میں رہنے والے عزیز و اقربا دوست و احباب عرس میں شرکت کے لیے ردولی منتقل ہو جایا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں مہمان داری کچھ ایسی مشکل بھی نہ تھی۔ میزبان اور مہمان میں تکلف سے زیادہ یگانگت کا تعلق ہوتا تھا۔ آخر کو تھے اپنے ہی کوئی غیر نہیں۔ اگر کام بڑھتا تھا تو کام کرنے والے ہاتھوں میں بھی اضافہ ہوتا تھا۔ گھی، تیل، غلّہ کی فراوانی تھی۔ گاؤں سے سبزیوں، دودھ دہی کی رسد بڑھ جاتی تھی۔ گوشت کے لیے دو چار بکرے بکریاں بھی پہنچ جاتی تھیں۔ اگر کسی پر اس میزبانی کا دباؤ پڑتا تھا، وہ غریب کاشتکاروں پر زمینداروں کو صرف حکم دینے کی زحمت اُٹھانی پڑتی تھی۔

میرے بچپن میں یہ عرس زیادہ تر جاڑوں میں پڑتا تھا۔ موسم سرد ہو تو دالان و سہ دریوں میں چارپائیوں کی تعداد بڑھ جاتی تھی۔ ورنہ گھر کے آنگن میں ہر گھر میں بڑے بڑے تقریباً کوٹھریوں کے سائز کے لکڑی کے صندوق ہوا کرتے تھے، جن میں لحاف گدّے رضائیاں اور دریاں بھری ہوئی تھیں جو ایسے موقعوں پر کام آتی تھیں۔ اسرار بھائی انصار بھائی اور ان کے ساتھ لگے ہوئے لڑکوں کی ذمہ داری تھی کہ بروقت ضرورت اُن کو صندوق سے برآمد کریں۔ انصار بھائی عام طور پر ٹال مٹول کرتے تھے اور کچھ دیر بعد کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ادھر ادھر ہو جاتے تھے۔ اسرار بھائی اس ذمہ داری کو تفریح میں ڈھال لینے کا گر جانتے تھے۔ صندوق کے اندر کودنے اور اچھلنے میں انھیں مزا آتا تھا۔ اکثر جان بوجھ کر شرارتیں کرتے۔ مانگی جاتی رضائی پھینکتے، دری۔ غرض کہ وہ نہایت ہی ذوق و شوق کے ساتھ اس ذمہ داری کو اپنے سر لیتے۔ ان کا ساتھی ملازم شرفو بھی ان کے ساتھ آگے آگے ہوتا۔

عرس کے دوران ہر رات درگاہ شریف میں قوالی کی محفل جمتی۔ دور دور سے قوالوں کی

ٹولیاں آتیں۔ ہر ٹولی کے لیے ایک تاریخ متعین تھی، جس میں سالہاسال سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ گھر کے مرد اور لڑکے کھانے پینے سے فراغت کے بعد درگاہ جاتے اور لڑکیاں بھی اپنے کو چادروں یا ہلکی دُلائیوں میں لپیٹ کر درگاہ پہنچتیں۔ اُن کے لیے ایک خاص حصہ مخصوص تھا۔ محفل برخاست ہونے سے کچھ پہلے ہی وہ گھر واپس ہو لیتیں۔ پردہ کے سلسلہ میں اس وقت اُن کے لیے اسی قسم کی پابندیاں عائد تھیں۔ آگے چل کر برقعوں نے ان چادروں کی بطور فیشن جگہ لی۔

عرس کے ان چند دنوں اسرار بھائی کو قابو میں رکھنا دشوار ہی نہیں ناممکن تھا۔ درگاہ تک پہنچنے کی سڑک کے دو طرفہ دوکانیں لگی ہوتی تھیں۔ انواع اقسام کی رنگ برنگی چیزوں کی یہ چھوٹی چھوٹی دوکانیں اس زمانے میں بہت ہی اہمیت اور جاذبیت رکھتی تھیں۔ عرس کے خاتمہ سے چند دن پہلے فیض آباد سے ایک بیوپاری کی دکان آتی تھی۔ اُس کی دکان پر ربر کے کھلونے، رنگ برنگی چوڑیاں، لال ہری صابن کی ٹکیاں وغیرہ ہوتی تھیں جو ہم بچوں کے لیے تو بالکل عجوبہ تھیں۔ سب کو اُس کی دوکان کا انتظار رہتا تھا۔ صاف رنگت کا موٹا چھوٹا سا دوکاندار تھا۔ اُس کی آواز "بھولا بیوپاری آگیا" جیسے آج بھی کانوں میں گونج جاتی ہو۔ اسرار بھائی دن تو اس سڑک پر گزارنا چاہتے تھے اور رات درگاہ شریف میں۔ ایک بہت ہی پرانے ملازم تھے جسم کے دبلے پتلے رنگت سیاہ، قد چھوٹا ٹھوڑی پر بکرے نما ڈاڑھی، نام غلامی۔ ان کے سپرد یہ ذمہ داری تھی کہ اسرار بھائی کے ساتھ سایہ کی طرح رہیں۔ ان دنوں غریب کی روتے جھینکتے ہی گزرتی تھی اور ہر وقت یہ دکھڑا رہتا تھا "جگو مورے بس میں نہیں آوت ہیں۔ اُن کے ساتھ ہمکا نہ بھیجا کرو۔ انسو کہنا سنلیت ہیں۔"

قوالیوں کی محفلوں کے بعد واپسی پر اگر سڑک پر لڑکوں کا مجمع نہیں ہوتا تھا تو ہم لڑکیوں کو بھی اپنی بزرگ بیویوں کی نگرانی میں چند دکانوں پر رک کر اپنے وقت کی نایاب چیزوں کا دیدار حاصل ہو جاتا تھا۔ ورنہ ہماری خواہشوں کی تکمیل کی ذمہ داری بھائیوں پر تھی۔ عرس اور میلوں کے موقعہ پر ہم سب کے ہاتھ میں کچھ پیسہ دیے جاتے تھے۔ انصار بھائی اپنا حساب کتاب چوکھا رکھتے تھے۔ اسرار بھائی اس معاملہ میں کچے تھے۔ جوش میں آگئے تو اپنا پیسہ ہم پر خرچ کر دیا اور اگر اپنا دل کسی چیز پر آگیا تو ہمارے پیسہ بھی ہڑپ کر گئے۔

قوالی کی محفلیں بزرگوں کے لیے ایک عبادت کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اور یہ قوالیاں نعتیہ اور حمدیہ نوعیت کی ہوتی تھیں۔ دل پر اثر کرنے والی اب تو ان قوالیوں کے لیے کان ترستے ہیں۔

ان پر بھی فلمی رنگ چھا گیا ہے۔ لیکن اس وقت بھی کم سن نوجوانوں کے لئے ان محفلوں کی کشش تھی سدا سہاگن کا وجد۔ یہ سدا سہاگن ہوتے تو تھے مرد ذات لیکن نئی نویلی دلہن کی طرح سجے دھجے لچکا گوٹا ٹکا ہوا گیروے رنگ کا لباس، ہاتھ میں کھنکھناتی ہوئی لال پیلی چوڑیاں، گلے میں ہار، کان میں بندے اور ناک میں نتھ لیکن ٹھوڑی پر داڑھی۔ ان کو سدا سہاگن یوں کہا جاتا تھا کہ انھوں نے اپنے کو گھر گرہستی بال بچوں کے بکھیڑوں سے بے نیاز رکھ کر اپنی ہستی کو مزار میں دفن بزرگ کے ساتھ وقف کرنے کا تہیہ کرلیا تھا۔ یہ سدا سہاگن قوالیوں کی دھن پر آنکھ بند کیے جھومتے رہتے تھے اور کسی بند پر اللہ ہو اللہ ہو کا نعرہ لگاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے تو قوال اس بند کو دہراتے رہتے اور ان پر وجد کی حالت اس وقت تک طاری رہتی، جب تک کہ وہ پوری طرح بے حال ہو کر فرش پر گر نہ پڑتے۔ اللہ ہی جانے اُن کی اس کیفیت میں کتنی اصلیت ہوتی تھی اور کتنی ایکٹنگ۔ ہر رات اُن کو وجد میں آنا ضروری تھا اور ہم کمسن لڑکے لڑکیاں اس تماشہ کے انتظار میں ان قوالیوں کو بھی برداشت کرتے جاتے تھے جو ہماری سمجھ سے بالکل باہر ہوتی تھیں۔

اسرار بھائی کے لیے تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ سدا سہاگن کے وجد کی کیفیت دیکھنے سے قبل درگاہ سے باہر نکلیں۔ اکثر دن ہونے پر ہم میں سے کسی کا ڈوپٹہ مانگ کر اپنے کان کے اس چھید میں جو کسی منت کی دین تھا، بندہ بالی ڈال کر سدا سہاگن کی نقل کر کے اس طرح ہنساتے کہ پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے اور بزرگوں سے اپنی اس بے ادبی پر ڈانٹیں کھاتے تھے۔ پر ہم سب کی فرمائش پر چھپ چھپ کر یہ تماشہ ہوتا ہی رہتا تھا۔

دوسری تقریب جو ہمارے خاندان کے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی، وہ تھا ربیع الاول کے مہینے میں نبی خانہ کا چراغ دان۔ اس بارہ دری میں جہاں رسولِ پاک کے موئے مبارک کا ہرے رنگ کا صندوق رکھا ہوا تھا۔ بارہ وفات کے بارہ دن رات کو نعتیہ قوالیوں کی محفلیں جمتی تھیں اور دن میں میلاد کی۔ آخر کے دو دن چراغاں ہوتا تھا۔ بارہ دری گھی کے چراغوں سے جگمگا اٹھتی تھی۔ سامنے کے میدان میں چھوٹی چھوٹی دکانوں کا میلہ لگتا تھا۔ اس تقریب کی ذمہ داری ان تین خاندانوں پر تھی، جن کے گھر نبی خانہ کے احاطہ میں تھے اور آپس میں قریبی رشتہ رکھتے تھے۔

ہر تیسرے سال نبی خانہ کے چراغ دان کی ذمہ داری ہمارے خاندان پر پڑتی تھی۔ انتظامات کے سلسلہ میں ہماری اماں دو چار ہفتہ پہلے لکھنؤ سے ردولی پہنچ جاتی تھیں۔ ابا معہ بیٹوں کے

دو چار دن پہلے آجاتے تھے۔ میلاد کے بعد جلیبیاں، امرتیاں اور لڈو وغیرہ بٹتے تھے۔ بجٹ پر انحصار تھا۔ البتہ گیارہ تاریخ کی میلاد کے بعد اصلی گھی میں بنا ہوا سوجی کا حلوہ ضرور ہوتا تھا۔ اتنا گھی کہ حلوہ اگر مٹھی میں لیا جائے تو گھی انگلیوں سے بہتا تھا۔ اس حلوے کی جیسے بات ہی کچھ اور ہو۔ اسرار بھائی کو مزا آتا تھا کہ وہ دوہرے تہرے حصے حاصل کریں اور ہم لڑکیوں تک پہنچائیں۔ یہاں تک کہ ڈانٹ کر بھگائے جائیں۔

گیارھویں اور بارھویں کی درمیانی شب کو گھر سے گاگر اٹھنے کی روایت تھی۔ یہ گاگر شربت سے بھرے ہوئے مٹی کے کورے گھڑے ہوتے تھے، جن کے منہ پر لال تول کے رومال پیلے چمیلی کے ہاروں سے باندھے جاتے تھے۔ اگر ان پھولوں کی فصل نہ ہوتی تو سنہری روپہلی گوٹے کناری پر اکتفا کی جاتی تھی۔ روایت کے مطابق یہ گاگر تعداد میں گیارہ ہوتے تھے۔ لیکن ہر سال ہی ان میں منت مرادوں کے گاگروں کا اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ ان گاگروں کے لیے کچھ مدت کا تعین ہوتا تھا۔ بچوں کی منت کے گاگر چھوٹی چھوٹی جھجھریاں ہوتی تھیں۔ اگر بچے اٹھانے کے قابل ہوتے تو انھیں وہ خود اٹھاتے تھے ورنہ اٹھانے سے پہلے ان کے سر سے چھو دیے جاتے تھے۔ اسرار بھائی کے طفیل سے انصار بھائی ہر منت میں شریک کر لیے جاتے تھے سو اُن دونوں کے نام بھی دو جھجھریاں ہوتی تھیں۔

ان گاگروں کی تیاری گھر کی خواتین پر تھی۔ دالان کے وسط میں یہ تیار کر کے رکھ دیے جاتے تھے۔ اُن کو کلمہ درود پڑھتے ہوئے اٹھا کر باہر بارہ دری میں لے جانا بزرگوں کا ایک مقدس فریضہ تھا۔ میراثنوں کا بھی مجمع ہوتا تھا۔ وہ نعتیں اور قوالیاں سناتی تھیں۔ مجمع پر ایک عجیب سماہوتا تھا۔ فضا پر صوفیانہ روحانیت کا رنگ، گاگر اٹھانے والوں کے جلوس میں اسرار بھائی، انصار بھائی اور خاندان کے دیگر لڑکے بھی ہوتے تھے۔ اس دوران اسرار بھائی کس طرح سنجیدہ رہ لیتے تھے۔ غالباً اس وقت کی فضا کا کارنامہ تھا۔

عرس اور میلوں کے علاوہ ردولی کا محرم قرب وجوار میں بہت مشہور تھا۔ نوابانِ اودھ شیعہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور انتہائی شان وشوکت کے ساتھ محرم کا اہتمام کرتے تھے۔ ایک دور تھا جب لکھنؤ کے بجائے فیض آباد ان نوابین کی جائے رہائش تھی اور ردولی فیض آباد سے اتنا قریب ہے کہ ہمارے بچپن میں لوگ سائیکل پر فیض آباد کا چکر لگا آیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد ہی لکھنؤ اودھ کا دارالسلطنت قرار پایا۔ لکھنؤ اور ردولی میں بھی درمیانی فاصلہ کچھ لمبا نہیں ہے۔ غرض یہ کہ نوابانِ اودھ جس انداز سے محرم مناتے تھے، اُس سے ردولی کا محرم متاثر ہوا۔

ردولی کے تین تعلقداروں میں سے دو کا تعلق شیعہ فرقہ سے تھا اور محرم کی تمام تر ذمہ داری انھیں دونوں پر تھی۔ محرم تاریخ اسلام کے اس اہم واقعہ کی یاد میں منایا جاتا ہے جس کا تعلق حق و باطل کی جنگ اور راہ حق میں ایک لامثال قربانی سے ہے۔ لیکن جس انداز سے محرم ہندوستان میں منایا جاتا ہے وہ کسی اور اسلامی ملک میں نظر نہیں آتا۔ بہت ہی شان و شوکت اور چمک ودمک کے ساتھ۔

اس سلسلہ میں ایک روایت ہے۔ کہتے ہیں ہر دسویں محرم کو تیمور جنگ امام حسینؑ کے مقبرے پر حاضری دیتے تھے۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ محرم کے زمانہ میں وہ اپنی مہم پر ہندوستان میں تھے اور اُن کے فرائضِ منصبی مزار امام پر اُن کی حاضری میں مانع تھے۔ سو انھوں نے روضہ امام کی شبیہ تیار کروانے کا حکم صادر کیا تا کہ اُس کے سامنے بیٹھ کر اپنی عقیدت مندی کا اظہار کر سکیں۔ یہ تھی تعزیہ داری کی ابتدا۔ آگے چل کر فنکاروں کو اس بہانے اپنے فن کے مظاہرے کے مواقع ملے اور رئیسوں سے دادو دام حصول کرنے کی صورتیں۔ تعزیوں کے ذریعے ایسے ایسے جوہر دکھائے گئے کہ پوچھو نہیں۔ مثلاً منیہاروں نے رنگ برنگی چوڑیوں کا تعزیہ تیار کیا۔ دھنیوں نے روئی کا، حلوائیوں نے بتاشوں کا، مالیوں نے پھولوں کا۔ غرض یہ کہ موم کے موتی کے نت نئے تعزیوں کی اقسام وجود میں آ گئیں۔ محرم کے جلوس فنکاروں کے لیے ایک دوسرے پر برتری کے اظہار کا ذریعہ بن گئے۔ کچھ اثر پڑا ہندو بھائیوں کے دسہرے کے جلوسوں کا۔ رام لیلا اگر اس رنگینی اور دھوم دھام سے منائی جاتی ہے تو بے چارے اہلِ اسلام گھروں میں بیٹھ کر شہادت نامہ پڑھنے اور آنسو بہانے پر کیوں اکتفا کریں۔ کون انکار کر سکتا ہے ہندو تہذیب کے اثرات سے۔

تعزیوں کے جلوس کے علاوہ تابوتوں کے جلوس بھی نکلنے لگے۔ حضرت عباس کی مہندی کا جلوس بھی نکلنے لگا۔ ان جلوسوں میں امام کا سجا دھجا گھوڑا جسے دُلدل کہتے ہیں، شامل ہو گیا۔ فوج کے جھنڈوں کی نمائندگی کے لیے نیزہ بردار عَلَم، جنگِ کربلا میں آل رسول کی اسیری کی یاد دہانی کے لیے اونٹوں پر شبیہیں گھوڑوں اور ہاتھیوں پر سوار ہتھیار آراستہ سپاہ، ماتمی دھن کی شہنائیاں اور ساتھ ساتھ سوز و مرثیہ خوانی۔ غرض یہ کہ اسلامی تاریخ کے اس سبق آموز اور اہم واقعہ کو ایک خصوصی رنگینی دے دی گئی۔ جانے ان جلوسوں کے تماش بینوں میں سے کتنوں کو امام اور اُن کے ساتھیوں کی اس جرأت اور اس قربانی کا احساس ہوتا ہو گا، جنھوں نے حق کی جنگ میں اپنا سب کچھ بازی پر لگا دیا تھا۔

محرم کے دس دن ردولی کے باشندوں کے لیے بہت ہی مصروفیت کے دن ہوتے تھے۔ کسی دن ارشاد حسین کا تعزیہ نکل رہا ہے تو کسی دن چودھری محمد علی کا، کسی دن مہندی نکل رہی ہے تو کسی دن تابوت، کسی دن اسیروں کا جلوس تو کسی دن سپاہ گروں کا۔ غرضیکہ نویں تاریخ تک ایک ہنگامہ رہتا تھا۔ لکھنؤ، فیض آباد سے چھری کا ماتم کرنے والے اور بانسوں سے گدکا کھیلنے والے بلائے جاتے تھے۔

محرم کے سلسلہ میں اس وقت شیعہ سنیوں میں صرف یہ فرق تھا کہ سنیوں کے گھر مجلسیں نہیں ہوتی تھیں، ماتم نہیں ہوتا تھا۔ ہمارے گھر میں روزانہ رات کو شہادت نامہ پڑھا جاتا تھا۔ ان دنوں ہم سب پر لال گلابی رنگ پہننے پر پابندی تھی۔ ہم لڑکیاں ہرے اودے اور نیلے پیلے رنگ کے ملاپ سے طرح طرح کے لہریا ڈوپٹہ مختلف تاریخوں کے لیے تیار کرتے تھے۔ جانے کس واقعے کس بات کی یاد دہانی کے لیے ناریل کاٹ کر اور دھنیا کے بیج بھون کر اور اس میں کتری چھالیا ملا کر گوٹا تیار کیا جاتا تھا اور اس کے بھرنے کے لیے رنگ برنگی ریشمی کترنوں سے ڈوریوں کی مدد سے کھلنے اور بند ہونے والے بیضاوی شکل کے بٹوے اور بٹویاں تیار کی جاتی تھیں اور یہ بٹوے اور گوٹا خاندان میں ایک دوسرے کے گھر بھیجا جاتا تھا۔ بٹوؤں کی تعداد، سائز اور گوٹے کی مقدار کا تعلق رشتہ کے قریبی یا دوری سے تھا۔ اس گوٹے کی چھین جھپٹ میں بھی اسرار بھائی آگے آگے رہتے تھے۔

ردولی کا محرم بھی ایک تقریب کی صورت رکھتا تھا۔ پہلی تاریخ سے نویں تک کوئی نہ کوئی جلوس نکلتا رہتا تھا اور قصبہ کی تمام تر آبادی اس راہ کے ارد گرد کے گھروں میں نظر آتی تھی، جس سے یہ جلوس گزرنے والا ہوتا تھا۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ اسرار بھائی ان ہنگاموں میں گھس پل کر شامل نہ ہو جائیں۔ سنتے ہیں کہ اس دور میں سینہ پر سوجن اور سرخی آجاتی تھی اور ماں و نانی کی ڈانٹیں پڑتی تھیں کہ ماتم جائز نہیں ہے۔ ان دنوں شیعہ سنیوں میں بس اتنا فرق تھا۔

محرم کے ان دس دنوں سے اسرار بھائی کی لاتعداد منتیں مرادیں وابستہ تھیں۔ کسی تاریخ پر فقیر بنائے جارہے ہیں اور ہرے رنگ کا لمبا کرتا پہنایا جارہا ہے اور گلے میں ایک تھیلی۔ گھر گھر جاکر بھیک جمع کرتے اور یہ پیسے امام حسین کے نام نذرانے میں خرچ ہوتے۔ کسی تاریخ کو اسیر بنائے جاتے، گلے میں پیتل کا طوق اور پیر میں لوہے کا چھلا پہنایا جاتا جو سوئم کے بعد اترتا۔ نویں کو امام کی فوج کے سپاہی بنائے جاتے۔ کمر میں دفتی کی بنی تلوار باندھی جاتی۔ محرم کی ان تاریخوں سے وابستہ منتوں کے علاوہ ان کی اور بھی لاتعداد منتیں مرادیں تھیں جن میں سے

کچھ تو ان کی زندگی کی آخری سانس تک پوری کی جاتی رہیں۔ مثلاً ماں ہر رات اُن کے تکیہ کے نیچے گیارہ پیسہ رکھتی تھیں جو حضرت معین الدین چشتیؒ کے فاتحہ کے لیے صرف کیے جاتے تھے۔ رجب کا مہینہ آتا تو ان کے نام کا کونڈا ابھرا جاتا تھا۔ جس کی خصوصیت یہ تھی کہ طلوعِ آفتاب سے قبل تیار کردیا جائے اور غروب آفتاب سے قبل خالی ہو جائے۔ اس کی مٹھائی اپنی جگہ سے ہٹائی نہیں جاسکتی تھی۔ کس نے جانا تھا منتوں مرادوں کی پلی ہوئی اِس اولاد کا انجام۔

ہمارے گھروں میں صرف وہی تہوار نہیں منائے جاتے تھے جن کا تعلق ہمارے مذہب یا ہمارے عقیدہ سے تھا۔ بلکہ ہمارے یہاں بسنت کا تہوار بھی بہت زوروں سے منایا جاتا تھا۔ اس دن کے لیے بسنتی ڈوپٹہ لازمی تھا۔ مراثنیں اپنی ڈھولک سمیت آ پہنچتی تھیں اور گانے بجانے ہوتے تھے۔ پاس پڑوس کے لوگ یکجا ہو جاتے تھے۔ ہمارے گھر میں دیوالی بہت ہی زوروں سے منائی جاتی تھی۔ کہنے کو اس تہوار کے سلسلہ میں لوازمات کی تیاری بچوں کے نام پر ہوتی تھی۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ فیسٹول کی فضا پیدا کرنے اور اس سے لطف اٹھانے میں ہمارے بزرگ بچوں کے ساتھ برابر کے شریک ہوتے تھے۔ ہمارے بنی خانے کے گھر بغلی سہ دری سے لگی ہوئی دیوار میں ہمارا ایک پنج درہ گھروندا بنا ہوا تھا۔ سال بھر تو ہماری گڑیاں اس میں سوتی جاگتی تھیں۔ پر دیوالی سے ایک دن پہلے وہ صندوقچہ میں مقید کرلی جاتی تھیں اور اس گھروندے کی رنگ آمیزی ہوتی تھی اور اس میں مٹی کی چھوٹی ہانڈیاں اور کونڈیاں رکھی جاتی تھیں جس میں مرمرے اور بتاشے بھرے جاتے تھے۔ یہ گھروندا شکر کے کھلونوں سے سجایا جاتا تھا اور گھی کے دیوں سے روشن کیا جاتا تھا۔ اس گھروندے کی رنگ آمیزی کے لیے ہمارے بڑے تایا سہنی یعنی ہمارے گاؤں سے رودولی آتے تھے۔ اسرار بھائی ان کے اسسٹنٹ کا کام انجام دیتے تھے۔ پٹاخوں اور آتش بازی کی ذمہ داری تو اسرار بھائی اور اُن کے ساتھیوں پر ہونی ناگزیر تھی۔ مراثنیں اور ان کی لڑکیاں بن بلائے آتی تھیں اور موقعہ کی مناسبت سے گانے گائے جاتے تھے۔ کسی کے ذہن میں دور دور یہ خیال نہیں آتا تھا کہ یہ تہوار ہندوؤں کا ہے اور ان میں ان کے بچوں کی شرکت اسلام کو خطرہ میں ڈال دے گی اور ان پر جنت کے دروازہ بند ہو جائیں گے۔ باوجود اس کے کہ اس وقت لوگوں کے پاس کالج کی ڈگریاں نہ تھیں۔ زندگی کے تجربات بھی محدود تھے۔ چھوت چھات بھی آج سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ لیکن ذہنوں میں اپنائیت کی ایک کھڑکی تھی جو کھلی ہوئی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کی کشادگی میں کمی ہوتی جارہی ہے۔ جانے کیوں؟

یہ تھی ایک جھلک ردولی کی تہذیب اور اس گھر کی جس میں آپ کے مجاز پیدا ہوئے اور جس میں ان کے بچپن کا خاص حصہ گزرا۔ اب آیئے اس لکھنؤ پر نظر ڈالیں جو اس وقت اودھ کی تہذیب کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا اور اردو زبان کی صحت کا دعویدار اور دلی کی اردو کا رقیب، علم و ادب شعر و شاعری کا مسکن اور جہاں اسرار بھائی کی اٹھتی ہوئی جوانی اور اس جوانی کا آخری دور گزرا اور جہاں کی مٹی نے انھیں اپنایا اور ابدی سکون دیا۔

لکھنؤ کی تہذیب و تمیز کا یہ عالم تھا کہ اگر مالکن کو خادمہ پر غصہ آئے تو بجائے کم بخت کے نیک بخت کہہ کر مخاطب ہوں۔ اگر مالک کو ملازم پر غصہ آئے تو نمک حرام کا لفظ منھ سے نہ نکالیں، نمک فراموش کہہ کر مخاطب ہوں۔ غالباً اسی تہذیب اور اسی ماحول کی دین تھی کہ ہم نے اپنے گھر میں گالی گلوچ تو دور کی بات ہے۔ سخت کلامی یہاں تک کہ کسی کو اونچی آواز سے بھی کام لیتے نہ سنا۔ ہم سب کے لیے تاکید تھی کہ ملازم کے ساتھ چچا ماموں رشتہ کا جوڑیں ملازمہ کو بوا کہہ کر پکاریں۔ ایک دفعہ جانے کیسے میرے منھ سے کوئی گالی نکل گئی تھی۔ مجھے اُس کوٹھری میں بند کر دیا گیا جس میں ٹائیگر[1] باندھا جاتا تھا۔ آج تک میرے کانوں میں اپنی ماں کا یہ جملہ گونجتا ہے کہ اگر تمہارا منھ اتنا گندہ ہے تو تمہیں اس کتے کے ہی برتن میں کھانا ملے گا۔

اسرار بھائی کے لاڈلے پن کی انتہا سمجھنی چاہیے کہ ہم جیسوں کے گھر میں انھیں کتا پالنے کی اجازت مل گئی تھی ورنہ ان وقتوں میں ہم مسلمان گھرانوں میں کتے کا قُرب بھی طہارت کو خطرہ میں ڈال دیتا تھا۔ اسرار بھائی کو جانوروں سے بہت دل چسپی تھی۔ کہیں سے ایک چھوٹا سا بچہ اٹھا لائے تھے اور اسے کھلا پلا کر خاصا بڑا کر لیا تھا۔ اس کا نام ٹائیگر رکھا تھا۔ اسکول جاتے وقت ان کے ساتھ ہمارے پرانے ملازم عاشق علی چچا ہوتے اور ٹائیگر صاحب۔ ملازم تو پہنچا کر واپس ہو لیتے، لیکن ٹائیگر صاحب چھٹی ہونے تک گیٹ پر بیٹھے اپنے مالک کا انتظار کرتے رہتے۔ اس دوران ہماری ماں اوپری بالکونی پر بیٹھی بیٹوں کی واپسی کے لیے اللہ آمین کرتی رہتی تھیں۔ ہماری ماں دیوانگی کی حد تک اسرار بھائی کی محافظت اور عافیت میں لگی رہتی تھیں۔ جیسے وہ ہی زندگی کا محور ہوں۔ یہ تو اسرار بھائی کی شخصیت کی صفت تھی کہ بہن بھائیوں کے دل میں ان کے خلاف غصہ اور رقابت کا جذبہ نہیں پیدا ہوا۔ ہر شخص یہ سوچتا تھا کہ وہ جو محبت و پیار پا رہے ہیں یا ان کا جو امتیازی درجہ ہے، اُس کے وہ مستحق ہیں۔

---

[1] اسرار بھائی کے پالتو کتے کا نام

کچھ عرصہ بعد ٹائیگر کسی حادثہ کا شکار ہوا اور ہمارے گھر کی فضا نے کچھ دنوں کے لیے محرمی رنگ اختیار کر لیا۔ اسرار بھائی کی افسردگی دور کرنے کے لیے گھر میں ایک بلی پالی گئی۔ کالی سفید چتکبری موٹی سی کسی اچھی نسل کی۔ وہ اسرار بھائی کے پلنگ پر ان کے پائنتیں سوتی تھی۔ اس کا نام پوسی رکھا گیا تھا۔ اس وقت میں بہت چھوٹی تھی۔ لیکن پھر بھی مجھے یاد ہے کہ اس بلی کے لیے ایک جالی دار صندوق بنوایا گیا تھا اور جب ہم ردولی جاتے تھے۔ یہ بلی صندوق میں بند ہو کر ہمارے ساتھ ہوتی تھی۔ جانے اس زمانہ میں جانوروں کو اپنے ساتھ ٹرین میں لے جانے پر کوئی پابندی تھی یا نہیں۔ بہر حال ہماری پوسی ہمارے ساتھ ہوتی تھی اور راستے بھر میاؤں میاؤں کرتی رہتی تھی۔ ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔ ہم سفر بیویوں میں سے ایک نے پوچھا کہ اس بلی میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ آپ اسے اپنے ساتھ لیے جا رہے ہیں۔ اسرار بھائی نے اپنے مخصوص سنجیدہ انداز میں جواب دیا۔ اس کے گلے میں پیسہ رکھ کر ہم رومال باندھ دیتے ہیں اور یہ قصائی کی دکان سے گوشت لے آتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم خواتین نے اس جواب کو کتنا صحیح سمجھا اور کتنا غلط۔ البتہ ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگیں اور اسرار بھائی نے اس جواب کے بعد قطعی بے نیازی اختیار کر کے اپنا منہ کھڑکی سے باہر کر لیا۔

لکھنؤ کی یاد میرے لیے ایک میٹھی کسک کی صورت رکھتی ہے۔ اس شہر میں مولوی گنج کا وہ گھر ہے جس کی چھت پر اسرار بھائی اپنے کھیل کود کے کرتب دکھاتے تھے۔ وزنی سے وزنی چیز اٹھا کر اور آستین چڑھا کر اپنے بازو کے تنے ہوئے پٹھوں سے ہم پر رعب جماتے تھے۔ انھوں نے کسرت کے تمام لوازمات جمع کر رکھے تھے۔

اسی شہر میں امین آباد میونسپل اسکول تھا، جس کے استادوں کے لیے وہ مایہ ناز شاگرد تھے۔ حساب میں سب سے آگے، ڈرائنگ میں مہارت، لکھائی موتیوں جیسی صاف ستھری اور خوب صورت۔ ہائی اسکول میں فرسٹ کلاس لائے، مٹھائیاں بٹیں، خوشیاں منیں۔

اسی شہر میں کچے احاطہ کا وہ گھر بھی ہے، جس کے آنگن کی دیوار کے سہارے پلنگ کھڑا کر کے پڑوس کے تن آور نیم کے درخت سے ہمیں نیم کوریاں توڑ کر دیا کرتے تھے اور ہم جھوٹ موٹ کے پھل اور ترکاریوں کی دکان لگا کر اپنا دل بہلایا کرتے تھے۔ یہیں گھر کے سامنے ایک میدان ہے، جس میں وہ اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ ہاکی اور کرکٹ کھیلتے تھے، جس میں سے کوئی پولیس ڈیپارٹمنٹ میں کھپا اور کوئی فوج میں۔

انھیں گھروں میں وہ چھتیں تھیں، جن کے نیچے ہمارے ماں باپ نے اپنے بیٹے کے لیے

سنہرے خواب دیکھے۔ پولیس کی نوکری تہذیب کے خلاف۔ فوج کی نوکری، دل گردہ چاہیے تھا۔ پھر ایسی اولاد کے لیے، جس کی ہر سانس پر شکرانہ ادا کیا جاتا ہو۔ ورنہ وہ اپنی دل چسپیوں اور جسمانی اُٹھان کے لحاظ سے انھیں لائنوں کے لیے موزوں تھے۔ بہر حال ماں باپ کا فیصلہ ہوا کہ بیٹا انجینئر بنے گا۔ پُل اور سڑکوں کی تعمیر کرے گا۔ دور دور اُن کے خواب وخیال میں نہ تھا کہ اُن کی یہ عزیز ہستی خود تخریب کا شکار بنے گی۔

لکھنؤ اب وہ لکھنؤ نہ رہا، جس میں ہمارا بچپن گزرا تھا۔ اب کہاں سبزی منڈی میں ککڑیاں بیچنے والوں کی یہ صدائیں، آؤ آؤ لے جاؤ، لیلیٰ کی انگلیاں مجنوں کی پسلیاں، اب کہاں خربوزوں کے ٹھیلوں کی طرف سے آتی ہوئی آوازیں، شہد سے زیادہ شیریں دودھ سے زیادہ سفید، خوشبو عرق گلاب کی۔ اب تو امین آباد کی سڑک پر بیلے، چمیلی اور جوہی کے گجروں کی خوشبو کی جگہ ڈیزل اور پٹرول کی بدبو نے لے لی ہے۔ وہ شور و ہنگامہ ہے کہ کھوا سے کھوا چھلتا ہے۔ اب ان سڑکوں پر بے فکر نوجوانوں اور عمر رسیدہ بزرگوں کی چہل قدمی کا کیا سوال۔ شامِ اودھ تو اب ایک خواب وخیال ہے۔

اس لکھنؤ میں اسرار بھائی کی عمر کا وہ حصہ گزرا، جو زندگی سے بھرپور تھا۔ شوخی وشرارت اور کھلنڈرے پن کی تصویر تھا۔ دماغ توانا جسم صحت مند ہم سب کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز۔ حوصلے تھے، امنگیں تھیں۔ عبرت کا مقام ہے اسی شہر نے انھیں ٹوٹتے دیکھا، بکھرتے دیکھا، انتشار اور اضطراب کا نشانہ بنتے دیکھا۔ بنے تھے ردولی کی مٹی سے کھپے، لکھنؤ کی مٹی میں سچ پوچھیے تو عمر کے ابتدائی دور میں بھی اُن کی شخصیت کے دورخ تھے۔ ایک طرف حسن سے دل چسپی، ڈرائنگ پینٹنگ، پھول پتی سے لگاؤ، دوسری طرف حساب کے جوڑ گھٹاؤ ضرب و تقسیم میں مہارت، الجبرا کے ایکیوزنش اور جیومیٹری کے تھیوری سے دل چسپی۔ اچھل کود میں چابکدستی، شوخی وشرارت میں یکتائی اور ساتھ ہی ساتھ دکھی بیماروں کے پاس گھنٹوں گھنٹوں بیٹھ کر اُن کی دلداری اور تیمارداری کا رجحان۔ یقیناً بظاہر تضاد نظر آتا ہے۔ شدید تضاد۔ لیکن سوچیے آگے بڑھ کر ردولی کے لاڈلے جگن اور لکھنؤ کے کھلنڈرے اسرار نے شاعر کا روپ دھارا اور اپنے نام کے آگے مجاز تخلص کا اضافہ کیا تو اُن کی شاعری اُن کے کلام میں بھی خوابوں کے حسن کے ساتھ حقیقتوں کا کچھ ایسا دل کش امتزاج ہے، جس کا رنگ انوکھا ہے۔ اظہار تلخی کا زندگی کی ناانصافی کا، لیکن ایسے بھیانک انداز میں نہیں کہ انسان زندگی کی جدوجہد سے ہار مان لے۔ مایوسیوں کا شکار بن جائے۔ اظہار کڑوی اور بدہیئت حقیقت کا۔ لیکن الفاظ میٹھے مدھر اور امید افزا۔ سنیے:

مٹ کے بربادِ جہاں ہو کے، کبھی کچھ کھو کے
بات کیا ہے کہ زیاں کا کوئی احساس نہیں
کار فرما ہے کوئی تازہ جنونِ تعمیر
دلِ مضطر ابھی آماجگہِ یاس نہیں

تازہ دم بھی ہوں، مگر پھر یہ تقاضا کیوں ہے
ہاتھ رکھ دے میرے ماتھے پر کوئی زہرہ جبیں
ایک آغوشِ حسیں شوق کی معراج ہے کیا
کیا یہی ہے اثرِ نالۂ دلہائے حزیں

مہوشوں کا طرب انگیز تبسم کیا ہے
ہے تو سب کچھ یہ مگر خواب اثر کیوں ہو جائے
حسن کی جلوہ گہہِ ناز کا افسوں تسلیم
یہی قربانِ گہہِ اربابِ نظر کیوں ہو جائے

بہ ایں انعامِ وفا اُف بہ تقاضائے حیات
زندگی وقفِ غمِ خاک نشیناں کر دے
خونِ دل کی کوئی قیمت جو نہیں ہے تو نہ ہو
خونِ دل نذرِ چمن بندیٔ دوراں کر دے

(فکر)

اسرار بھائی نے امتیاز کے ساتھ میٹرک پاس کیا ہی تھا کہ ابا کا تبادلہ آگرہ کا ہو گیا اور ہم سب بوریا بستر باندھ آگرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھر ہینگ منڈی میں لیا گیا۔ دیوار پار پڑوس فانی بدایونی کا تھا۔ آپس میں تعلق رکھنے کے لیے اوپری منزل پر درمیانی دیوار میں ایک دروازہ بھی تھا۔

اسرار بھائی کا داخلہ سینٹ جانسن کالج کروا دیا گیا۔ فزکس، کیمسٹری اور حساب جیسے مضامین کا انتخاب ہوا۔ ماں باپ نے سوچا۔ اب اُن کے خوابوں کی تعبیر کا وقت قریب ہے۔ دو سال بعد پھر بیٹا رڑکی جائے گا، انجینیئر بن کر آئے گا۔ اونچا عہدہ پائے گا۔ چاند سی دلہن گھر آئے گی۔ آنگن پوتے پوتیوں کی رونق سے جگمگا اٹھے گا۔

ادھر اصلیت وہ رخ اختیار کرنے پر آمادہ تھی جس کا کسی کو دور دور تک وہم و گمان نہ تھا۔ بیٹے کی اصلی فطرت نے سر اٹھایا اور ایک ایسے جھٹکے کے ساتھ کہ اُن کی زندگی کا نقشہ ہی اُلٹ پلٹ گیا۔ وہ رجحان جو اب تک کمرہ میں گلدان سجا کر، تصویروں کی رنگ آمیزی کر کے، حسین چہروں کے سامنے گھنٹوں گھنٹوں بیٹھ کر مطمئن ہو تا تھا۔ کچھ ایسا طوفانی طور پر ابھرا کہ وہ خود بھی جیسے بوکھلا سے گئے ہوں۔ جیسے کسی دوراہے پر کھڑے ہوں اور سوالیہ نشان یہ ہو کہ کدھر قدم اٹھائیں، کدھر نہ اٹھائیں۔ دل مضطرب اور بے چین تھا۔ اس منزل کے لیے جو قدرت نے اُن کے لیے مقرر کی تھی، دماغ پراگندہ تھا ان آرزوؤں اور تمناؤں کے خون کے تصور سے جو اُن کو چاہنے والوں اور اُن کے چہیتوں نے اُن کے ساتھ وابستہ کر رکھی تھیں۔ غرضیکہ دل ایک طرف کھنچتا تھا تو دماغ دوسری طرف۔ کشاکشی اور افراتفری کا عالم اور وہ حیران و پریشان۔

اس دور اور اس کیفیت میں اُن کی شامیں گزر رہی تھیں پڑوس میں فانؔی بدایونی کی شاعرانہ صحبت میں اور دن بیت رہے تھے معین حسن جذبؔی اور آل احمد سرور کی سنگت میں۔ جذبی بھائی کالج میں اُن کے کلاس فیلو تھے اور جگری دوست سرور صاحب ان سے سینیر تھے۔ لیکن ہم ذوق، ہم مذاق اور اُن کے مشفق۔

اسی دوران ہمارے باپ کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا۔ اسرار بھائی نے انٹر میجیٹ کا فرسٹ ایر کیا تھا۔ دوسرا سال مکمل کرنے کے لیے اُن کو آگرہ میں ہوسٹل میں چھوڑا گیا۔ اب وہ اس پیار و محبت بھرے تحفظ کی چھاؤں سے بھی محروم ہو گئے، جس کے وہ بچپن سے عادی تھے۔ غرضیکہ یہ دور اُن کے لیے ایک آزمائشی دور ثابت ہوا۔ ایسی آزمائش جس نے اُن کی زندگی کے نظام کو بالکل ہی تتر بتر کر کے رکھ دیا۔ دل و دماغ شاعری کی حسین لطافتوں کو اپنانے پر اتارو تھا اور عقل کا تقاضا تھا کہ فزکس اور کیمسٹری کے خشک فارمولوں پر سر کھپایا جائے۔ اندر چھپے ہوئے شاعر کی جیت ہوئی اور مستقبل کے انجینئر کی شکست۔ حاضریاں کم ہوئیں، امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہ ملی۔ پڑھائی میں دل کیوں کر لگتا۔ امتحان میں بیٹھتے بھی تو فیل ہوتے۔ وہی ہستی جو کبھی اپنے استادوں کے لیے باعثِ فخر تھی اور اپنے ساتھیوں کے لیے پڑھائی میں مدد گار۔ اپنی پڑھائی سے اس طرح بیزار ہوئی کہ پوچھیے نہیں۔ وہ امتحان ہال میں ہوتے اور علی گڑھ میں ماں جانماز پر سجدہ میں۔ باپ بھی حیران و پریشان کہ یکایک یہ کایا کیوں کر پلٹی۔ شاید ماں کی دعاؤں کا اثر رہا ہو۔ لوٹ پوٹ کر کسی صورت آگرہ سے انٹر پاس کیا اور علی گڑھ بلا لئے گئے۔

علی گڑھ یونی ورسٹی میں داخلہ ہوا۔ سائنس کے مضامین چھوڑ اردو انگریزی اور سائکالوجی کو اپنایا۔ گھنٹوں کورس کی کتابوں کے ساتھ مغززنی کرنا بس کا روگ نہ تھا۔ محنت وریاضت کی صلاحیت بانٹتے وقت قدرت نے اُن کا حصہ صفیہ آپا کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ پر ذہین تھے، مضامین سے مزاج کو مطابقت تھی۔ سیکنڈ ڈویژن میں پاس کرلے گئے۔ یہ اُن کی زندگی کے اس دور کی ابتدائی منزل تھی جس میں اُن کی قدرومنزلت پرکھنے کے معیار امتحان کے نتائج نہ تھے بلکہ رات وریل وانقلاب جیسی نظمیں تھیں۔ انھوں نے خود اپنے لیے کہہ دیا تھا:

یہ میری دنیا یہ میری ہستی نغمہ طرازی صہبا پرستی
شاعر کی دنیا شاعر کی ہستی یا نالہ غم یا شورِ مستی

ادبی حلقہ میں اپنا مقام بنا چکے تھے۔ اصلی جوہر کی پرکھ رکھنے والوں کی قدرومنزلت حاصل تھی۔ رشید صاحب، محمود صاحب جیسے ادب نواز لوگوں کی سرپرستی تھی۔ گھر والوں نے اطمینان کا سانس لیا اور سوچا کہ اب زندگی ڈھرّے پر لگ گئی۔ شعروشاعری کا رجحان ہے کیا مضائقہ، انجینئر نہ بن سکا، یونی ورسٹی کا ٹیچر تو بن ہی جائے گا۔ لیکن قسمت کچھ اور ہی گل کھلانے پر آمادہ تھی۔

یہ وہ دور تھا جب دیس کی زندگی تیزی سے بدل رہی تھی۔ کچھ اقدار اور روایات سے رشتہ توڑے جارہے تھے اور کچھ سے جوڑے جارہے تھے۔ یہ زمانہ تھا سیاسی، سماجی، معاشی پیچیدگیوں کے سمجھنے اور سلجھانے کا۔ ہر میدان میں ایک نئی جاگرتی، نئی سوچ ابھر رہی تھی۔

علی گڑھ یونی ورسٹی کا یہ دور اس کی تاریخ کا روشن ترین دور کہا جاسکتا ہے۔ اس کے افق پر ایسے ایسے ستارے جگمگائے، جس کی روشنی سے ملک کا کونہ کونہ فیضیاب ہوا۔ علم وادب شعروشاعری، سیاسی وسماجی غرض یہ کہ ہر میدان میں علی گڑھ کے طلبا نمایاں نظر آرہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہاں سے علم وشعور کے سوتے پھوٹ رہے ہوں جو دیش کے لیے جوئے حیات کا کام دے رہے ہوں۔ کوئی جوشیلا سماجی کارکن تو کوئی مہم آزادی کا پرجوش سپاہی، گویا سب ہی اپنے اپنے ہتھیاروں سے فرسودہ نظام کو جڑوں سے اکھیڑنے پر آمادہ۔ دامے درمے اور سخنے جو نام ذہن میں آرہے ہیں وہ تعارف کے محتاج نہیں۔ سعادت حسن منٹو، علی سردار جعفری، سبط حسن، شاہد لطیف، اختر الایمان، اختر رائے پوری، جاں نثار اختر، معین احسن جذبی، خواجہ احمد عباس اور میرے دونوں بھائی۔ اسی دور کی پیداوار تھے اس وقت پردہ کے پیچھے عصمت چغتائی اور صفیہ جاں نثار اختر بھی تھیں۔

ادبی رجحان رکھنے والے ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے میں اور ادب اور شاعری کو عملی مقصد کے تابع کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اس تحریک کو ترقی پسند ادب کا نام دیا گیا۔ اس تحریک سے وابستہ نوجوانوں میں کچھ کا لہجہ انتہائی جارحانہ اور خطیبانہ تھا اور اُنہی میں سے کچھ نے Self determination کی تھیوری کا دھوکا کھا کر ملک کی تقسیم میں مدد کی۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان میں سے ہر ایک کے ہی سامنے ایک مقصد تھا، ایک منزل تھی، سوچ تھی، شعور تھا۔ برطانوی سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا جذبہ تھا۔ کسی کا اظہار قلم سے تھا اور کسی کا عمل سے۔ اسرار بھائی کو ایک خصوصی اور امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہی تھی کہ اُن کے کلام میں فکرِ عصر کے ساتھ ساتھ قدیم شاعرانہ روایات کا بھی احترام تھا، جس کی نزاکت و لطافت سے انکار ممکن نہیں۔ غالباً احتشام صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے

> "جب ہم اس ادبی روایت کی تاریخ دیکھنا چاہیں جس سے مجاز کا تعلق تھا تو ہمیں ایک طرف حالی، آزاد، شبلی، اقبال، چکبست، سرور جہان آبادی، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی کو سمجھنا ہوگا اور دوسری طرف اس غزل گوئی کو جس کی نمائندگی حالی، شاد عظیم آبادی، حسرت، فانی، صفی عزیز، ثاقب اور جگر کر رہے تھے۔ ان تمام شعراء کا شعور کسی نہ کسی حیثیت سے اپنے عہد کے خیالات اور جذبات سے متاثر تھا۔ روایت کا تسلسل ٹوٹا نہ تھا ان شعراء کے یہاں چند روایات کی صدائے بازگشت بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ مجاز کو زندگی اور شاعری کا بس یہی ورثہ ملا جس میں اُن کے انفرادی تجربوں وقت کے تقاضوں، ذہنی صلاحیتوں اور فنی بصیرتوں نے اضافہ کیا۔"

ترقی پسند ادیبوں میں اسرار بھائی کی امتیازی حیثیت کا تجزیہ شاید اس سے بہتر ممکن نہیں۔

مقرر اپنی صاف گوئی اور زبان درازی سے سامعین کو تکلیف پہنچا سکتا ہے۔ ادیب کے قلم کی نوک کی تیزی بھی پڑھنے والوں کی ناگواری کا باعث بن سکتی ہے لیکن اچھا شاعر وہ تو دلوں کا رازداں ہوتا ہے۔ روح کا پیغامبر۔ حسّاس ہوتا ہے اور دوسروں کے احساسات کا درد رکھتا ہے۔ اس کی بولی دل سے نکلتی ہے اور دل کو چھوتی ہے۔ اسرار بھائی نے انقلاب کے وہ نعرے نہیں لگائے جو کانوں کے لیے ناخوشگوار ہوں۔ انھوں نے انقلاب کے وہ گیت گائے جس

میں باغی کے دل کی آگ جوانی کے خون کے جوش کے ساتھ ساتھ نغمہ سنج گلے کا سوز و گداز تھا۔ یہ گیت پُر اثر بھی تھے اور پُر سحر بھی۔ وہ جوانانِ وطن کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اے جوانانِ وطن، روح جواں ہے تو اٹھو
آنکھ اس محشر نو کی نگراں ہے تو اٹھو
خوفِ بے حرمتی و فکرِ زیاں ہے تو اٹھو
پاسِ ناموسِ نگاراں جہاں ہے تو اٹھو

اٹھو نقارۂ افلاک بجادو
ایک سوئے ہوئے عالم کو جگا دو

دوسری جگہ کہتے ہیں:

بہے زمیں پر جو میرا لہو تو غم مت کر
اسی زمیں سے مہکتے گلاب پیدا کر

ان اشعار میں انقلاب کے نعرہ لگانے والوں کی وہ للکار اور جھنکار تو نہیں ہے جو جھنجھوڑ کر رکھ دے لیکن وہ گرمی و نرمی ضرور ہے، جو دلوں کو چھو لیتی ہے۔

علی گڑھ نے اسرار بھائی کو محبت بھی دی اور عزت بھی۔ اسرار بھائی کو علی گڑھ سے بے طرح محبت تھی، بے طرح عقیدت تھی، جس کا اظہار یہ اشعار کرتے ہیں:

سرشارِ نگاہ نرگس ہوں، پابستہ گیسوے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں
ہر آن یہاں صہبائے کہن اک ساغر نو میں ڈھلتی ہے
کلیوں سے حسن ٹپکتا ہے پھولوں سے جوانی ابلتی ہے
جو طاقِ حرم میں روشن ہے وہ شمع یہاں بھی جلتی ہے
اس دشت کے گوشے گوشے سے اک جوئے حیات ابلتی ہے
اسلام کے اس بت خانے میں اصنام بھی ہیں اور آذر بھی
تہذیب کے اس میخانے میں شمشیر بھی ہے اور ساغر بھی
ہر شام ہے شامِ مصر یہاں ہر شب ہے شبِ شیراز یہاں
ہے سارے جہاں کا سوز یہاں اور سارے جہاں کا ساز یہاں

ہر آہ ہے خود تاثیر یہاں ہر خواب ہے خود تعبیر یہاں
تدبیر کے پائے سنگیں پر جھک جاتی ہے تقدیر یہاں

علی گڑھ کے طلباء نے مادر درسگاہ سے اپنے مجاز کی اس عقیدت اور محبت کو پورا مان دیا اور اس نظم کو یونی ورسٹی کا ترانہ بنایا۔ جب یہاں کے طلباء و طالبات پوری اور امنگ اور ترنگ کے ساتھ اس ترانہ کو اپنے ہر فنکشن کی ابتدا پر گاتے ہیں تو پوری محفل جاگ اٹھتی ہے اور ان کے ان اشعار پر ایمان سا آنے لگتا ہے:

جو ابر یہاں سے اٹھے گا وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رواں پر برسے گا، ہر کوہِ گراں پر برسے گا
ہر سرو و سمن پر برسے گا، ہر دشت و دمن پر برسے گا
خود اپنے چمن پر برسے گا، غیروں کے چمن پر برسے گا
ہر شہر طرب پر گرجے گا ہر قصر طرب پر کڑکے گا
یہ ابر ہمیشہ برسا ہے یہ ابر ہمیشہ برسے گا

کاش علی گڑھ کے نوجوان اپنے محبوب شاعر کی ان توقعات کو حقیقت کا جامہ پہنانے کا تہیہ کر سکتے۔

علی گڑھ کی تاریخ کا یہ دور اسرار بھائی کی ذاتی زندگی کا بھی حسین ترین دور تھا۔ یہاں ان کو ہم آہنگ ماحول ملا، بلند پایہ اور قدر داں استادوں کی رہبری ملی۔ روشن خیال اور علم دوست بزرگوں کی سرپرستی ملی۔ ہم مذاق اور ہم خیال دوستوں کا ساتھ ملا۔ یہ دوست بظاہر طبیعتاً بہت مختلف تھے لیکن آپس میں محبت و خلوص کا ایسا انوٹ بندھن تھا کہ باوجود چھوٹے موٹے اختلافات کے رشتہ میں بال نہ پڑتا تھا۔ جذبی بھائی بہت ہی خاموش اور قدرے دبی دبی اور مضمحل سی شخصیت کے مالک، اُن کے بر عکس سردار بھائی گرجنے اور برسنے والے نوجوان آواز بھی ماشاءاللہ بھاری اور بارعب۔ بھائی اختر کھوئے کھوئے سے نہایت شرمیلے، لہجہ دھیما دھیما سا انداز، رومانی، سبط بھائی کی شخصیت نارمل سی تھی۔ یہ تھے وہ چار پانچ، جن میں بہت ہی قربت تھا۔

ہمارے دونوں بھائیوں کا حلقہ احباب فکر و شعور کے لحاظ سے آپس میں یگانگت رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ ہمارے گھر ضیاء منزل کی جغرافیائی مقامیت ان سب نوجوانوں کے لیے ایک خصوصی کشش رکھتی تھی۔ ہمارا گھر میرس روڈ سڑک کے ایک طرف تھا اور دوسری طرف

گرلس ہاسٹل کی سرخ رنگ کی وہ سخت دل اور نا قابلِ عبور دیوار تھی، جن کے پیچھے اُن کے تخیل کی حسینائیں مقید تھیں۔ سو شام کو ہوا خوری کے بہانے یہ سڑک بہت موزوں تھی۔ تازی ہوا تو یونی ورسٹی کی سڑکوں پر بھی حاصل ہو جاتی تھی۔ لیکن اس سڑک پر تصورِ جاناں کا ایک خاص ہی لطف تھا۔ محبوباؤں سے اتنا قرب اور اتنی دوری۔ آخر کیوں؟ یہ سوال بھی ان سب میں مشترک تھا۔

سو ہمارے گھر کے ڈرائنگ روم میں ہر شام اسرار بھائی اور انصار بھائی کے دوستوں کا مجمع ہوتا اور سماجی، سیاسی و ادبی مسائل پر گرما گرم بحثیں ہوتیں۔ اسرار بھائی اکثر اوقات خاموش رہتے۔ جب محسوس کرتے کہ بحث نازک موڑ پر پہنچ رہی ہے اور تلخی کا امکان ہے تو اپنے مخصوص دھیمے اور نرم لہجہ میں کوئی مزاحیہ جملہ بول کر گفتگو کا رخ موڑ دیتے۔ ایسا ہی ایک موقعہ تھا دوستوں میں گتھم گتھا کی نوبت آنے والی تھی۔ اسرار بھائی ایکا ایکی جذبی بھائی کی طرف مخاطب ہوئے اور بولے یار! تمہارے ہاتھ کی کھجلی کا کیا حال ہے۔ جذبی بھائی نے کہا جانے کتنے مرہم استعمال کر چکا ہوں کم ہو جاتی ہے جاتی نہیں ہے۔ اسرار بھائی نے بہت ہی سنجیدگی سے کہا، پریشان نہ ہو کوڑھ ہے کوڑھ۔ سب ہی ساتھی ہنس پڑے۔ ایک دفعہ ان دوستوں میں ایک نے جن کو غالباً سماجی اصلاحات سے بہت دل چسپی تھی، بولے۔ سوچتا ہوں میں کسی بیوہ سے شادی کروں گا۔ اسرار بھائی نہایت ہی سنجیدگی سے بولے یار فکر نہ کرو جس سے بھی شادی کرو گے وہ جلد ہی بیوہ ہو جائے گی۔ بزلہ سنجی اسرار بھائی کے مزاج کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔

اسی دور میں اسرار بھائی کی حیثیت ایک ایسی شمع کی سی تھی جس پر ہزاروں پروانے نچھاور ہونے کے لیے بیتاب تھے اور گرلس کالج کے ہوسٹل کی پتھریلی دیوار کے پیچھے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ لیکن اس دیوار سے زیادہ پتھریلی اور سنگ دل تھیں وہ اقدار جن کے تحت انسان کا تول اُس کی شرافت اور انسانیت سے نہیں بلکہ جیب میں سکوں کے وزن سے ہوتا ہے۔

عصمت آپا نے لکھا ہے کہ لڑکیاں کتابوں کے اندر اپنے محبوب شاعر مجاز کی تصویریں چھپا چھپا کر رکھتی تھیں۔ ان کے نام قرعے نکالے جاتے تھے۔ ہوسٹل کی دیوار میں شگاف ممکن تھا، پر اللہ بھلا کرے ان سماجی اقدار کا ان کا تس سے مس ہونا ممکن نہ تھا۔ یہ پروانے پھڑ پھڑاتے ہی رہ گئے اور شمع قطرہ قطرہ پگھلتی گئی، گھلتی گئی اور آخر کو بجھ گئی اور یہ پروانے تماشائی بنے رہ گئے وہ بھی دور سے۔

کیا کمی تھی میرے بھائی میں۔ خوبرو جوان، چھریرا بدن، لمبا قد، ستواں ناک، چھوٹا دہن، پتلے ہونٹ، گیہواں رنگ، آنکھوں میں ذہانت کی چمک، چہرے پر شرافت کی چھاپ، لہجہ میں دھیمے پن کی مٹھاس مزاج میں محبت و خلوص کا گداز بہت ہی پُر کشش تھی یہ شخصیت، لیکن شاعری کے ساتھ ساتھ شراب نوشی کی عادت جس میں روز افزوں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ طرفہ تماشا یہ کہ جیب خالی۔ قفس کی پابندیوں کو توڑ کر رفاقت کا ہاتھ بڑھانا بڑی ہمت کا کام تھا بڑی جرأت کا۔ پروانوں کو پردہ و عصمت کے اشعار بھائے بہت۔ وہ ان پر سر دھنتے رہے۔ لیکن نظریات اور افعال کا درمیانی فاصلہ کوئی نئی بات تو نہیں اور غریب پروانے تو ہزار مجبوریوں کا شکار تھے۔ ان سے کیا گلہ، کچھ کے پر بھی زخمی ہوئے ہوں گے وہ اپنی خواہشوں اور ضرورتوں کو مار مار کر پیسہ جوڑ جوڑ کر آہنگ کی خریداری سے اپنی محبت اور عقیدت کی پیاس کو بجھا مجازؔ کے ان اشعار نے ان کے دل کو چھوا۔ ان کے شعور پر اثر انداز ہوئے لیکن پیروں میں تو زنجیریں تھیں، ان کا ٹوٹنا آسان نہ تھا۔

صبا اور گلستاں سے دامن کشیدہ
نوائے فسوں خیز اور ناشنیدہ
تجلیِ رخسار اور نادمیدہ

کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

سرِ رہ گزر چھپ چھپ کر گزرنا
خود اپنے ہی جذبات کا خون کرنا
حجابوں میں جینا حجابوں میں مرنا

کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

نگاہوں کی دعوت کو پامال کرنا
مذاقِ لطافت کو پامال کرنا
تقاضائے فطرت کو پامال کرنے

کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

(پردہ اور عصمت)

غرضیکہ ماؤں بہنوں کے خواب خواب ہی رہ گئے۔ انھیں کیا خبر تھی کہ یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوں گے۔ بہو کے لیے بنارسی پوت کے تھان، میراثنوں، ناؤنوں اور پرجوں کے لیے رنگ برنگے جوڑے بکسوں ہی میں بند رہ جائیں گے۔ انھیں تو گاہے امیدوں کے آسرے دھوپ مل جائے گی، لیکن بیٹے کی زندگی کا یہ افق ہمیشہ کے لیے ابر آلود رہے گا اور ماں کی سلیقہ شعاری محرومی اور مایوسی کا ہی شکار رہے گی۔ شاعر سے عقیدت ہو سکتی ہے، محبت بھی لیکن پیٹ کے لیے تو روٹی چاہیے۔ اشعار تو کافی نہیں، خواہ کتنے ہی دلنواز اور دلکش کیوں نہ ہوں۔

بی۔اے کرنے کے بعد اسرار بھائی نے شعبۂ اردو میں داخلہ لیا۔ ایم۔اے کے دو سال پورے بھی نہ ہوئے تھے کہ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن سے آواز کی سب اڈیٹری کی جگہ نکلی۔ کورس کی کتابوں سے سر مغزنی امتحانوں کی مصیبت، کلاس میں حاضریوں کی پابندی اس لاڈ و پیار میں پلی ہوئی، فطرتاً آزاد منش پیداوار پر گراں گزر رہی تھی۔ بزرگ بہی خواہوں نے بھی سوچا کہ مناسب موقع ہے، آگے ہاتھ لگے یا نہ لگے، بہتر ہے کہ فائدہ اٹھالیا جائے۔ درخواست دی، انٹرویو ہوا، انتخاب ہو گیا۔ بوریا بستر باندھ وفادار ملازم عاشق علی کے ہمراہ دہلی روانہ ہو گئے۔ یہ تھا وہ قدم جو انھیں اس اضطراب اور انتشار کی طرف لے جارہا تھا، جس کی رفاقت ان کی قسمت تھی۔

ماں باپ غریب سوچ رہے تھے کہ اب قدم سیدھے راستے پر ہیں۔ لڑکا اپنے پیروں پر ہے۔

ذرا جم جائے تو شادی کر دی جائے، بال بچوں اور گھر کی ذمہ داریاں خوابوں میں رہنے والے شاعر کو حقائق کا احساس دلا ہی دیں گے۔ کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ اس راستہ کی منزل وہ ہے جہاں تباہی اور بربادی ان کا انتظار کر رہی ہے۔

کچھ ہی دنوں بعد بخاری صاحب نے ریڈیو اسٹیشن کی باگ ڈور سنبھالی اور پنجابیوں اور غیر پنجابیوں کی سیاست نے زور پکڑنا شروع کیا۔ آغا اشرف اور اسرار بھائی دونوں ہی زد میں آگئے۔ آغا صاحب ہوشیار اور دنیادار آدمی تھے، بچ نکلے۔ اسرار بھائی غریب اس پالیٹکس کا شکار ہو گئے۔ ایسا تو ہونا ہی تھا۔ وہ تو نہ ٹولی بنانے کا گر جانتے تھے نہ ہی افسران کی خوشنودی کا۔ آغا صاحب کے پاس دونوں مجرب نسخہ تھے۔ اُن کی نوکری بحال رہی۔ اسرار بھائی کی ختم ہوئی۔ لیکن اس وقت ان میں دم خم تھا، جس کا اظہار ان اشعار میں ہوتا ہے:

رخصت اے دلی تری محفل سے جاتا ہوں میں
نوحہ گر جاتا ہوں میں نالہ بہ لب جاتا ہوں میں

یاد آئیں گے مجھے تیرے زمین و آسماں
رہ چکے ہیں میری جولا نگاہ تیرے بوستاں

کتنے رنگیں عہد و پیماں توڑ کر آیا تھا میں
دل نوازانِ چمن چھوڑ کر آیا تھا میں

ایک نشیمن میں نے چھوڑا ایک نشیمن چھٹ گیا
ساز بس چھیڑا ہی تھا میں نے کہ گلشن چھٹ گیا

دل میں سوزِ غم کی ایک دنیا لیے جاتا ہوں میں
آہ تیرے میکدے سے بے پیے جاتا ہوں میں

جاتے جاتے لیکن اک پیماں کیے جاتا ہوں میں
اپنے عزمِ سر فروشی کی قسم کھاتا ہوں میں

پھر تری بزم حسیں میں لوٹ کر آؤں گا میں
آؤں گا میں اور بانداز دگر آؤں گا میں

سر سے پا تک ایک خونیں راگ بن کر آؤں گا
لالہ زارِ رنگ و بو میں آگ بن کر آؤں گا
(دلّی سے واپسی)

وہ بے شک اس لالہ زار رنگ و بو میں واپس گئے لیکن وائے قسمت وہ آگ تو نہ بن سکے، ایسی آگ جو زندگی کی ناانصافیوں کو جلا کر خاک کر سکتی۔ ایسی تپش ان کے ہاتھ ضرور لگی جو اندر ہی اندر ان کو جھلساتی رہی اور جس نے بچپن کی اس شوخ و شریر اور جوانی کی اس پر کشش شخصیت کو دھیرے دھیرے راکھ بنا کر رکھ دیا۔

دلی کے اس قیام کے دوران اسرار بھائی نے ایک ایسی چوٹ کھائی جس کا بھرنا تو در کنار مرہم اور پھائے کی گنجائش بھی نہ تھی۔ اس زخم پر چوٹ پر چوٹ لگتی رہی اور ان کا پورا وجود ناسور بن کر رہ گیا۔

محبت کی بساط پر اسرار بھائی نے ہاتھ بڑھایا تو ایسے مہرے کی طرف جس کا حاصل کرنا ناممکنات میں سے تھا۔ ایک شوخ و شنگ، البیلی اور چنچل سی دوشیزہ۔ دلی کے ایک نامی گرامی ڈاکٹر، مہمِ آزادی میں گاندھی جی اور پنڈت جی کے قریبی ساتھی کی انتہائی لاڈلی لے پالک بیٹی لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک بھاری بھر کم شوہر کی ملکیت، جس کے نام غالباً وہ بچپن ہی سے کردی گئی تھی۔ وہ دور سے مسکراہٹوں سے نواز سکتی تھی، اداؤں سے لبھا سکتی تھی، شاعر کی واہ میں شریک ہو سکتی تھی لیکن اس کی آہ میں شرکت اُس کے بس سے باہر تھی۔ اس پاک و صاف محبت کی داستان میں محبوبہ کے دل پر کیا گزری، یہ تو میں نہیں جانتی۔ البتہ اتنا ضرور جانتی ہوں کہ جب تک یہ رشتہ سماج کی نگاہوں سے محفوظ رہا، دونوں ہی کے قدم بڑھتے رہے۔ شاعر محبت کے پھول قدموں پر بچھاتا رہا اور معاوضہ میں حسین اداؤں اور دلفریب مسکراہٹوں سے اپنے دل کو تسلی دیتا رہا۔ سودا مہنگا نہ تھا۔

میرا نغمہ باعثِ دلداریِ خوباں تو ہے
میرا نالہ خیر سے وجہِ نشاطِ جاں تو ہے

ایسا نہ تھا کہ شاعر اپنے انجام سے بے خبر تھا۔ پر دل سے مجبور تھا۔

وہ مجھ کو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی
میں اُس کو پوجتا ہوں اور اُس کو پا نہیں سکتا
یہ مجبوری سی مجبوری لاچاری سی لاچاری
کہ اُس کے گیت بھی جی کھول کر میں گا نہیں سکتا
زباں پر بے خودی میں نام اس کا آ ہی جاتا ہے
اگر پوچھے کوئی، یہ کون ہے؟ بتلا نہیں سکتا
حدیں کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے
کہ بن مجرم بنے پیغام بھی پہنچا نہیں سکتا
(مجبوریاں)

بُرا ہو سماج کا اس کی ٹیڑھی ترچھی نگاہوں کا۔ اس کی انگشت نمائی کا۔ شاعر کا نغمہ باعثِ دلداریِ خوباں بننے سے بھی رہ گیا۔ افواہیں پھیلیں، چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ کھیل بگڑ کر رہ گیا۔ بزرگوں اور بہی خواہوں کے کان کھڑے ہوئے۔ دیرینہ ادب نواز کرم فرما کے ایوان میں داخلہ پر پابندی لگ گئی۔ شاعر کی واہ خطرہ میں پڑی۔ دیدارِ یار سے محرومی ہاتھ لگی۔ اس کا

دل چکنا چور ہو گیا۔ اعصاب الجھ کر رہ گئے۔ قریب سے دیکھنے والوں نے دیکھا اس کا پورا وجود سلگ کر رہ گیا۔ آخر کار یہ لاوہ پھوٹ نکلا اور ۱۹۴۰ء میں نروس بریک ڈاؤن کا حملہ ہوا۔

محبت کی ناکامی انتہائی بھیانک انداز سے تماشہ دکھانے پر اُتارو ہو گئی۔ وہ ہستی جو ہر حال میں متانت اور سنجیدگی تھامے رہی تھی، جس نے لاکھ محرومیوں پر بھی منھ سے اُف نہ نکالا ہو، کسی بات پر بھی شکوہ شکایت نہ کیا ہو، جیسے بالکل پھوٹ رہی ہو، جیسے سارے بند ھن یکدم ٹوٹ گئے ہوں۔ ایک منٹ کی خاموشی گوارا نہ تھی۔ محبوبہ کا قرب نہیں تو ذکر ہی سہی والا معاملہ تھا۔ ٹیپ کا بند تھا وہ مجھے بہت چاہتی ہے۔ رقیب روسیاہ مجھے زہر دینا چاہتا ہے۔ ہر احتیاط ہر تحفظ کی ضرورت ہے وغیرہ وغیرہ۔ انجانا خوف ایسا کہ دارالسراج سے باہر قدم نکالنے پر آمادہ نہیں۔ اضطرابی کیفیت ایسی کہ نیند کی گولیاں بھی کارگر نہ ہوں۔ رات رات بھر چھت پر پاگرے میں ٹہلنا۔ خط پر خط لکھے جاتے۔ ایک آدھ خط کھول کر دیکھے گئے، اس میں جنسی تشنگی کا اظہار کچھ ایسے کھلے انداز میں کہ تہذیب میں ممنوع۔ ماں سپرد ڈاک کرنے سے بہتر سمجھتی تھیں کہ انھیں چوری چھپے نذر آتش کر دیا جائے۔ بیٹی اپنی ہو یا پرائی، وہ بھی شادی شدہ ان محبت ناموں پر توروک ضروری تھی۔ آج سوچتی ہوں کاش وہ خط جلائے نہ گئے ہوتے، شاید کیچڑ میں کچھ پھول اشعار کی صورت میں مل جاتے اور آہنگ جیسے اردو ادب کے سرمایے میں کچھ اضافہ ہو جاتا، جو دو چار خط کھولے گئے تھے، وہ بھی میری نظر سے دور رکھے گئے تھے۔ کنواری لڑکی کا دخل ایسے معاملات میں نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ صفیہ آپا بھوپال میں تھیں اور انصار بھائی جیل میں۔ ماں باپ کی سمجھ میں جو آ رہا تھا، کر رہے تھے۔

ماں باپ اپنا سب کچھ داؤں پر لگانے پر آمادہ۔ پر وہ ڈاکٹر کو دکھانے پر تیار نہیں، اسپتال جانے پر آمادہ نہیں۔ اس زمانہ میں اسپیشلسٹ قسم کے ڈاکٹر نایاب تھے۔ میڈیکل کالج میں ماہر اعصاب ایک پروفیسر تھے۔ اتفاق کہ ادب نواز تھے۔ یہاں مجاز کی شاعری کام آئی۔ وہ گھر آ کر گھنٹوں سٹنگ دینے پر آمادہ ہو گئے۔

غرضیکہ دوا کا اثر ہوا یا ماہر نفسیات کے سامنے دل ہلکا کرنے یا ماں باپ کی دعاؤں، سنبھل گئے اور کچھ دنوں کے لیے بڑی بہن کے ساتھ الموڑہ چلے گئے اور خدا خدا کر کے تندرست و توانا ہو کر واپس ہوئے اور اپنے کو سمیٹنے اور زندگی کو ڈھرے پر لانے کی کاوش میں لگ گئے۔

دوستوں نے قسمت آزمائی کے لیے بمبئی بلایا لیکن اس آزاد منش ہستی کو بمبئی کا فلمی ماحول کیوں کر راس آتا جہاں ان کی شاعری کو فلم کی بے سرپیر کی کہانی اور موسیقار کے ان سرتال

سے میل کھاتا تھا جو پیسے کو کھینچ سکیں۔ کچھ دن بمبئی انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں کام کیا۔ وہاں بھی جم نہ پائے، لکھنؤ واپس ہوئے۔ اسی دوران "نئے ادب" اور "پرچم" کی ادارت بھی کی۔ کچھ دنوں بعد ہارڈنگ لائبریری دلی میں اسسٹنٹ لائبریرین کی جگہ مل گئی۔ غالباً سوچا یہ کہ شاید کوئے جاناں کے قرب سے قرار آجائے۔ یہ بھی ایک خوش فہمی تھی۔

کسی آزاد پرندے کے پر کاٹ کر قفس میں بند کر دیا جائے۔۔ بے شک اس کی پرواز پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ بھلے وہ اڑ نہیں سکتا۔ پر پھڑپھڑاتا تو ضرور ہے اور بسا اوقات اپنے کو لہولہان کر لیتا ہے۔ اس لائبریری کی گھٹی گھٹی عمارت میں بیٹھ کر کتابوں کے اجراء اور واپسی کی تاریخوں کا حساب رکھتے ہوئے کچھ یہی کیفیت اسرار بھائی کی ہوتی ہو گی۔

اسی دوران ماں بہنوں نے سوچا کہ کسی صورت پیر میں بیڑی ڈال دی جائے۔ شاید زندگی کی ویرانگی میں کچھ کمی آجائے۔ صفیہ آپا کی ایک قریبی اور عزیز دوست تھیں طبیعتاً نیک شریف، سلیقہ شعار اور صفیہ آپا و سلمیٰ آپا کے توسط سے ادبی حلقہ کی قدرداں۔ شکل و صورت نہ حسینوں میں تھیں نہ بدصورتوں میں۔ اپنے گھر کے حالات سے کچھ بیزار تھیں۔ بہرحال نیت کا حال تو اللہ ہی جانے۔ اسرار بھائی کے ساتھ ہمدردی یا قدردانی۔ صفیہ آپا اور سلمیٰ آپا کی تجویز پر انھوں نے اسرار بھائی کا ہاتھ تھامنے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ میں بس اتنا جانتی ہوں کہ یہ دل کا سودا نہ تھا۔

اسرار بھائی دل کی بازی تو کب کی ہار چکے تھے۔ غالباً سوچا یہ کہ چلو اپنے کو عقل ہی کے حوالے کر دو۔ شاید اپنے سے چاہت اور قربت رکھنے والوں کی آسودگی ہی سے کچھ آسودگی مل جائے۔ بہرحال سمجھانے بجھانے پر راضی ہو گئے۔ بات اس منزل پر پہنچی کہ بردکھوے کے لیے اجمیر روانہ ہوئے۔ لاکھ سر پر ٹیڑھی ترچھی ٹوپی رکھی، استری شدہ شیروانی پہن کر جاذب نظر بننے کی کوشش کی۔ لیکن ہزار ڈیڑھ ہزار کمانے والے کالج کے پرنسپل کی نظر میں ڈیڑھ دو سو کمانے والے اسسٹنٹ لائبریرین کی کیا وقعت ہوتی۔ خالی ہاتھ ٹرخا دیے گئے۔ عورت کو آنچل سے پرچم بنانے کا خیال بھایا بہت تھا لیکن اس پر عمل بہت دشوار تھا۔ خصوصاً ایسی صورت میں جہاں جذبۂ عشق کا بہاؤ بھی نہ ہو۔ یہاں تو مسئلہ سمجھ بوجھ کا تھا سو صفیہ آپا کی اس نیک دل اور نیک نیت دوست نے گارجین کے فیصلہ کے سامنے سرِ جھکا ہی دیا اور خالی جیب شاعر الٹے پیر واپس کر دیا گیا۔ دل شکستہ دماغ پراگندہ، اُس نے دل کی آواز پر قدم اٹھایا۔ منہ کے بل گر پڑا۔ وجود پاش پاش ہو گیا۔ کسی صورت اپنے کو سمیٹ کر پھر کھڑا ہوا۔ عقل

پر بھروسہ کیا۔ تھم تھم کر رک رک کر احتیاط کے ساتھ اپنا ہاتھ بڑھایا۔ پھر بھی ٹھوکر کھا گیا۔ لگتا ہے یہ ٹھوکریں اُس کی قسمت بن چکی تھیں۔

اسرار بھائی کا ایک شعر ہے:

عشق ہی عشق ہے دنیا میری فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں

جانے فتنۂ عقل سے اس بیزار ہستی کو عقل کے سامنے سر جھکانے کی شرمندگی تھی یا زمانہ کی نا قدری کا غم اس پر دوسرا نروس بریک ڈاؤن کا حملہ ہوا۔ اب تو وہ خود ہی اپنی عظمت کے گیت گاتا تھا۔ شعراء کے شجرے تار کرتا تھا۔ غالب و اقبال کے ناموں کے بعد اپنا نام لکھتا تھا۔ انتھک بولتا رہتا تھا۔ پچھلی عمر کی خاموشی کے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ اسی دیوانگی کے دور میں بھی اپنی عظمت کے گیت ضرور گائے لیکن کسی کے خلاف کچھ نہ کہا۔ زمانہ سے شکایت رہی لیکن افراد سے نہیں۔ گھر والوں کی تیمارداری چاہنے والوں کی دلداری، قدرداں ڈاکٹر کی خیال داری نے جلدی ہی تھام لیا اور قابو میں آ گئے۔ چودھری محمد علی جن کو ہم لوگ چمرو ماموں کہتے تھے اُن کو اپنے ساتھ کچھ دنوں کے لیے ردولی لے گئے۔ اس وقت ہمارے وطن عزیز میں چمرو ماموں کی واحد ہستی ایسی تھی جو اسرار بھائی کی قدرداں تھی۔ ہم سب میں وہی اکیلے تھے جن کی نظر میں شراب نوشی زندگی کا گھناؤنا ترین گناہ نہ تھا۔ وہ خود بھی شغل کرتے تھے اور اس سلسلہ میں منافقت سے کام نہیں لیتے تھے چوں کہ ردولی کے تین بڑے تعلق داروں میں سے تھے اس لیے راندۂ درگاہ تو نہ تھے اندر اندر ان کے خلاف چہ مگوئیاں ہوتی رہتی تھیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ بھی اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوئے اس زمانہ میں انھوں نے جنسی مسائل پر ایک کتاب لکھی تھی۔ انتہائی روشن دماغ اور روشن خیال انسان تھے۔ اسرار بھائی تقریباً ایک مہینہ ان کے ساتھ رہے اور پوری طرح صحت یاب ہو کر لوٹے۔

باپ کا مشورہ ہوا کہ ملازمت کی بندش اور پابندی بس کا روگ نہیں پر کوئی ذریعہ معاش تو چاہیے ایل ایل بی کی کلاسیں جوائن کر لیں۔ داخلہ لے لیا لیکن گاڑی چل نہ پائی۔ قانونی گتھیاں سلجھانا بھلا ان کے بس کا روگ تھا۔

عزیزوں اور رشتہ داروں کا مشورہ تھا کہ ان کا علاج صرف شادی ہے۔ بیوی بچوں کا بوجھ ہی سمجھا سکے گا کہ روٹی روزی سے اہم ترین زندگی کا کوئی تقاضہ نہیں۔ اس کڑوی حقیقت کو حلق سے اتارنا ان کے لیے شاید ہی ممکن ہوتا۔ کون جانے زیادہ ہی چکنا چور ہو جاتے۔

باپ خاموش تھے ماں، پھر ہاتھ پیر مار رہی تھیں۔ لیکن اس نسخہ کو آزمایا جاتا تو کیوں کر وہی مجاز جو اس میدان میں آرزوؤں کا مرکز تھا اب کوڑا کرکٹ بن چکا تھا۔ جہاں بھی ماں ہاتھ پھیلاتیں جواب ملتا بڑے سے تو نہیں چھوٹے سے کرلو۔ غرضیکہ ایک طرف منہ توڑ جواب کا اندیشہ دوسری طرف بیٹے کی رضامندی حاصل کرنے کا مسئلہ آخر کو ماں بیچاری بھی ہمت ہار گئیں۔

ہماری ماں اپنے مائیکہ کی بہت ہی عزیز تھیں۔ ان کے ایک بھتیجے کو ایسا لگتا ہے اپنی پھوپھی پر رحم آیا ممکن ہے اسرار بھائی کی کچھ قدر بھی رکھتے ہوں سماجی و سیاسی شعور رکھتے تھے اور تعلیمی پیشہ سے وابستہ تھے۔ غرضیکہ جو بھی وجہ رہی ہو وہ اسرار بھائی سے اپنی بیٹی کا رشتہ کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ اب ماں کے سامنے مسئلہ تھا بیٹے کی رضا کا۔ وہ نہ ہاں میں جواب دیں نہ ناں میں۔ آخر ماں نے سختی اور غصہ کا سہارا لیا اور بولیں 'لڑکی فالتو تو نہیں ہے جو تمھارے سہارے بیٹھی رہے۔ ہمت کر کے بولے "آپ اس غریب کی قسمت پھوڑنے پر کیوں آمادہ ہیں۔ میں اپنے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں پاتا۔" سو یہ معاملہ یوں ختم ہوا۔

اسی نوعیت کا جواب وہ بہت پہلے صفیہ آپا کو دے چکے تھے لڑکی تیز طرار اونچے خاندان کی تھی اسمارٹ اس حد تک کہ اسے اپنی خواہش کے اظہار میں کوئی جھجک نہ ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لڑکیاں اپنی شادی کے ذکر پر شرما کر چہرہ سرخ کرلیتی تھیں۔ اسرار بھائی نے صفیہ آپا کو جواب دیا۔ صفیہ مجھے کاغذی پھولوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ جواب اس وقت تھا جب وہ دلی نہیں سدھارے تھے دل اپنے قبضہ میں تھا کسی کی بھینٹ نہیں چڑھا تھا۔ جو جواب انھوں نے اماں کو دیا اور جو صفیہ آپا کو دیا۔ نفسِ مضمون ایک ہی تھا لیکن جن حالات میں یہ جواب دیے گئے ان میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ پہلا جواب اس دور کا ہے جب وہ آسمان کی بلندی پر تھے، شہرت تھی، مقبولیت تھی، ہر طرف ان کی مانگ تھی دوسرا جواب اس وقت کا ہے جب وہ روندے جاچکے تھے۔ ان کی حیثیت ایک شرابی کی تھی جو در در سے ٹھکرایا جاچکا ہو جو جنسی تشنگی کا شکار ہو۔ اس کیفیت میں بھی انھوں نے عورت کے اس تصور ہی کو ترجیح دی جس کا پرتو ان کے اشعار پر ہے۔ عورت جو بے باک اور نڈر ہوتے بھی نسوانی دلکشی اور فکری پاکیزگی رکھتی ہے جس میں نسوانیت بھی ہے اور سیاسی و سماجی شعور بھی اور مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کی امنگ اور سکت بھی۔ ان کی یہ ترجیح ان کی شخصیت کے ایک قابل قدر پہلو پر روشنی ڈالتی ہے۔

افسوس میرے بھائی کو ایک ساتھی نہ مل سکا جو اس کا ہاتھ تھام لیتا اس کو سہارا دے سکتا رفاقت دے سکتا۔ رفاقت ملی تو ناعاقبت اندیش قدر دانوں کی اور ان کی مہیا کی ہوئی سستی شراب کی اور یہ ابھرتا ہوا ستارہ ڈوبتا ہی چلا گیا۔

اسرار بھائی کی محرومیاں بڑھتی گئیں۔ پریشانی و پشیمانی میں اضافہ ہوتا گیا۔ زندگی کی تلخی کو شراب کی تلخی میں ڈبوتے رہے ہر لعن طعن نصیحت فضیحت کو خاموشی سے سنتے رہے۔ ایک کرب کا عالم ایک انتشار کی کیفیت ایسا لگتا تھا جیسے زندگی ان کے پیچھے بھاگ رہی ہو اور وہ زندگی سے بھاگ رہے ہوں اس تگ و دو میں سہارا تھا تو صرف شراب کا اچھی ہو یا بری اس سے مطلب نہیں۔

مخلص اور چاہنے والے دوست سمجھانے کی کوشش کرتے وہ اپنے فطری ہنر سنجیدہ گفتگو کو غیر سنجیدہ بنانے سے کام لیتے دوسرے تو ہنس پڑتے بات ٹل جاتی ان کے لبوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ ہوتی کسی دوست نے کہا۔ شادی وادی کرلو بیوی تمھیں ٹھیک کردے گی بولے شادی تک تو ٹھیک ہے وادی اپنے بس کا روگ نہیں ایک بزرگ ساتھی ناصحانہ انداز میں بولے کوئی چھوٹی موٹی ملازمت کرلو وقت ہی کٹے گا ذریعہ معاش بھی تو ضروری ہے۔ بولے آپ کہتے تو صحیح ہیں زندگی میں بڑے جبر سہنے پڑتے ہیں۔ صلاح دینے والا بولا یہ تو زندگی کا قانون ہے پیٹ کو تو روٹی درکار ہے۔ بولے "ہم تو ترقی پسند ہیں قانون توڑنا ہمارا اصول ہے۔" غالباً ان پُر خلوص مشوروں کی اہمیت سے انھیں انکار نہ تھا روزانہ ہی صبح گھر میں یہ تماشہ دیکھنے کو ملتا تھا۔ برآمدہ میں ماں پلنگ پر بیٹھی افسردہ و غمگین ان کی رات کی کیفیت سے دل شکستہ۔ ان کو سمجھانے بجھانے میں مصروف اور وہ برآمدہ میں بالکل خاموش ایک طرف سے دوسری طرف ٹہلتے نظر آتے تھے بس چہرہ پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا جیسے جو کچھ سُن رہے ہوں اس کی صداقت اور اہمیت پر پورا اعتماد ہو لیکن عمل کرنے کے لیے بالکل بے بس۔

عام طور پر دن چڑھے سو کر اٹھتے۔ جانے سوتے کس وقت تھے۔ صبح کے ناشتہ اور دن کے کھانے کا ایک ہی وقت ہوتا۔ غذا دن بہ دن کم ہوتی جارہی تھی۔ جبڑوں میں سختی پیدا ہوگئی تھی۔ بمشکل شوربہ اور دال میں چاول ملا کر یا روٹی مسل کر تھوڑا بہت کھا لیتے تھے۔ کھاتے وقت سڑکنے کی آواز آتی تھی۔ دودھ پسند نہ تھا شاید یہ بھی احساس رہا ہو کہ باپ کی پنشن پر جتنا کم بار پڑے بہتر ہے۔

گھر میں ماشاء اللہ بچوں کی بہتات تھی۔ جاد و اویس تین بچے میرے بھانجے ابو کے اور دو عدد

میرے۔ کھاتے وقت چھوٹے بچے ان کے اردگرد ہوتے اگر ایک لقمہ اپنے منہ میں لیتے تو دوسرا ان بچوں میں سے کسی کے منہ میں جاتا۔ اور اس سلسلہ میں بچوں میں چھین جھپٹ ہوتی۔

بچوں کے ساتھ ان کی یہ دلچسپی ان کی آخری سانس تک برقرار رہی۔ گھر ہو یا باہر ہمیشہ بچوں کا جمگھٹا ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ کبھی دیکھنے میں آتا کہ ان بچوں میں سے کوئی آنگن میں لگے ہوئے نل کے نیچے نہا کر تولیہ یا کپڑوں کی تلاش میں برآمدہ کی طرف آرہا تھا اور اسرار بھائی پنکھا لیے اُس کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ بچہ بھیگے بدن پر ٹھنڈی ہوا لگنے سے چیخ رہا ہے کپکپا رہا ہے اور وہ ہنس رہے ہیں۔ مذاق اڑا رہے ہیں۔ باہر لان کے ایک کونے میں امرود کا درخت تھا فصل پر پھلوں سے لد جاتا تھا۔ نیچے کی شاخوں تک تو بچے خود اچھل کود کر پہنچ جاتے تھے خصوصاً جادو اولیس اوپر کی ٹہنی پر پہنچنے کے لیے انھیں بھی ماموں صاحب کی مدد درکار ہوتی تھی۔ کاندھے پر بٹھا کر انھیں چڑھا دیتے لیکن اتارنے میں آناکانی کرتے اور ان کے ڈر اور خوف سے لطف اٹھاتے۔ کبھی امرود خود توڑ کر بچوں کو بلاتے اور اپنے ہاتھ کو اونچے سے اونچا تر کرتے جاتے۔ اور بچے ان کے چاروں طرف اچھلتے نظر آتے۔ جیب میں جب بھی پیسے ہوتے تو چنے یا مونگ پھلی خریدتے اور تقسیم میں کس کو کم ملا یا کس کو زیادہ۔ چیخ و پکار سے کافی مزا اٹھاتے۔ بچوں میں بچہ بن کر انھیں کچھ لمحوں کے لیے زندگی کی تلخ حقائق سے مفر مل جاتا تھا۔

مشاعروں میں شعرا کو اس وقت پندرہ بیس روپے سے زیادہ کیا ملتے ہوں گے۔ اسرار بھائی دو ایک روپیہ چھوڑ کر یہ رقم اماں کے حوالے کر دیتے تھے۔ اور اسے اپنے تخت کے ایک کونے میں رکھی ہوئی لکڑی کی صندوقچی میں محفوظ کر لیتی تھیں اور ان پیسوں کا استعمال ان کی سگریٹ کی ڈبیوں پر کر لیتی تھیں۔ سہ پہر ہوتی نہا دھو کر باہر نکلنے کے لیے تیار ہوتے اور ماں صندوقچہ کھول کر ایک ڈبیہ اور کچھ پیسہ ان کے سپرد کرتیں۔ اس صندوقچہ کے کھلنے پر ایک انوکھی سی خوشبو نکلتی جیسے وہ اب تک میرے دماغ میں بسی ہو ماں کے عطر اور اسرار بھائی کے سگریٹ کی ملی جلی خوشبو۔

گھر کے اندر بیٹھی ہوئی ماں سگریٹ پر کنٹرول رکھ سکتی تھیں جیب خرچ کا راشن مقرر کر سکتی تھیں لیکن شراب پر قابو تو ان کے بس کا نہ تھا۔ بسا اوقات رات گئے مدہوشی کے عالم میں واپس ہوتے۔ اور ہمارے گھر کے دروازہ ان پر بند ہوتے۔ بھلا ہو ہماری اس وقت کی ذہنیت کا لعنت ان اقدار پر جو ہم سے چپکی ہوئی تھیں۔ ہماری نظر میں شراب پینے کے بعد خواہ کم یا

زیادہ انسان اور درندہ میں کوئی فرق نہ تھا۔ ہماری سوچ میں اس پاگل میں جو سڑک پر پتھر اٹھا اٹھا کر لوگوں پر پھینک رہا ہو اور اس حساس انسان میں جو اپنے درد کو شراب میں ڈبو رہا ہو کوئی فرق نہ تھا۔ پاگل تو قابل ہمدردی تھا قابل معافی تھا پر شرابی تو بہ توبہ خدا معاف کر دے تو کر دے بندہ معاف نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تھی ہم سب کی سوچ جو بدلی لیکن بہت دیر میں۔ جن اقدار کے سایہ میں ہم سب کی پرورش ہوئی تھی اس میں اس وقت اس احساس کی گنجائش نہ تھی کہ اس وقت اِس تھکے ہارے شرافت اور نیکی سے بھرپور انسان کے زخموں کا منھ کھلا ہوا ہے اسے مرہم کی ضرورت ہے اس کی بدحالی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ کوئی اس کو اپنے سینہ سے لگا لے اور اس کا درد بانٹ لے۔ نہ کہ اس پر یہ واضح کیا جائے کہ اس کا سایہ بھی آلودہ ہے اس سے دوری ہی میں نجات ہے۔ ستم ظریفی یہ کہ ہم سب انھیں بے حد چاہتے تھے۔ بے تحاشہ محبت کرتے تھے۔ ایک سینی میں کھانا پان اور رکشہ کی اٹھنی ان کے کمرہ میں رکھ دی جاتی تھی۔ ان کی تکیہ کے نیچے بلا ناغہ گیارہ پیسہ بھی رکھے جاتے تھے جو صبح کو نیاز پر خرچ ہوتے تھے۔ لیکن اس حالت میں ان کا قرب ہمارے لیے انتہائی خوفناک تصور تھا۔ وہ کچھ دیر برآمدہ میں مونڈھے پر بیٹھے رہتے کبھی کچھ گنگناتے کبھی دیواروں سے باتیں کرتے اِن آوازوں کو ہم سب اپنی چادروں اور رضائیوں میں لپٹے سکتے رہتے۔ جانے کب وہ سوتے اور کب ماں۔ باپ۔ آج کیسی پچھتاہٹ ہوتی ہے اپنی اِس سوچ پر اپنے اس رویہ پر کاش زندگی کے یہ صفحات پلٹ سکتے۔

صبح ہوتی پھر وہی نصیحت فضیحت کا سلسلہ ماں کے آنسو باپ کی اداس خاموشی اور ہم سب کے افسردہ چہرے ماں کے آنسو ان کے دل پر تیر بن کر لگتے ہوں گے باپ کی خاموشی نشتر بن کر چبھتی ہو گی لیکن جیسے کچھ ایسے الجھاوے میں پھنسے ہوں کہ جس سے نکلنے کے لیے تڑپ تو ہو لیکن سکت نہیں۔

غذا کم ہوتی گئی اور شراب کا زہر بڑھتا گیا چہرے کی تابانی پر اداسی کا پردہ گہرا تر ہوتا گیا۔ آنکھوں کی ذہین چمک پر اتھاہ گہرائی حاوی ہوتی گئی جس میں تمام آرزوئیں امیدیں اور مستقبل کے خواب دفن ہوں غرض یہ کہ بقول عصمت آپا کے "وہ بانکا نوجوان سہم سکڑ کر محض نکھٹو رہ گیا اور ایسا شرابی جسے پیتے وقت اس کا بھی ہوش نہ ہو کہ وہ کتنا پی رہا ہے کیسی اور کس کی پی رہا ہے" ہم لوگوں میں ہوتے ہوئے بھی جیسے ہم سے بہت دور ہوں۔ عدم و وجود برابر ہو۔

نروس بریک ڈاؤن کا تیسرا دورہ پڑا اور وہ بھی گھر کی پناہ گاہ سے دور دلی میں۔ یہ دورہ انتہائی

شدید تھا دلی کے گلی کوچوں میں خاک چھاننے کی خبریں مل رہی تھیں۔ ہر وقت اس خبر کا انتظار تھا کہ مجاز موٹر سے کچل گیا سڑک پر لتھڑا پایا گیا۔ انجام یہی ہونا تھا لیکن کچھ ٹھہر کر۔

سنتے تھے کہ جوش صاحب کو ان سے بہت محبت تھی بڑا لگاؤ تھا۔ ان کا خط آیا کہ اگر ہم لوگوں کو اعتراض نہ ہو تو مجاز کو پولیس کی مدد سے آگرہ پہنچا دیا جائے۔ جوش صاحب مرحوم کو اندازہ رہا ہوگا کہ آگرہ میں ذہنی مریضوں کے ساتھ کیا برتاؤ ہوتا ہے۔ سلاخوں کے پیچھے بند کر کے۔ ڈنڈوں سے ڈرا دھمکا کر ان کو قابو میں لایا جاتا ہے مجاز اور آگرہ کا پاگل خانہ ان کے چاہنے والوں کے لیے تصور ہی اذیت ناک تھا لیکن ہم لوگ تو ان کے اتے پتے سے بھی محروم تھے کہاں جائیں کیسے ڈھونڈھیں مسئلہ تھا۔ میں نے جوش صاحب کو دو خط لکھے وہ کسی صورت اسرار بھائی کو لکھنؤ پہنچانے کا انتظام کر دیں۔ ماں کی علالت کی خبر سن کر وہ جس حالت میں بھی ہوں گے لکھنؤ آنے پر آمادہ ہو جائیں گے اس کا ہمیں یقین تھا لیکن جوش صاحب نے ہمارے خطوں کا جواب دینا بھی ضروری نہ سمجھا۔ شاعر کی حیثیت سے جوش صاحب کا جو بھی رتبہ ہو انسان کی حیثیت سے وہ میری نظروں میں گر گئے۔

اس دوران صفیہ آپا بھی لکھنؤ پہنچ گئیں۔ ادبی حلقہ سے ان کا تعلق زیادہ تھا ان سے ہم سب کو بہت تقویت ملی۔ اس سلسلہ میں سہیل عظیم آبادی نے بھی بہت ساتھ دیا۔ رانچی کے اسپتال میں داخلہ کا انتظام کیا گیا۔ دوستوں نے سوچا کہ رانچی کا علاج بہت مہنگا ہے بوڑھے ماں باپ کیسے برداشت کر پائیں گے چندہ کی مہم چلائی گئی صفیہ آپا نے ان کے خلوص و خیال داری کا شکریہ ادا کیا اور اس مہم کو ترک کرنے پر اصرار کیا ماں باپ کی حمیت کیسے گوارا کرتی کہ ان کی منتوں مرادوں سے پلی ہوئی اولاد کا علاج چندہ سے ہو ہم سب نے اپنی سکت بھر اس بوجھ کو اٹھانے کا فیصلہ کیا اور اسرار بھائی ساڑھے تین مہینہ اسپتال رہے اور صحت یاب ہو کر واپس لوٹے۔

کچھ عرصہ بعد صفیہ آپا کا انتقال ہو گیا۔ اس جوان چہیتی اور چاہنے والی بہن کی موت نے جیسے الیکٹرک شاک کا کام کیا ہو۔ انھوں نے اپنی بچی کچی قوت کی پونجی کو پوری طرح اپنے کو سمیٹنے میں لگا دیا گھر سے باہر کم نکلتے۔ دن رات بچوں کے ساتھ کھیلنے اور جاد واویس کی دلداری میں لگے رہتے۔ جیسے وہ پھر سے بیس پچیس سال پہلے والے جگن بھیا بننے کی جان توڑ کوشش کر رہے ہوں کاش اس دوران انھیں کوئی سہارا مل گیا ہوتا۔ پر ایسا کیوں کر ہوتا ان کی موت کو تو ان کی زندگی کا نکتہ عروج بننا تھا۔ ان کو تو یہ دکھانا تھا کہ جیتے جی مرنا کس کو کہتے ہیں اور مر کر جینا کیوں کر ہوتا ہے۔

کچھ ہی عرصہ بعد پھر پرانے راستے کی طرف قدم اٹھ گیا۔ نادان ادب نوازوں نے بڑھاوا دیا اور قدم بڑھتا ہی چلا گیا۔ کسی طرح گرتے پڑتے جنس الفت کی طلب گار فتنۂ عقل سے بیزار ہستی کی زندگی گزرتی گئی۔ اور زندگی درد و داغ اور آرزو و جستجو کے ہم معنی ہو کر رہ گئی ایسا لگتا تھا کہ آرزوؤں کی محرومیوں اور جستجو کی ناکامیابیوں کے بعد صرف درد و داغ باقی رہ گیا ہو۔ آخر پانچ دسمبر ۱۹۵۵ کی ایک کڑکڑاتے جاڑے کی رات گھر آتے راستہ میں گرے اور ایسا گرے کہ پھر اُٹھ نہ سکے۔ ہوش کی حالت میں گرے یا مدہوشی کی حالت میں کوئی نہیں جانتا۔ کسی فرشتہ صفت راہگیر نے انھیں بلرام پور لاوارثوں کے وارڈ میں پہنچایا۔ کون تھا یہ نیک دل انجان انسان۔ اخباروں میں مجاز کی موت کی موٹے موٹے الفاظ میں سرخی کے باوجود اس کا پتہ نہ چل سکا۔ بھلے اسے ادب کی دنیا سے واقفیت نہ رہی ہو اخباروں سے بھی واسطہ نہ رہا ہو لیکن وہ ان چند اور نیک انسان دوست ہستیوں میں ضرور تھا، جس کے دل میں لاوارثوں کا وارث بننے کا جذبہ تھا۔ ورنہ ان چمکتے دمکتے شہروں سڑکوں پر جانے کتنی لاوارث لاشیں ملتی ہیں اور لوگ کترا کر اپنی راہ لگ لیتے ہیں کہ کون اس جھمیلے میں پڑے۔

اسے معجزہ سمجھا جائے یا اسرار بھائی کی شخصیت کی مقناطیسی کشش، ہماری ایک دور کی رشتہ دار خاتون کو اسپتال جانے کی ضرورت پیش آئی اور وہ ایمرجنسی کی طرف سے گزریں، جہاں حادثوں کی نذر لاوارث مریضوں کے حصہ میں زمین پر میرے بھائی کو پڑے پایا۔ کوما کی حالت تھی اس دنیا سے صرف سانس کا رشتہ باقی تھا۔ گھر اطلاع ہوئی خبر آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی۔ گنگا پرشاد میموریل ہال

حسنِ اتفاق نول کشور ہال میں ترقی پسند ادیبوں کا کنوینشن تھا۔ نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہن کر کمرہ کو قدرے سدھار کر میز پر رکھے ہوئے خالی گلدان میں پانی ڈال کر اور باہر کی کیاری کے چند پھول اس میں سجا کر اس کنوینشن میں شریک ہونے باہر نکلے تھے۔ سارے قدرداں دوست و ساتھی شہر میں موجود تھے۔ اسپتال میں ایک ہجوم جمع ہو گیا۔ ہر قیمت پر ڈاکٹروں سے اس عزیز ہستی کی جان بچانے کی منتیں ہوتی رہیں۔ پر موت کے سامنے کس کا بس چلا ہے۔ جس وقت انھوں نے آخری سانس لی ہے ان کے دوست ان کے ساتھی ان کے چاہنے والے سب ان کے ارد گرد تھے۔ اسپتال کے دروازوں پر قدردانوں کا مجمع تھا۔ وہ اس دنیا کو چھوڑتے وقت تنہا نہ تھے۔ وہ اپنی تنہائی کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

بوڑھی دکھیاری ماں اسپتال پہنچیں جگن جگن پکارتی بے ہوش بیٹے سے لپٹ گئیں۔ بمشکل

الگ کی گئیں اور گھر پہنچانے کا انتظام کیا گیا۔ جھوٹی تسلیوں کے لیے بھی کسی میں ہمت نہ تھی۔ آدھے راستہ پہنچی ہوں گی واپسی کے لیے ضد کی بولیں ایسا ممکن نہیں کہ وہ پکاریں اور ان کا جگن جواب نہ دے انھیں کون بتاتا کہ اس کا چہیتا بیٹا اس حد کو پار کر چکا ہے جہاں ماں کے آنسو اس کے دل پر تیر کی طرح لگتے تھے۔

غرض یہ کہ اسرار بھائی نے جس طرح بے شکوہ شکایت زندگی گزاری تھی اسی طرح خاموشی سے پانچ دسمبر ۱۹۵۵ کی شام اس دنیا سے رخصت بھی ہو گئے۔ علاج معالجہ کے دائرہ سے باہر تیمارداری کی ضرورت سے بے نیاز۔ یہ ہے میرے بھائی اور آپ کے شاعر مجاز کی زندگی کی کہانی۔ میں اپنے دوست ڈاکٹر منیب الرحمٰن کی نظم "شاعر کی موت" کے چند اشعار کے ساتھ اس کہانی کو ختم کرتی ہوں۔

وہ ایک پھول تھا سورج کو جو ترستا ہو
اسے ملی تھی شبانِ الم کی بیتابی
غموں کی زندہ دلی انجمن کی تنہائی
وہ چاہتا تھا جوئے سحر میں غسل کرے
سکھائے اپنے پرو بال نرم کرنوں میں
تجلیوں سے سنے نغمہ ہائے بیداری
سمیٹ لے شفقِ رنگ و نور آنکھوں میں
اسے مسل ہی دیا زندگی کے ہاتھوں نے

اب تک جو کچھ میں نے لکھا وہ اسرار بھائی سے وابستہ بزرگوں کی بتائی باتیں تھیں، میرے اپنے احساسات تھے میری اپنی یادیں تھیں۔ یوں بھی بہن بھائی کا درمیانی رشتہ قدرت کا ایک نادر تحفہ ہے لیکن ہندوستانی تہذیب اور رسم و رواج نے اس کو ایک خصوصی رنگینی اور رومانیت دے رکھی ہے۔ راکھی کے کچے دھاگے میں بہن کی کتنی آرزوئیں تمنائیں اور اُمیدیں پروئی ہوتی ہیں۔ یہ بہن اور قدرداں بھائی کا دل ہی جانتا ہے۔ آگے چل کر زندگی کے مسائل سب ہی کو الگ الگ راستوں پر ڈال دیتے ہیں۔ بہن بھائیوں کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے لیکن بیشتر آپسی لگاؤ اور محبت کی چنگاریاں بجھنے نہیں پاتیں بھلے ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دب ضرور جاتی ہیں۔ پر ان کی گرمی برقرار رہتی ہے اگر عمر میں فاصلہ کم ہو تو بچپن میں یہ تعلق چھیڑ چھاڑ، چھین جھپٹ اور مار پیٹ کی صورت اختیار کر تا رہتا ہے اور اگر عمر کا فاصلہ زیادہ ہوا تو سرپرستی اور رہبری اور ماڈل رول کا۔ اسرار بھائی میرے استاد اور سرپرست بھی

تھے اور باوجود درمیانی عمر کے لمبے فاصلہ کے بچپن میں میرے کھیل کود کے ساتھی بھی۔

میں نے حد بھر کوشش کی ہے کہ میرا قلم جانبداری سے باز رہے اور میں ان کی کمزوریوں اور خامیوں پر بھی انگلی رکھ سکوں۔ پھر بھی ممکن ہے میرے قلم سے لغزش پیدا ہوئی ہو یا میرے احساسات پر میرے جذبات غالب ہوگئے ہوں۔ لیکن اس کے لیے نہ ہی میں معافی مانگوں گی نہ ہی صفائی پیش کروں گی۔ میرے اس بھائی کے لیے تو غیروں نے بار کہا اور لکھا ہے کہ مجاز سے ہمدردی ہوتی ہے پر اس سے خفا ہونا اس پر غصہ کرنا ممکن نہ تھا۔

میں نے اسرار بھائی کی شخصیت کی جو تصویر پیش کی ہے وہ، وہ ہے، جو میری یاد اور میرے دماغ کی گہرائیوں میں محفوظ ہے۔ اب آیئے "آہنگ" کی ورق گردانی کر کے ان کی شخصیت کے خدوخال تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ شاعر کے کلام پر زندگی کی خوبصورتیوں و لطافتوں سے اس کی وابستگی اور بدہیتیوں اور ناانصافیوں سے اس کی بیزاری کا پرتو ہوتا ہے اس کے اشعار بلا رو رعایت اس کی حسین خوشیوں، مسرتوں اور محرومیوں کے محرکات اور ردعمل کی عکاسی کرتے ہیں اور اس کے حس اور شعور کے اہم پہلو اجاگر کرتے ہیں۔ اتنا واضح کرتی چلوں گی یہ کہ مقصد ان کے کلام میں ان کی پہچان کو ڈھونڈنا ہے سو میں نے ان اشعار کا سہارا لیا ہے جو میرے اس مقصد میں کام آسکیں۔ ان اشعار کی فنی اور شعری پرکھ ادب نواز نقاد جانیں اس سلسلہ میں 'میں اپنی نااہلی کا بارہا اعتراف کر چکی ہوں۔

سب سے پہلے ان کا تعارف ان کے اپنے الفاظ میں سنئے:

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں — جنسِ الفت کا طلبگار ہوں میں
عشق ہی عشق ہے دنیا میری — فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں
خوابِ عشرت میں ہیں اربابِ خرد — اور اک شاعرِ بیدار ہوں میں
چھیڑتی ہے جسے مضرابِ الم — سازِ فطرت کا وہی تار ہوں میں
عیب جو حافظ و خیام میں تھا — ہاں کچھ اس کا بھی گنہگار ہوں میں
زندگی کیا ہے گناہِ آدم — زندگی ہے تو گنہگار ہوں میں
کفر و الحاد سے نفرت ہے مجھے — اور مذہب سے بھی بیزار ہوں میں
اہلِ دنیا کے لیے ننگ سہی — رونقِ انجمنِ یار ہوں میں
حور و غلماں کا یہاں ذکر نہیں — نوعِ انساں کا پرستار ہوں میں

میری نظر میں ان کا تعارف اس سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے اپنی خوبیاں خامیاں سب

ہی کچھ آپ کے سامنے رکھ دی ہیں۔ شاید ہی ان کے جاننے والوں میں سے کوئی یہ کہہ سکے کہ مجاز کا اصلی روپ اس تصویر سے مختلف تھا جو ان اشعار میں جھلکتی ہے۔

دل و دماغ کی درمیانی کشمکش انسان کا مقدر ہے۔ بچپن پر دل کا قبضہ رہتا ہے اور بہت ہی حسین اور معصوم ہوتا ہے زندگی کا یہ دور، اس کی واپسی کی ناممکن تمنا اور اس کی یادیں ہی باقی رہ جاتی ہیں۔ بڑھاپا عام طور پر عقل کی گرفت میں آچکا ہوتا ہے اور سہما سہما تنہا تنہا سا رہ جاتا ہے۔ دل و دماغ کی کشمکش پورے جوش و خروش سے جوانی کی قسمت بنتی ہے۔ دل ایک طرف کھینچتا ہے تو دماغ دوسری طرف۔ شاید ہی چند ایسے نوجوان ہوں جو اس کشمکش کا شکار نہ ہوں۔ علامہ اقبال نے انتہائی خوبصورتی سے اس کشمکش کا اظہار اپنے اس شعر میں کیا ہے۔

لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑیئے

مصلحت اندیشی کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ اس مادیت پرست دنیا میں ہر لحہ عقل کو پاسبان بنا کر رکھا جائے۔ لیکن اس پاسبانی سے چھٹکارے میں بڑی لذت ہے پر اس لذت کی قیمت بھاری پڑتی ہے۔

اسرار بھائی کی زندگی میں یہ کشمکش تھی اور یقیناً بہت ہی شدت کے ساتھ۔ ان سے وابستہ ماں بہنوں کی امیدیں۔ سماج کی عائد کردہ پابندیاں، اپنے متوسط اور روایت پسند خاندانی ماحول کے مقرر کردہ معیار اور خود ساختہ بہی خواہوں 'نکتہ چینیوں سے محفوظ رہنے کی خواہش ضرور عقل کا پلہ بھاری کرتی ہوگی۔ لیکن ان کی فطرت کا رجحان تو جام و سبو اور جنون کی بلند حوصلگی کی طرف مائل تھا۔ ان کی دنیا تو عشق تھی زندگی کی خوبصورتیوں سے عشق، انسان کی انسانیت سے عشق۔ ان کی فطرت کے لیے ان تقاضوں کو کچل کر عقل کی پاسبانی کو قبول کرنا ممکن نہ تھا۔ وہ تا عمر فتنہ عقل سے بیزاری کا شکار رہے ان کی شخصیت سے اس پہلو کو غیر ذمہ داری، سہل پسندی اور ناعاقبت اندیشی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ان کی ان خامیوں نے ان کی ذات کو نقصان پہنچایا۔ انھوں نے خود اپنی کمزوریوں کا اعتراف کیا ہے۔ منافقت انھیں چھو کر نہیں گئی تھی۔ یہاں تک کہ بہ بانگِ دہل اس گناہ و کمزوری کا اعلان کیا ہے جو حافظ و خیام میں تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ انسان پرستی کا بھی اظہار ہے جسے وہ آخری دم تک سینہ سے لگائے رہے۔ اگر "گناہ" میں شدت پیدا ہوتی گئی تو ساتھ ہی ساتھ انسانیت کے لیے درد میں بھی اضافہ ہوتا گیا "خوابِ سحر" کے کچھ اشعار ہیں کیا یہ ان کی فطری بصیرت اور درد

مندی کی نشان دہی نہیں کرتے؟ گو کہ انھوں نے تاریخ، فلسفہ عمرانیات کی موٹی موٹی کتابوں میں سر نہیں کھپایا۔ سنئے

مہر صدیوں سے چمکتا ہی رہا افلاک پر
رات ہی طاری رہی انسان کی ادراک پر

اک نہ اک مذہب کی سعیِ خام بھی ہوتی رہی
اہلِ دل پر بارشِ الہام بھی ہوتی رہی

حکمراں دل پر رہے صدیوں تلک اصنام بھی
ابر رحمت بن کر چھایا دہر پر اسلام بھی

مسجدوں میں مولوی خطبے سناتے ہی رہے
مندروں میں برہمن اشلوک گاتے ہی رہے

آدمی منّت کشِ اربابِ عرفاں ہی رہا
دردِ انسانی مگر محرومِ درماں ہی رہا

اک نہ اک در پر جبینِ شوق گھستی ہی رہی
آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی

رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی
دین کے پردے میں جنگِ زرگری جاری رہی

یہ مسلسل آفتیں، یہ یورشیں، یہ قتلِ عام
آدمی کب تک رہے اوہامِ باطل کا غلام

ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں

کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے
(خوابِ سحر)

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکی ہوں اسرار بھائی کی کمسنی سکون و مسرت سے گزری طبیعت کے نیک تھے ذہین تھے زندہ دل تھے۔ ماں باپ کا لاڈو پیار تھا۔ استادوں کی محبت اور قدردانی تھی۔ ہم عمروں کی چاہت اور عقیدت تھی۔ عمر آگے بڑھی جوانی آئی عمر کا رومانی دور شروع ہوا۔ فطرت کے شاعرانہ رخ نے بھرپور انگڑائی لی۔ زندگی کی رنگینیوں اور سبزہ و گل کی دلفریبیوں نے انھیں اپنی جانب کچھ اس طرح سے کھینچا کہ جیسے ان کی پوری زندگی میں تلاطم سا پیدا ہو گیا ہو۔ ایک طوفان سا آگیا ہو۔ ایک ایسا بہاؤ جس کے تھپیڑوں پر انھیں اپنے کو چھوڑ کر سکون مل رہا ہو۔ اب ان کی دلچسپی درسی کتابوں کے سرد اور خشک اوراق سے بالکل ہی ختم ہو گئی ہو۔ ان کے اس بدلے ہوئے رجحان کی گواہی ان کے یہ اشعار دیتے ہیں۔

ہو نہیں سکتا تری اس ”خوش مذاقی“ کا جواب
شام کا دلکش سماں اور تیرے ہاتھوں میں کتاب
رکھ بھی دے اب اس کتابِ خشک کو بالائے طاق
اڑ رہا ہے رنگ و بو کی بزم میں تیرا مذاق
چھپ رہا ہے پردۂ مغرب میں مہرِ زر فشاں
دید کی قابل ہیں بادل میں شفق کی سرخیاں
دیکھ کر یہ شام کے نظارہ ہائے دل کشیں
کیا ترے دل میں ذرا بھی گدگدی ہوتی نہیں
کیا تری نظروں کو یہ رنگینیاں بھاتی نہیں
کیا ہوائے سرد تیرے دل کو تڑپاتی نہیں
سبزہ و گل دیکھ کر تجھ کو خوشی ہوتی نہیں
اف ترے احساس میں اتنی بھی رنگینی نہیں
حسنِ فطرت کی لطافت کا جو تو قائل نہیں
میں یہ کہتا ہوں تجھے جینے کا حق حاصل نہیں
(ایک دوست کی ”خوش مذاقی“ پر)

یہ دور تھا اسرار بھائی کے آگرہ کے قیام کا۔ اب ان کا مشغلہ تھا دن بتانا فطرت کی رنگینیوں میں اور راتیں بتانا شعر و شاعری کی محفلوں میں۔ جانے حسیناؤں کی محفلوں میں رسائی کی سکت تھی یا نہیں۔ بہر حال کالج کی پڑھائی سے قطعی دل برداشتہ تھے۔ لشتم پشتم انٹر میڈیٹ پاس کیا اور علی گڑھ بلا لیے گئے۔

بچپن چھوڑ علی گڑھ کا قیام اسرار بھائی کی زندگی کا خوشگوار ترین دور رہا۔ صلاحیت شناس ماحول ملا۔ ادب نواز ساتھی اور استاد ملے۔ ملک کی سیاسی تگ و دو نے علی گڑھ کو بھی متاثر کر رکھا تھا۔ سیاسی و سماجی شعور ابھر کر اپنی راہیں تلاش کر رہا تھا۔ اسرار بھائی کی فطری رومانیت نے آہستہ آہستہ انقلابی رومانیت کا روپ ڈھال لیا۔ مثلاً "طفلی کے خواب" کے چند اشعار ہیں۔

طفلی میں آرزو تھی کسی دل میں ہم بھی ہوں
اک روز سوز و ساز کی محفل میں ہم بھی ہوں
گائیں ترانے دوشِ ثریا پہ رکھ کے سر
تاروں سے چھیڑ ہو، مہ کامل میں ہم بھی ہوں
آزاد ہو کے کش مکشِ علم سے کبھی
آشفتگانِ عشق کی منزل میں ہم بھی ہوں

آرزو کی منزلِ آخر حسن و عشق نہیں بلکہ زندگی کا ناانصافیوں کے خلاف جنگ میں شرکت اور فتحیابی ہے۔

صحرا ہو، خار زار ہو، وادی ہو، آگ ہو
اک دن انھیں مہیب منازل میں ہم بھی ہوں
اک لشکرِ عظیم ہو مصروف کارزار
لشکر کے پیش پیش مقابل میں ہم بھی ہوں
چمکے ہمارے ہاتھ میں بھی تیغ آب دار
ہنگامِ جنگ نرغۂ باطل میں ہم بھی ہوں

قدموں پہ جن کے تاج ہیں اقلیم دہر کے
ان چند کشتگانِ غمِ دل میں ہم بھی ہوں

(طفلی کے خواب)

یہ وہ دور تھا جب ہندوستانی نوجوان ان راہوں کی تلاش میں تھا جو انسان پر انسانیت کے دروازے کھول دیں اور ہر خاص و عام کے بہتر مستقبل کی ضامن ہوں۔ وہ ایک ایسے نظام کی تعمیر کی شرکت کے لیے بے چین تھا جس میں غربت نہ ہو بھوک نہ ہو ذات پات اور مذہب کا بھید بھاؤ نہ ہو۔ اسرار بھائی کی زندگی کی بد نمائیوں سے ٹکرا اٹھنے والی فطرت کو اس ماحول نے

جلادی۔ اور شاعر محفلِ وفا و مطرب بزمِ دلبراں نوجوانوں سے یوں مخاطب ہوا۔

جلالِ آتش و برق و سحاب پیدا کر
اجل بھی کانپ اٹھے وہ شباب پیدا کر
ترے خرام میں ہے زلزلوں کا راز نہاں
ہر ایک گام پر اک انقلاب پیدا کر
صدائے تیشۂ مزدور ہے ترا نغمہ
تو سنگ و خشت سے چنگ و رباب پیدا کر
بہت لطیف ہے اے دوست تیغ کا بوسہ
یہی ہے جانِ جہاں اس میں آب پیدا کر
ترا شباب امانت ہے ساری دنیا کی
تُو خود خار زارِ جہاں میں گلاب پیدا کر
گرادے قصر تمدن کہ اک فریب ہے یہ
اٹھادے رسمِ محبت، عذاب پیدا کر
بہے زمیں پہ جو میرا لہو تو غم مت کر
اسی زمین سے مہکتے گلاب پیدا کر

تُو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر
(نوجوان سے)

مجھے اس سے انکار نہیں کہ اسرار بھائی ذاتی طور پر تساہل پسند تھے۔ اس انقلاب کو قریب تر لانے کے لیے جس ریاضت اور محنت کی ضرورت تھی وہ ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ کمیونس میں بیٹھ کر انھوں نے مارکس اور لینن کی کتابوں کی ورق گردانی میں راتیں نہیں بتائیں۔ لال جھنڈا لے کر جلوسوں میں شریک نہیں ہوئے لیکن کیا ان کی نظمیں انقلاب' سرمایہ داری وغیرہ اس کا ثبوت نہیں کہ ان کا دل معاشرہ اور نظام کی بے انصافیوں کے خلاف مضطرب اور بے چین تھا۔ اگر ان کے اشعار میں جذبہ کی صداقت نہ ہوتی تو وہ بے اثر ہوتے۔

چھوڑ دے مطرب بس اب للہ پیچھا چھوڑ دے
کام کا یہ وقت ہے کچھ کام کرنے دے مجھے

تیری تانوں میں ہے ظالم کس قیامت کا اثر
بجلیاں سی گر رہی ہیں خرمنِ ادراک پر
یہ خیال آتا ہے رہ رہ کر دلِ بے تاب میں
بہہ نہ جاؤں پھر ترے نغمات کے سیلاب میں
چھوڑ کر آیا ہوں کس مشکل سے میں جام و سبو!
آہ کس دل سے کیا ہے میں نے خونِ آرزو

آگے کہتے ہیں:

مجھ کو تیرے سحرِ موسیقی سے کب انکار ہے
مجھ کو تیرے لحنِ داؤدی سے کب انکار ہے
بزمِ ہستی کا مگر کیا رنگ ہے یہ بھی تو دیکھ
ہر زباں پر اب صلائے جنگ ہے یہ بھی تو دیکھ
فرشِ گیتی سے سکوں اب مائلِ پرواز ہے
ابر کے پردوں میں سازِ جنگ کی آواز ہے

اس پیش آنے والی جنگ کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ اس کی تباہ کاری اور خونریزی انتہائی بھیانک ہے اور خوفناک۔ لیکن نظم کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے۔

اور اس رنگِ شفق میں باہزاراں آب و تاب
جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب
(انقلاب)

سوچ کا یہی رجحان ان کی نظم ''سرمایہ داری'' میں پوری آب و تاب کے ساتھ جھلکتا ہے۔

کلیجہ پھنک رہا ہے اور زبان کہنے سے عاری ہے
بتاؤں کیا تمھیں کیا چیز یہ سرمایہ داری ہے

یہ وہ آندھی ہے جس کی رو میں مفلس کا نشیمن ہے
یہ وہ بجلی ہے جس کی زد میں ہر دہقاں کا خرمن ہے

یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس لیتی ہے
مگر مزدور کے تن سے لہو تک چوس لیتی ہے

یہ انسانی بلا خود خونِ انسانی کی گاہک ہے
وبا سے بڑھ کر مہلک، موت سے بڑھ کر بھیانک ہے

یہ غیرت چھین لیتی ہے حمیت چھین لیتی ہے
یہ انسانوں سے انسانوں کی فطرت چھین لیتی ہے

یہ آشوب ہلاکت فتنۂ اسکندر و دارا
زمین کے دیوتاؤں کی کنیز انجمن آرا

ہمیشہ خون پی کر ہڈیوں کے رتھ میں چلتی ہے
زمانہ چیخ اٹھتا ہے یہ جب پہلو بدلتی ہے

گرجتی گونجتی یہ آج بھی میداں میں آتی ہے
مگر بدمست ہے ہر ہر قدم پر لڑکھڑاتی ہے

مبارک دوستو لبریز ہے اب اِس کا پیمانہ
اٹھاؤ آندھیاں کمزور ہے بنیادِ کاشانہ
(سرمایہ داری)

آج کل کے حالات یقیناً شاعر کی پیش گوئی کی تصدیق کرتے ہیں۔ پیمانہ لبریز نظر آتا ہے لیکن آندھیوں میں زور پیدا کرنے والی ہستیاں دور دور نظر نہیں آتیں۔ جیسے ذاتی مفاد کی تگ ودو میں اجتماعی مفاد کا تصور خواب سا بن کر رہ گیا ہو۔ تاریخ گواہ ہے تخریب کے ساتھ ساتھ تعمیر بھی وابستہ ہوتی ہے۔ وقت شاعر کے خوابوں کی تعبیر کا منتظر ہے۔

اسرار بھائی کی زندگی کا یہ روشن دور دیرپا نہ ثابت ہوا۔ رسالہ ''آواز'' کی ملازمت کی کشش نے انھیں دلی کی طرف کھینچا۔ عقل کی آواز پر چلنا اس آزاد فطرت رند اور حسن پرست انسان کو کیوں کر راس آتا۔ ملازمت کا ابتدائی حصّہ تو خیریت سے گزر گیا۔ کچھ دنوں بعد ملازمت بھی خطرہ میں پڑ گئی۔ اس دوران عشق کی بساط پر ایسی مات کھائی کہ پوچھیے نہیں۔ گہری سے گہری چوٹ، بڑی سے بڑی پریشانی انسان امید کے سہارے جھیل جاتا ہے لیکن یہاں تو موہوم سی امید کا سہارا بھی نہ تھا۔ جس مہرہ کی طرف ہاتھ بڑھایا وہ تو پہلے ہی سے کسی کے قبضہ میں تھا۔ وصال کے خواب وخیال سے بھی محرومی تھی، محبت کی یہ آگ دو طرفہ تھی یا یک طرفہ مجھے نہیں معلوم، البتہ اتنا جانتی ہوں کہ ان شعلوں کو ہوا ضرور ملی۔ اور

شعلوں کی تپش میں جس نے میرے بھائی کو جلا کر راکھ کر دیا اضافہ ہوتا ہی گیا ایسا درد ایسا زخم ہاتھ لگا جس کا علاج نہ ان کے بس میں تھا نہ کسی دوسرے کے۔ ایسی حالت میں دل و دماغ کے سکون کا کیا سوال۔ محبت تادم پیاسی رہی۔ لیکن بقول خلیل الرحمٰن اعظمی بربادِ نگار اس دل آراء اور رسوائے مے ومینا ہو کر بھی مجاز کے اندر کا انسان اپنی فطری معصومیت بے پناہ خلوص والہانہ سرشاری کی سرمستی اور کجکلاہی کو آخری دم تک برقرار رکھ سکا۔"

اس دل سوز تجربہ کے بعد بھی ان کے لہجہ میں کسی قسم کی تلخی نہیں پیدا ہوئی۔ ان کے رجحان کی رجائیت میں بال برابر فرق نہ آیا۔

میں ہوں مجازؔ آج بھی زمزمہ سنج و نغمہ خواں
شاعرِ محفلِ وفا، مطربِ بزمِ دلبراں!
آج بھی خارزارِ غم خلدِ بریں مرے لیے
آج بھی رہ گزارِ عشق میرے لیے ہے کہکشاں
آج بھی گا رہا ہوں میں سازِ جنوں لیے ہوئے
سوزِ نہاں سے آج بھی روح تپاں ہے دل تپاں
آج بھی ہے لکھی ہوئی سرخ حروف میں مجاز
دفترِ شہرِ یار میں میرے جنوں کی داستاں
(آج بھی)

ٹوٹ گئے بکھر گئے لیکن دل کی کشادگی میں ضرب نہ آنے دی۔ محبوب تو الگ رہا اس پر پابندی اور بندشیں لگانے والوں کے خلاف بھی ایک لفظ شکوہ شکایت کا نہ نکالا۔ اگر شکایت کی تو نظام زنگ آلودہ کی جوان پاسبانوں کی مجبوری تھی۔

مجھے شکوہ نہیں دنیا کی ان زہرہ جبینوں سے
ہوئی جن سے نہ میرے شوق رسوا کی پذیرائی
مجھے شکوہ نہیں ان پاک باطن نکتہ چینوں سے
لبِ معجز نمانے جن کے مجھ پر آگ برسائی
مجھے شکوہ نہیں تہذیب کے ان پاسبانوں سے
نہ لینے دی جنھوں نے فطرتِ شاعر کو انگڑائی

مجھے شکوہ نہیں افتادگانِ عیش و عشرت سے
وہ جن کو میرے حالِ زار پر اکثر ہنسی آئی
زمانے کے نظامِ زنگ آلودہ سے شکوہ ہے
قوانینِ کہن آئینِ فرسودہ سے شکوہ ہے
(شکوہ مختصر)

چوٹ پہ چوٹ کھاتے گئے۔ زندگی کی بد نظمی بڑھتی گئی شراب نوشی میں اضافہ ہوتا گیا۔ جسمانی صحت گرتی گئی۔ لیکن سوچ اور شعور کی صحت مندی اپنی جگہ برقرار رہی۔ انسانیت کی عظمت میں ان کا ایمان مضبوط تر ہوتا گیا۔

بغاوت کا علمبردار ہوں محشر بداماں ہوں
فرشتوں نے جسے سجدے کئے ہیں میں وہ انساں ہوں
بڑھا ہوں جب بھی میدان میں بغاوت کا علم کھولے
فرشتے نے اجل کے آسماں پر ہنس کے پَر تولے
جنوں کے راگ گاتا ہوں لہو کے اشک روتا ہوں
ہمیشہ کشتگانِ غم کی پہلی صف میں ہوتا ہوں
نظر آنے لگیں ہیں پھر مرے خوابوں کی تعبیریں
میرے پائے جنوں پر لوٹتی پھرتی ہیں تقدیریں
(آہنگ جنوں)

کشتگانِ غم کی پہلی صف میں ہونے کے باوجود ان کی سوچ کی صحت مندی میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔ عورت کی وہ تصویر جو ان کے اشعار کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے شعور کی اس صحت مندی کی دلیل ہے۔ ہر صاحبِ ذوق نقاد نے اشارہ کیا ہے کہ عورت کا وہ تصوّر جو اُن کے کلام میں ملتا ہے اپنی جگہ نادر ہے اور اُردو شاعری میں نایاب اور انوکھا ہے۔ اسرار بھائی کی نظم ""نمائش میں"" میں عورت کا روپ ایک ایسی الہڑ البیلی دوشیزہ کا ہے جو مہکتی اور چہکتی ہوئی ہے۔ زندگی کے اونچ نیچ سے بے خبر۔ صنف مخالف کی نگاہوں کے اشاروں اور معنی مطلب سے بے نیاز ہے۔ شاعر کے لیے اس کی معصومیت میں ہی اس کی دلکشی ہے۔

وہ کچھ دوشیزگانِ ناز پرور کھڑی ہیں اک بساطی کی دُکاں پر
نظر کے سامنے ہے ایک محشر اور اک محشر ہے میرے دل کے اندر
سنہرا کام رنگیں ساریوں پر بساطِ آسماں پر ماہ و اختر
جمال و حسن کے پر رعب تیور نمایاں چاند سی پیشانیوں پر
وہ جنبش سی ہوئی کچھ آنچلوں کو وہ لہریں سی اٹھیں کچھ ساریوں پر
خرامِ ناز سے فتنے جگاتی وہ چل دیں ایک جانب مسکرا کر
کسی کی حسرتیں پامال کرتی کسی کی حسرتیں ہمراہ لے کر

آگے چل کر بے خبر اور معصوم دوشیزہ کے دل میں بھی جوانی کے جذبات ابھرتے ہیں اور وہ پریشاں اور حیراں ہے اپنی اس تبدیلی پر۔ پر اس گھبراہٹ میں بھی حیا کا دامن اس سے نہیں چھوٹتا۔ ان کی نظم ”ان کا جشنِ سالگرہ“ کے چند اشعار سنئے۔

اک مجمعِ رنگیں میں وہ گھبرائی ہوئی سی
بیٹھی ہے عجب ناز سے شرمائی ہوئی سی
آنکھوں میں حیا لب پہ ہنسی آئی ہوئی سی

ہونٹوں پہ فدا روحِ بہارِ گل و نسریں
آنکھوں کی چمک رشکِ بزمِ مہ و پرویں
پیراہنِ زر تار میں اک پیکرِ سیمیں

فطرت نئے جذبات کے در کھول رہی ہے
میزانِ جوانی میں اسے تول رہی ہے
لب ساکت و صامت ہیں، نظر بول رہی ہے

سرشار نگاہوں میں حیا جھوم رہی ہے
ہیں رقص میں افلاک زمیں گھوم رہی ہے
شاعر کی وفا بڑھ کر قدم چوم رہی ہے

عورت کا یہ دلربا اور دل کو موہ لینے والا پیکر حسن پرست شاعر کے دل میں کوئی کھوٹ نہیں پیدا کرتا۔ ان جذبات کو نہیں ابھارتا جو حسن پر داغ کی پرچھائیں ڈالیں۔ اس کے دل میں حسن کا احترام ہے، عزت ہے اور وہ اپنی نظم کو ان دعاؤں پر ختم کرتا ہے۔

اے تُو کہ ترے دم سے مری زمزمہ خوانی
ہو تجھ کو مبارک یہ تری نور جہانی
افکار سے محفوظ رہے تیری جوانی

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ

عورت شاعر کے دِل پر ایسے گہرے زخم کا باعث بنی جو ناسور بن کر رستا عمر پر ستار رہا۔ اس کی جسمانی صحت گرتی گئی لیکن اس کی سوچ اور شعور کی توانائی میں فرق نہ آیا۔ وہ عورت سے اپنی نظم "پردہ و عصمت" میں پکار پکار کہتا رہا۔

جو ظاہر نہ ہو وہ لطافت نہیں ہے
جو پنہاں رہے وہ صداقت نہیں ہے
یہ فطرت نہیں ہے مشیت نہیں ہے
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

نگاہوں کی دعوت کو پامال کرنا
مذاقِ لطافت کو پامال کرنا
تقاضائے فطرت کو پامال کرنا
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

قسم شوخیِ عشق نجو گُتا کی
قسم جون کے عزم صبر آزما کی
قسم طاہرہ کی قسم خالدہ کی
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

اسی نرمی اور شائستگی کے ساتھ وہ عورت کو اپنی شناخت کی راہ میں حائل ہونے والی سماجی بندشوں سے بھی رہائی کی ترغیب دیتا ہے وہ نوجوان خاتون سے مخاطب ہوتا ہے:

حجاب فتنہ پرور اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
خود اپنے حسن کو پردا بنالیتی تو اچھا تھا

تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا

اگر خلوت میں تو نے سر اٹھایا بھی تو کیا حاصل؟
بھری محفل میں آکر سر اٹھالیتی تو اچھا تھا

تیرے ماتھے کا ٹیکا مرد کی قسمت کا تارہ ہے
اگر تو سازِ بیداری اٹھالیتی تو اچھا تھا

عیاں ہیں دشمنوں کے خنجروں پر خون کے دھبّے
انھیں تو رنگِ عارض سے ملا لیتی تو اچھا تھا

سِنانیں کھینچ لی ہیں سر پھرے باغی نوجوانوں نے
تو سامانِ جراحت اب اٹھالیتی تو اچھا تھا

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا
(نوجوان خاتون سے)

عورت کا یہ تصوّر اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا شاعر کی نظم "کس سے محبت ہے" میں مکمل صورت اختیار کرتا ہے۔ یہ تصور اس عورت کا نہیں جو آسمان سے اتری ہوئی حور یا پرستان کی پری جو خوابوں میں آتی ہو اور آنکھ کھلتے ہی غائب ہو جائے۔ یہ وہ بے زبان سجائی گوشت و پوست کی گڑیا بھی نہیں جس کا مقصدِ حیات صرف صنفِ مخالف کی جنسی تسکین ہو یہ عورت حسین بھی ہے اور بے باک بھی۔ پاکیزہ اور معصوم بھی ہے اور بہادر اور سرکش بھی۔ یہ اس دنیا کی عورت ہے جس کی اپنی پہچان ہے اپنی شناخت ہے۔ اور مرد کے شانہ بشانہ چلنے کی سکت ہے۔

بتاؤں کیا تجھے اے ہم نشیں کس سے محبت ہے؟
میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے
سراپا رنگ و بو ہے پیکرِ حسن و لطافت ہے

بہشتِ گوش ہوتی ہیں گہر افشانیاں اُس کی

وہ اک مضراب ہے اور چھیڑ سکتی ہے رگِ جاں کو
وہ چنگاری ہے لیکن پھونک سکتی ہے گلستاں کو
وہ بجلی ہے جلا سکتی ہے ساری بزمِ امکاں کو
ابھی میرے ہی دل تک ہیں شرر سامانیاں اُس کی

لب لعلیں پہ لاکھا ہے نہ رخساروں پہ غازہ ہے
جبینِ نور افشاں پر نہ جھومر ہے نہ ٹیکا ہے
جوانی ہے سہاگ اس کا تبسم اس کا گہنا ہے
نہیں آلودۂ ظلمت سحر دامانیاں اس کی

شاعر کے تصور کی یہ عورت تھی جس کے عزم اور ہمت کو اس نے اس طرح للکارا۔

آؤ مل کر انقلابِ تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھاجائیں کہ سب دیکھا کریں

یہ فاتحانہ سرکشی دہر پر چھاجانے کا عزم ساتھ ہی ساتھ غمِ جاناں اور غمِ دوراں۔ کیسی بے چینی اور کتنی اضطرابی کیفیت رہی ہوگی اس حساس انسان کے دل و دماغ کی جو فطرت کی طرف سے مجاہدہ اور قوتِ ارادی کی اس مضبوطی سے محروم تھا جو اس کے لیے آہنی سپر کا کام دیتی آخر کو تھک گیا اور ٹوٹ گیا وہ انسان - اور چیخ پڑا۔

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارا پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پر آوارہ پھروں
غیروں کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے عاشق کا حال
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

ایک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملّا کا عمامہ، جیسے بنیئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اُس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا، سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطانِ جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا، میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں
(آوارہ)

اس اضطرابی کیفیت، اس انتشار اور بے چینی کے باوجود ان کا مٹنے اور مٹانے کا حوصلہ کمزور نہ پڑا جنونِ تعمیر میں کمی نہ ہوئی۔

بات کیا ہے زیاں کا کوئی احساس نہیں
کار فرما ہے کوئی تازہ جنونِ تعمیر
دلِ مضطر ابھی آما جگہ یاس نہیں

آخر انسان تھے، وہ بھی لاڈ و پیار میں پلے ہوئے۔ حساس اور غیرت مند، قوت برداشت کب تک ساتھ دیتی یہ صدا نکل ہی گئی۔

یاس کا دھواں اٹھا نوائے خستہ سے
آہ کی صدا نکلی بربطِ شکستہ سے

اس دھویں اور آہ کو بھی اندر ہی اندر دباتے رہے آخر کو ٹوٹ گئے۔

کیا سنو گی میری مجروح جوانی کی پکار
میری فریاد جگر دوز میرا نالہ زار
شدتِ کرب میں ڈوبی ہوئی میری گفتار
میں کہ خود اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار

ٹوٹ گئے تھک گئے لیکن زندگی کے روشن مستقبل کو ہاتھ میں تھامے رکھا۔

اب اس کے بعد صبح ہے صبحِ نو مجاز
ہم پر ہے ختم شامِ غریباں لکھنو

میری یاد میں اپنی بھائی کی جو تصویر ہے وہ ایک ایسی ہستی کی ہے جس میں خلوص کی لطافت تھی، احساس کی نزاکت تھی۔ جو خود غرضی اور خود پرستی کی آلودگیوں سے پاک آئینہ کی طرح صاف ستھری تھی جو سب سے محبت کرتی تھی اور سب کی محبت چاہتی تھی۔ جس کی فطرت میں حسن پرستی تھی اور جذبات کی بلند حوصلگی تھی۔ جس نے آواز دی:

دیکھ شمشیر ہے یہ ساز ہے یہ جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھالے تو بڑا کام ہے یہ

لیکن جس میں خود شمشیر اٹھاکر زندگی کی بدہیئتیوں کا سر قلم کرنے کی وہ سکت نہ تھی جو محنت و مشقت کی دین ہوتی ہے۔ وہ شاعر تھا حسین خواب دیکھنے اور دکھانے والا، ادیبوں اور ناقدوں نے اعتراف کیا ہے کہ اس نے اپنے اشعار کو جذبہ کی وہ شدت اور صداقت کی وہ توانائی دی جو ہر دل پر اثر کر جاتی ہے، کیا اتنا کافی نہیں؟

یہ ہیں اسرار بھائی کی شخصیت کے وہ نقش و نگار جو میری یادوں میں محفوظ ہیں۔ ان میں اور آہنگ کی ورق گردانی کے بعد جو خدو خال آپ کے ذہن میں ابھرتے ہیں اُن میں کتنی موافقت ہے اور کتنا تضاد، یہ فیصلہ آپ کا ہے۔ میں تو صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ مجھے اپنی یادیں بہت ہی عزیز ہیں اور بہت ہی قیمتی اور بہت ہی پیاری۔

انصار الحق ہروانی

ہم پانچ بہن بھائی تھے، جن میں سے تین کو دنیا سے منھ موڑے کئی دہائیاں گزر گئیں۔ رہ گئے تھے ہم دو بھائی بہن، انصار بھائی اور میں۔ انصار بھائی، اسرار بھائی (مجاز) سے لگ بھگ دو سال چھوٹے تھے اور اتنا ہی صفیہ آپا (صفیہ جان نثار اختر) سے بڑے۔ البتہ ان کی اور میری عمر میں کچھ کم سات سال کا فاصلہ تھا۔ سو ایک طرح سے خوردی بزرگی کا رشتہ تھا۔ ان کا وجود میرے لیے بیتے ہوئے دنوں سے ایک بندھن کی حیثیت رکھتا تھا۔ اٹھائیس اکتوبر ۱۹۹۶ء کو یہ بندھن بھی ٹوٹ گیا اور وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔

موت زندگی کی اٹل حقیقت ہے جو اس دنیا میں آیا ہے اس کو ایک دن یہاں سے جانا بھی ہے۔ ہم ہندوستانیوں کی اوسط عمر دیکھتے ہوئے انصار بھائی نے ماشاء اللہ سے اچھی عمر پائی۔ اسی سے کچھ اوپر ہو کر ابدی نیند سوئے۔ سو ان کی موت پر قانونِ قدرت سے کوئی گلہ نہیں کوئی شکوہ نہیں۔ پر اس سے بھی انکار نہیں کہ جب اپنا کوئی خواہ یہ اپنائیت خون کے رشتہ کی ہو یا تعلقات کی قربت کی، موت سے ہمکنار ہوتا ہے تو دل پر لگے ہوئے زخموں میں ایک کا مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

سالوں کی مدت اور عمر کو پیمانہ بنا کر دیکھا جائے تو انصار بھائی کا اور میرا ساتھ خاصا طویل رہا۔ لیکن جب سے ہوش سنبھالا ان کو سیاسی اور سماجی مصروفیات میں الجھتے ہوئے پایا۔ کبھی کسی جلوس کی تیاری تو کبھی کسی جلسہ میں شرکت کا مسئلہ کبھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے اور کبھی جیل کی سلاخوں سے باہر۔ کبھی انڈر گراؤنڈ کبھی اوور گراؤنڈ۔ سو ان سے میری عمر کے ابتدائی حصہ کا ساتھ بنتا اور بگڑتا ہی رہا۔ اس آخری حصہ میں میرا کافی لمبا عرصہ ملک سے باہر گزرا۔

واپسی پر ان کو جسمانی طور پر بہت کمزور پایا۔ لیکن ذہنی اور اخلاقی طور پر اتنے ہی توانا جتنا کہ وہ اپنی نوعمری اور جوانی میں تھے۔

اپنی کم عمری میں ہم ہندوستانی لڑکیوں کی جو معصوم اور الھڑ قسم کی خواہشیں اور توقعات اپنے بھائیوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں، بے شک وہ انصار بھائی نہیں پوری کر پائے۔ میلے اور نمائش سے ہمارے لیے چوڑیاں، بندے اور رنگ برنگے چٹیلے خرید کر لائیں اس کا اُن میں سلیقہ نہ تھا۔ ہماری تفریحوں ہمارے کھیلوں میں شریک ہو کر اور چھیڑ چھاڑ کر ہمیں ستائیں منائیں۔ اس کا ان کے پاس وقت نہ تھا۔ اور نہ ہی ان باتوں کی ان کی نظر میں اہمیت تھی۔ لیکن ان کی سوچ اور شعور نے جو ڈھرہ اپنایا اس سے ہم بہنوں اور دادالسراج سے قربت رکھنے والی خاندان کی کچھ اور لڑکیوں کو جو فائدہ پہنچا اس سے انکار ممکن نہیں۔ ہماری زندگی اس ڈگر سے ہٹ کر رہی جو اس دور میں ہمارے طبقہ اور ہمارے خاندان کی لڑکیوں کی قسمت تھی، پندرہ سولہ سال کی ہوئیں، بے زبان گائے 'بکری' کی طرح کسی کے ہاتھ تھما دی گئیں۔ شوہر کی خدمت، بچوں کی دیکھ بھال ان کی زندگی۔ چولہے چکی کی مصروفیت ان کی تفریح۔ لڑکی پرائی امانت ہے یہ سبق ان کی گھٹی کے ساتھ ملایا جاتا تھا۔ اس کی اپنی کوئی شناخت ہے کوئی پہچان ہے۔ توبہ کیجیے۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمارے ماں باپ دونوں ہی تعلیم نسواں کے قائل تھے۔ لیکن ان کو اخلاقی طور پر سہارا ملا اسرار بھائی سے جو اپنے مخصوص دھیمے دھیمے انداز سے عزیز و اقرباء کے طعنوں تشنوں سے بے نیاز رہنے کے لیے تیار کرتے تھے اور عملی طور پر ساتھ ملا انصار بھائی کا اسکول سے فارم لانا انھیں بھرنا، مقررہ تاریخ پر انھیں داخل کرنا۔ یہ ساری ذمہ داریاں ان کے سر تھیں۔

علی گڑھ گرلز اسکول میں میرا داخلہ تیسری کلاس میں اور صفیہ آپا کا داخلہ ساتویں کلاس میں ہوا تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ میری ماں بمشکل ہمارے ساتھ جاتے پر آمادہ ہوئی تھیں۔ اس وقت اسکول کی پرنسپل انگریز نسل کی تھیں۔ انگریزی تو الگ رہی وہ تو لکھنوی کھڑی بولی سے بھی ناواقف تھیں۔ ردولی کی آوت ہن جات ہن بولتی تھیں۔ میم کو قریب سے دیکھنے کا شوق رہا ہوگا انصار بھائی کے اصرار پر ساتھ ہولیں۔ انصار بھائی کی جدت پسندی نے ہمارے نام صفیہ خاتون، حمیدہ خاتون سے صفیہ سراج حمیدہ سراج میں تبدیل کر دیے۔ وقت وقت کی بات ہے۔ اس زمانہ میں باپ کا اور اگر شادی شدہ ہوئے تو شوہر کا نام اپنے نام کے ساتھ لگانا ترقی پسندی کی علامت تھی اور خاتون، بانو بیگم وغیرہ کا استعمال آؤٹ اوف فیشن تھا دقیانوسیت کی دلیل تھی۔ آج کل ہوا کا رخ بالکل بدل گیا ہے باپ یا شوہر کا نام اپنے ساتھ

لگا ہو تو اپنی پہچان، اپنی شناخت خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔

علی گڑھ سے ہائی اسکول کرنے کے بعد میرے گھر والوں کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ آیا میرا داخلہ لکھنؤ کے مشہور آئی ٹی کالج میں ہو یا کرامت حسین کالج میں۔ آئی ٹی کالج امریکن مشنری کی سرپرستی میں چل رہا تھا۔ اسٹاف میں زیادہ تر امریکنس تھے اور تو اور کچھ مرد بھی تھے۔ تعلیمی معیار اونچا تھا، لیکن طور طریقے مغرب زدہ تھے۔ برخلاف اس کے کرامت حسین کالج خصوصی طور پر مسلمان لڑکیوں کے لیے کھولا گیا تھا۔ پردہ کا سختی سے انتظام تھا۔

میں نے ہائی اسکول میں یونی ورسٹی میں فرسٹ پوزیشن پائی تھی، سنہرا تمغہ لے کر آئی تھی۔ میرے حوصلے بلند تھے میری شدید خواہش تھی کہ میرا داخلہ آئی ٹی کالج میں ہو میرے ماں باپ وہاں کے آزاد ماحول سے ہچکچا رہے تھے۔ آئی ٹی کالج میں داخلے کے شرائط بھی قدرے مختلف تھے۔ وہاں اکیڈیمک صلاحیت کے ساتھ ساتھ فیملی بیک گراونڈ پر بھی نظر رکھی جاتی تھی۔ عیسائی لڑکیوں کو چھوڑ کر وہاں کی زیادہ تر پیدا وار اونچے گھرانوں کی یعنی پیسہ والے آزاد خیال اور مغربی اقدار کے دلدادہ گھرانوں کی تھی کہا جاتا تھا کہ اس ادارہ میں راجاؤں نوابوں اور اونچے سرکاری عہدیداروں کی شریکِ حیات تیار کی جاتی ہیں۔

اس سلسلہ میں انصار بھائی کی کاوشیں میرے کام آئیں۔ وہ پرنسپل سے ملے، ان کی بات چیت اور میرا سرٹیفکٹ کام آیا اور میرا داخلہ آئی۔ ٹی کالج میں ہو ہی گیا۔ میں چار سال کالج میں رہی اس میں شک نہیں اس کالج کا ماحول بہت حد تک میرے لیے اجنبی رہا۔ لیکن میری سمجھ اور شعور پر جو بھی اثرات پڑے وہ آگے چل کر میری زندگی میں بہت کام آئے۔ میں نے ان اقدار کو پہچانا جن سے آگے چل کر میری زندگی کو بہت سہارا ملا۔

انصار بھائی کے انتقال کے چوتھے یا پانچویں دن ان کے بچوں نے پریس کلب میں ایک تعزیتی جلسہ کا انتظام کیا۔ ہال اوسط سائز کا تھا، نہ ہی بہت بڑا نہ ہی چھوٹا۔ مجمع بھی خاصا تھا لیکن زیادہ تعداد جرنلسٹ قسم کے نوجوانوں کی تھی یا خاندان والوں اور ان کے واقف کاروں کی۔ انصار بھائی کے سیاسی حلقہ کے لوگ انگلی پر گنے جا سکتے تھے۔ کہاں تھی فرصت ان سیاست دانوں کو مختلف قسم کے گھٹالوں سے، کسی کو کرسی پر بٹھانے کسی کو کرسی سے گرانے سے جو اس مجاہدِ آزادی کے تعزیتی جلسہ میں شرکت کے لیے وقت نکال سکتے جس نے ہوش سنبھالتے ہی سیاست کے میدان میں قدم رکھا اور بے دھڑک اپنے ذاتی نفع و نقصان سے بے نیاز اس خار دار راستہ پر چلتا ہی رہا۔ جس کی منزل تھی غلامی کی زنجیروں سے دیس کی رہائی۔ آج کے

سیاست داںوں کی منزل ہے عہدے اور کرسیوں کا حصول ان کے لیے پیسہ طاقت ہے۔ اور ان کے لیے یہی طاقت ہے کرسیوں اور عہدوں کے حصول کا ذریعہ۔ کیوں کر وہ وقت نکالتے اپنی ان اہم مصروفیات سے۔ ایسا بھی نہ تھا کہ انصار بھائی کی ذات اس حلقہ میں اجنبی رہی ہو ان چند دنوں کو چھوڑ کر جب وہ اتنے بیمار ہوتے کہ زبردستی اسپتال میں داخل کیے جاتے۔ ان کا روز کا معمول تھا دس گیارہ بجے نہا دھو کر تیار ہونا اور پارلیمنٹ پہنچ جانا۔ اس عمارت کا ہر بندہ اس دبلے پتلے کمزور اور ضعیف سی شخصیت سے واقف تھا جو الیکشن کی ہار جیت سے بے نیاز وہاں نظر آتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہاں کے چپراسیوں اور چوکیداروں کو اطلاع دی جاتی تو وہ وقت نکال لیتے۔

بات عجیب سی ہے میں بیٹھی تھی پریس کلب کے ہال کی چوتھی یا پانچویں صف میں۔ اور موقع تھا تعزیتی جلسہ کا لیکن میرے ذہن میں ایک بالکل ہی مختلف نوعیت کی محفل کی یاد تازہ ہو رہی تھی۔ اور یہ محفل تھی انصار بھائی کی بڑی بیٹی سلمیٰ کی شادی کے موقعے کی۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے کی امپیریل ہال میں۔ اس فنکشن کی تصویریں میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھیں۔

ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سجی دھجی رنگ برنگی ساڑیوں میں ملبوس خواتین کے درمیان سفید کھدر پوش اشخاص کی تعداد خاصی نمایاں تھی۔ ایک گہما گہمی کا عالم تھا نکاح ہو چکا تھا۔ غالباً کھانا پینا بھی ہو چکا تھا لوگ ایک دوسرے سے رخصتی کی گفتگو میں مصروف تھے خاصا شور و ہنگامہ تھا۔ یکدم ایسا محسوس ہوا جیسے مجمع پر ایک لمحہ کے لیے سناٹا سا چھا گیا ہو۔ سب کی نگاہیں ہال کے داخلی دروازہ پر تھیں جہاں سے مسز گاندھی ایک پتلے باڈر کی بادامی سی سوتی ساڑی پہنے اپنے پُر اعتماد قدموں سے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ کسی کو بھی ان کا انتظار نہ تھا ان کے آمد کی توقع نہ تھی۔ چند دن پہلے ہی انصار بھائی کے نام ان کے اپنے دستخط سے تحفہ کے چیک سمیت ان کے سکریٹری کا ٹائپ کیا ہوا معذرتی خط آ چکا تھا کہ کسی اہم میٹنگ کی وجہ سے وہ شرکت نہیں کر سکیں گی۔ انصار بھائی کہیں اِدھر اُدھر اپنے مہمانوں کی خاطر و مدارت میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ کرنل بشیر حسین زیدی، دولھا کے چچا اور رشتہ و رتبہ کے اعتبار سے باراتیوں کے سربراہ اور بزرگ تیزی سے مسز گاندھی کی طرف بڑھے۔ غالباً وہ اندرا جی کا اپنی اہم مصروفیات سے وقت نکال کر آنے کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جواب میں مسز گاندھی کا یہ جملہ آج تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ "زیدی صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں آپ نے یہ سوچا کیسے کہ میں ہروانی صاحب کی بیٹی کی

شادی میں شرکت نہیں کروں گی۔" آواز قدرے تیز تھی اور انداز تیکھا۔

یہ الفاظ اور یہ انداز، اندرا جی کے جن یادوں کی عکاسی کرتے رہے تھے ان کا احساس انھی لوگوں کو ہو سکتا ہے جو انصار بھائی کے سیاسی زندگی سے تفصیلی واقفیت رکھتے ہوں۔

مسز گاندھی پانچ سو بیس پارلیمنٹ کے ممبروں میں سے کسی ایک کی بیٹی کی شادی میں شریک نہیں ہو رہی تھیں وہ ان انصار ہروانی کی بیٹی کی شادی میں شریک ہو رہی تھیں جو ان کی ماں کملا جی سے بہت ہی قریب تھے اور جن کی نظر میں کملا جی ہندوستانی عورتوں کے لیے ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتی تھیں وہ ان انصار کی بیٹی کی شادی میں شرکت کر رہی تھیں جو ان کی کم سنی کے زمانہ میں جب ان کی شخصیت انتہائی دبی دبی سہمی سہمی اور تنہا سی تھی۔ ان کے لیے بگ برادر کا رول ادا کرتے تھے۔ اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس لڑکی کے اندر ایک لاوا پک رہا ہے۔ ایک ایسا لاوا جو اخبار پھٹ کر اس کی شخصیت میں ایسا انقلاب لائے گا کہ بیرونی اخبار اس کے نام کے ساتھ Iron lady of India اور Empress of India جیسے الفاظ کا استعمال کریں گے۔

ایک ایسے وقت جب اندرا جی آنند بھون میں بالکل تنہا تھیں ماں اسپتال میں باپ جیل میں انصار بھائی نیشنل ہیرالڈ کی طرف سے Anand Bhawan without Nehru کے عنوان پر مسالہ جمع کرنے الہ آباد گئے۔ اندرا جی سے یہ پوچھنے پر کہ وہ ان کے لیے کیا کر سکتے ہیں جواب ملا کہ انھیں اخبار بہت دیر میں ملتا ہے۔ دوسری صبح نیشنل ہیرالڈ کے پہلے اڈیشن کی پہلی کاپی جو اسپیشل ڈاک سے بھیجی گئی تھی علی الصباح ان کی میز پر تھی۔ شاید مسز گاندھی کے دماغ کے کسی گوشہ میں یہ بات بھی رہی ہو کہ جب وہ جوانی میں اپنی زندگی کے رومانی دور سے گزر رہی تھیں اور وہ اور فیروز گاندھی ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنے کے لیے بے چین تھے۔ پنڈت جی کے تذبذب سے ان کے ذہن پر جو بوجھ تھا اس کو اتارنے میں انصار بھائی کا بھی ہاتھ تھا۔ پنڈت جی الہ آباد سے جس دن لکھنؤ پہنچنے والے تھے اسی صبح رفیع احمد قدوائی کے اشارے پر انصار بھائی نے اپنے اخبار نیشنل ہیرالڈ میں فیروز گاندھی کے ساتھ اندرا جی کی ہونے والی شادی کی خبر شائع کر دی۔ پنڈت جی جہاں دیدہ تھے قبل اس کے کہ طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوں اور نمک مرچ کے ساتھ افواہیں پھیلیں انھوں نے مناسب سمجھا کہ خبر کی تصدیق کر دیں اور واردھا میں گاندھی جی کی سرپرستی میں اندرا جی اور فیروز گاندھی کے رشتہ کی تقریب کا اعلان ہو گیا۔

انصار بھائی نے اپنی کتاب میں اندرا جی کے لیے لکھا ہے:

"She had been a witness from her infancy of the fire fury and turmoil of the national struggle".

''وہ بچپن سے مہم آزادی کی اشتعال انگیزی اور اتھل پتھل سے واقفیت رکھتی تھیں''۔

یہ ممکن نہیں کہ مسز گاندھی مہم آزادی کی 'کامیابی میں نوجوانوں کے رول اور ان کی اہمیت سے ناواقف رہی ہوں۔ ۴۲ء میں دیس کے کونے کونے میں آگ کی طرح پھیلتی ہوئی بدامنی نے برطانیہ کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ برطانیہ کے خلاف ان طوفانی لہروں کو بعض لوگوں نے چھوٹے غدر کا نام دیا ہے اور اس حقیقت سے کوئی تاریخ داں انکار نہیں کرتا کہ اس چھوٹے غدر میں دیس کے نوجوان پیش پیش تھے اور ان نوجوانوں کو منظم کرنے کا کام ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد ڈال کر انصار ہروانی نے انجام دیا تھا۔

یقیناً مسز گاندھی کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس دوراہے پر پہنچنے سے قبل جہاں انصار ہروانی کے جوان جوشیلے جذبات کو گاندھی جی کے بتائے ہوئے عدم تشدد کے حربہ کے مقابلے میں سبھاش چندر بوس کے دکھائے ہوئے راستہ میں زیادہ کشش نظر آئی۔ پنڈت نہرو ان کے آئیڈیل تھے، ان کے ہیرو تھے۔ پنڈت جی کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ ان کے لیے حرفِ آخر تھا۔ اندرا جی کو یہ بھی اندازہ رہا ہو گا کہ پنڈت جی کا دامن چھوڑ کر انصار بھائی نے جو راستہ اپنایا وہ انتہائی پر خطر اور جان لیوا تھا، ان کے سامنے صرف ایک مقصد تھا حکومتِ برطانیہ کا خاتمہ، غلامی کی زنجیروں سے رہائی۔ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ فورورڈ بلاک جوائن کرنے میں ان کی اپنی کوئی غرض وابستہ تھی۔ جو راستہ انھوں نے اپنایا اس پر تو انھیں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر چلنا پڑا۔

مسز گاندھی کو یہ بھی احساس رہا ہو گا کہ انصار بھائی پارلیمنٹ کے ان ممبروں میں نہ تھے جو حکام وقت کے ساتھ ہاں میں ہاں ملانے میں ایمان رکھتے ہوں۔ اندرا جی دیکھ چکی تھیں کہ پنڈت جی جیسی بارعب ہستی کے پرائم منسٹر شپ کے دور میں بھی وہ اور فیروز گاندھی حکومت کے فیصلوں پر نکتہ چینی کی ہمت رکھتے تھے۔

غرض کہ یہ اور اسی نوعیت کی اور تھیں وہ یادیں جو مسز گاندھی کو اپنی اہم میٹنگ سے وقت نکال کر انصار بھائی کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لیے کھینچ لائیں۔ اندرا جی، انصار بھائی کی

دوسری بیٹی روحی کی شادی میں بھی شریک ہوئیں۔یادیں بھی مدھم پڑتی ہی جاتی ہیں، تیسری بیٹی فرزانہ کی شادی ان کے بڑے بیٹے راجیو نے ان کی نمائندگی کی۔

ذہن میں یہ سوال اٹھنا ناگریز ہے کہ اگر آزادی کے بعد کے حکمرانوں کو انصار ہروانی کی قومی تحریک سے اس طویل بے لوث وابستگی اور ان کی بے غرض خدمات، اور قربانیوں سے واقفیت تھی تو وہ اس طرح کونے میں کیوں ڈال دئے گئے۔ان کا بھی تعلق دیش کی سب سے بڑی اقلیت سے تھا اور اس ناطے تو لوگوں پر اونچے ترین عہدوں کے دروازے کھل گئے۔کیا ان کی قربانیاں کچھ کم تھیں؟ کیا ان کی خدمات کا پلہ ہلکا تھا۔ان سوالوں کے جواب میں میرے ذہن میں کچھ باتیں آئی ہیں کتنی صحیح کتنی غلط۔فیصلہ میرے اپنے لیے بہت مشکل ہے۔

ایک دور وہ تھا جب انصار بھائی کی نظروں میں پنڈت جی کی حیثیت ایک دیوتا کی سی تھی لیکن دھیرے دھیرے ان کی عقیدت میں کمی ہوتی گئی اور اس کی وجہ تھی پنڈت جی کی گاندھی کے ساتھ لازوال عقیدت اور پنڈت جی پر ولبھ بھائی پٹیل کا دباؤ۔پنڈت جی اور انصار بھائی کے درمیان جو چیلے اور گرو کا رشتہ تھا وہ اس دن ٹوٹ گیا جس دن انصار بھائی نے ان کا دامن چھوڑ کر سبھاش چندر بوس کا ہاتھ پکڑا اور ان کا بتایا ہوا راستہ اختیار کیا۔انصار بھائی کے سب سے قریبی دوست خواجہ احمد عباس نے اپنی خود نوشت ' سوانح عمری "I am not a island" میں پنڈت نہرو کے متعلق لکھا ہے۔

"Nehru was not perfect. If he was perfect he would not have been so human, he suffered from gentlemanship. If he had a choice to be a gentleman or a most successful diplomat he would be a gentleman. He was to some extent gullible. Whatever fault he had sprang from his gentlemanship and from his loyalty and faith in his old comrades."

"نہرو جی کمزوریوں سے بری نہ تھے اگر ایسا ہوتا تو اتنے اچھے انسان نہ ہوتے۔شرافت ان کی کمزوری تھی اگر ان کے سامنے انتخاب کا مسئلہ ہوتا کہ آیا وہ ایک اچھا انسان بننا چاہتے تھے یا ایک کامیاب ڈپلومیٹ تو وہ شرافت ہی کو ترجیح دیتے۔ان کی کمزوریوں کی بنا ان کی شرافت اور پرانے ساتھیوں کے ساتھ ان کی وفاداری اور ان کا اعتماد تھا۔"

پنڈت جی، انصار بھائی کے بھی ہیرو تھے، آئیڈیل تھے لیکن وہ اپنے آئیڈیل کی اس حد تک کی شرافت اور مروّت کو حلق سے نہیں اتار سکے جس نے انھیں بار ہا سردار پٹیل جیسی فرقہ پرست ہستی کے دباؤ میں آنے پر آمادہ کیا۔ پنڈت جی سے انصار بھائی کی عقیدت کو سب سے شدید دھکا پہنچا لارڈ ماؤنٹ کی پیش کردہ تقسیمِ ہند کی تجویز پر پنڈت جی کی رضا سے۔ اس رضا کے پیچھے خانہ جنگی کا اندیشہ تھا، سو ہندوستان دو حصوں میں بٹ گیا اور قوم دو خانوں میں اور دونوں ہی حصہ ۱۹۴۷ء کے فسادوں کی خونریزی کا شکار بنے غرضیکہ جیسے جیسے پنڈت جی سے انصار بھائی کی عقیدت میں کمی ہوئی ویسے ہی ویسے انصار بھائی میں پنڈت جی کا اعتماد ختم ہوتا گیا اور وہ دل سے انصار بھائی کو معاف نہیں کر سکے۔

اب رہا سوال مسز گاندھی کا۔ سو وہ لاکھ انصار بھائی کے ساتھ اپنی کم سنی کی خوبصورت یادیں رکھتی ہوں۔ بھلے ہی جنگِ آزادی میں ان کی قربانیوں کی معترف رہی ہوں لیکن ان کی ہوشیاری اور دور بیں نگاہیں یہ بھی دیکھ رہی تھیں کہ انصار سے Yes man کا رول کا ادا کرنے کی توقع نادانی ہوگی۔ ان کو تو ان لوگوں کے ہاتھوں میں قوت دینی تھی جو آگے چل کر ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں۔ بے شک کچھ ایسے بھی عہدے تھے جو انصار بھائی کو دیے جا سکتے تھے اور وہاں مسز گاندھی کے اندیشوں کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ مثلاً ان ممالک کی سفارت جو سیاسی بنا پر دی جاتی ہیں۔ مختلف ڈیلیگیشن کی ممبر شپ۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہاں انصار بھائی کی بڑھتی ہوئی شراب نوشی ان کی راہ میں حائل ہوئی۔ یہ عادت روز بہ روز بڑھتی گئی۔ اور ایک دور وہ بھی گزرا جب حد سے تجاوز کر گئی۔ لگتا ہے کاتبِ تقدیر نے میرے دونوں بھائیوں کی تقدیریں ایک ہی قلم اور ایک ہی روشنائی سے لکھی تھیں۔ ابھرے، چمکے اور بجھ گئے ایسا کیوں ہوا اور کیوں کر ہوا اللہ ہی جانے۔

جانے میں کہاں بہک گئی۔ ذکر تھا تعزیتی جلسہ کا۔ انصار بھائی کی بڑی بیٹی سلمیٰ زیدی میٹنگ کنڈکٹ کر رہی تھیں، ڈائس پر جانے والوں کا تعارف کرایا جا رہا تھا۔ گاہے گاہے اس قسم کے جملے بھی کانوں سے ٹکرا رہے تھے ہروانی صاحب بہت ہی مہان منشیہ تھے۔ دیش کے لیے ان کا بلیدان بھولا نہیں جا سکتا۔ بہت ہی بھلے شریف اور مخلص انسان تھے وغیرہ وغیرہ۔ وہی گھسے پٹے جملے جو ایسے مواقع پر کہے جاتے ہیں۔ کتنے دل سے نکلتے ہیں اور کتنے محض ہونٹوں سے فیصلہ مشکل ہے۔

ڈائس پر جانے سے پہلے لوگ شردھانجلی کے طور پر ان کی تصویر کے سامنے پھول ڈال رہے

تھے، ان پھولوں کے ڈھیر سے وابستہ تھی کتنی محبت، کتنی عقیدت، یہ تو میں نہیں جانتی البتہ میری طرف سے یہ پیام ضرور تھا کہ زندگی میں انھوں نے کتنی ہی سختیاں سہی ہوں کتنی ہی محرومیوں کا سامنا کیا ہو پر وہ آج کے نوجوانوں کے مقابلہ میں بہت ہی خوش نصیب تھے ان کے سامنے ایک منزل تھی ایک مقصد تھا۔ راہ دکھانے والی ہستیوں میں پنڈت جی مولانا آزاد اور سبھاش چندر بوس جیسی ہستیاں تھیں ۔ روشن دماغ روشن خیال۔ باہمت اپنے ذاتی اغراض و مفاد سے قطعی بے نیاز۔ آج ہے ہمارے نوجوانوں کے سامنے کوئی ایسی شخصیت جو اس معیار پر پوری اتر سکے۔ آج لیڈران قوم کی گنتی نہیں۔ پر جو ہے وہ اپنے حلوے مانڈے کے چکر میں مبتلا۔ کرسی حاصل کرنا اور اسے ذریعہ بنانا جائز اور ناجائز طریقوں سے اپنے بینک بیلنس میں اضافہ کا۔ یہ رہ گیا ہے مقصد ان کی لیڈری کا۔ ہمارا نوجوان جس کے ہاتھوں میں دیس کا مستقبل ہے جو قوم کی تقدیر ہے، کس سے امید لگائے راہبری کی۔

بہر حال تعزیتی جلسہ ختم ہوا۔ لوگ اپنی اپنی راہ چل دیے۔ ہال خالی ہو گیا یہ رسم بھی ادا ہو گئی۔ میں بھی اپنے گھر واپس ہو لی۔ زندگی رواں دواں ہے۔ اپنی روزمرہ کی روٹین میں لگ گئی۔ لیکن دماغ میں ایک کھٹک ایک کسک چبھتی رہی جو مجھے اپنے اس بھائی کی زندگی کے کہانی کے اوراق پلٹنے پر اکساتی رہی۔ اس مضمون کی کچھ تحریریں دین ہیں بزرگوں اور انصار بھائی کی اپنی بتائی ہوئی باتوں کی اور کچھ میری اپنی ذاتی واقفیت اور تجربہ کی۔

انصار بھائی بھی قصبہ ردولی میں بنی خانہ کی اسی سہ دری میں اور غالباً اسی لال پردہ کے پیچھے چودہ فروری ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے جہاں ان کے بڑے بھائی مجاز پیدا ہوئے تھے۔ ان کا نام باپ بھائی سراج الحق اور اسرار الحق کے وزن پر انصار الحق رکھا گیا۔ عرفیت انسو تھی سو گھر میں وہ انسو ہی کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ البتہ ہمارے باپ نام بگاڑنے کے قائل نہیں تھے انھوں نے کبھی بھی بیٹوں کی عرفیت جگن اور انسو کا استعمال نہیں کیا۔ ہم دونوں بہنیں ان کو انسو بھیا کہتے، جانے کب انھیں کے اصرار پر ہم نے ان کو انصار بھائی کہنا شروع کیا۔

ہمارے ان دونوں بھائیوں نے آگے بڑھ کر اپنے ناموں کے آگے صدیقی کا اضافہ کر لیا۔ غالباً انھیں بھی جڑوں کی تلاش کا شوق تھا، جو آج کل مغربی ممالک میں بہت زور پکڑ رہا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے شجرہ کی طرح جو ایران، توران یا عرب سے آئے کسی نہ کسی بزرگ سے جا ملتا ہے، بلا لحاظ ان درمیانی سیڑھیوں کے جہاں پر ہندوستانی خون کا ملاپ ہوا ہمارا شجرہ بھی حضرت ابو بکر صدیق سے ملتا تھا۔ سو اسی سلسلہ کا، سہارا لے کر انصار بھائی اور

اسرار بھائی دونوں ہی نے کچھ عرصہ تک اپنے نام کے آگے صدیقی کا اضافہ کیا۔ ورنہ ہمیں اپنے کسی بزرگ کے نام کے ساتھ صدیقی کا استعمال نہیں ملتا۔ غالباً اس وقت انھیں اس نوعیت کی پہچان کی ضرورت نہ تھی۔ ایک وقت ایسا تھا کہ ردولی بزرگوں اور ولیوں کی رہائش کا مرکز تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کا اصلی نام رودولی تھا بگڑ کر ردولی بنا۔ بہر حال حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ قصبہ میں صاحب ملکیت ہونا مرتبہ کی علامت سمجھا جانے لگا۔ سو ہمارے دادا پردادا وغیرہ کے ناموں سے پہلے لفظ چودھری کا استعمال ملتا ہے۔ ہمارے ابا کی تو چودھری صاحب گویا عرفیت ہی بن گئی تھی۔ دوستوں اور احباب کے حلقہ میں وہ اسی نام سے مخاطب کئے جاتے تھے۔ ہمارے چچازاد بھائیوں کے نام بھی چودھری کے لقب سے شروع ہوتے تھے۔ لیکن اسرار بھائی اور انصار بھائی کے نام اس زمیندارانہ امتیاز سے محفوظ رہے۔
ایک اور بات دل چسپ اور شاید معنی خیز بھی ہمارے شجرہ میں نظر آتی ہے ہمارے بزرگوں کے ناموں میں روایت پرستی سے احتراز کیا گیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ناموں کا ایک ایسا سلسلہ ہو جو سب ہی حق یا حسین، حسن، علی وغیر پر ختم ہوتے ہوں۔ ہمارے نانا اور دادا سگے بھائی ان دونوں کے نام کے ساتھ حسین کا استعمال تھا اور ان کے نام احمد حسین اور کرامت حسین تھے۔ ہمارے پردادا کا نام عبدالغفار تھا اور ان کے باپ کا نام مراد علی۔ بہر حال لگتا ہے کہ نام کے ایک حصے میں تبدیلی جینس میں آئی تھی اور کچھ انصار بھائی کی قوم پرستی و جدت پسندی انھوں نے سوچا کہ اگر نسبت کی بنیاد کا سہارا لینا ہے تو کیوں نہ خواجہ افتخار ہارونی سے سلسلہ ملایا جائے جو سلطان غوری کے ساتھ ۱۱۷۵ عیسوی میں ہندوستان آئے تھے اور قصبہ ردولی میں سکونت اختیار کی تھی۔ غرضیکہ انصار بھائی نے اپنا نام انصار الحق صدیقی سے انصار الحق ہارونی لکھنا شروع کیا، اور جانے کس طرح ہارونی سے وہ ہروانی میں بدل گیا۔ اب تو وہ ہروانی صاحب ہی کے نام سے جانے جاتے تھے۔

اماں بتاتی تھیں کہ انصار بھائی بچپن میں خاصے گول مٹول، بھولے بھالے اور دوسرے بہن بھائیوں کے مقابلہ میں رنگت میں صاف تھے۔ گو کہ بڑے بھائی کی طرح نقشہ تیکھا نہ تھا لیکن کافی جامہ زیب تھے پہن اوڑھ کر خاصے اسمارٹ لگتے تھے۔

طبیعتاً سیدھے تھے، ان کی پرورش میں ماں کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ضدیں کرنا اور شور شرابا مچا کر اپنی بات پوری کروالینا بڑے بھائی (مجاز) کی خصوصیت تھی ویسے بھی ان کی پرورش کی زیادہ تر ذمہ داری ہماری خاندانی بوا عبادن پر تھی، جن کے بیٹے ان کے دودھ شریک بھائی تھے۔

اماں بتاتی تھیں کہ انصار بھائی نے چلنا دیر میں سیکھا البتہ بولنا بہت جلدی شروع کیا۔ جو بھی الفاظ منھ سے نکلتے صاف اور صحیح تتلانے کا اسٹیج ان کی قوت گویائی میں آیا ہی نہیں۔

بچپن میں ان کا زیادہ تر وقت بوا کے پلنگ پر ان سے جن بھوتوں کی کہانیاں سننے میں گزرتا تھا۔ ذرا ہوش سنبھالا اور بڑے ہوئے تو اسرار بھائی کی نقل میں پتنگ بازی، گلی ڈنڈے اور دوسری ادھم بازیوں میں شرکت کی کوشش کرنے لگے لیکن اس قسم کے ہر کھیل میں زیادہ تر مات کھائی اور پھسڈی کہلائے۔

انصار بھائی کو بچپن میں جو شوق تھا وہ یہ کہ بڑوں کی محفل میں گھسیں اور ان کی گفتگو میں شریک ہوں۔ خواہ موضوع گفتگو کچھ بھی ہو دخل اندازی سے باز رہنا ان کے لیے مشکل تھا، اکثر اس سلسلہ میں ڈانٹ بھی کھاتے تھے، طبیعت میں اپنی عمر سے بڑھ کر سنجیدگی تھی۔ آج کی زبان میں غالباً وہ Precocious بچوں میں تھے، ویسے سنتے ہیں کہ بزرگوں میں وہ بہت مقبول تھے۔ بڑی بوڑھیاں ان کی باتوں سے بہت لطف اندوز ہوتی تھیں۔ بوا سے کچھ الٹی سیدھی حدیثیں اور معجزوں کی داستانیں سن رکھی تھیں۔ میلاد کے موقع پر سلام کے بعد بزرگ خواتین ان کو چوکی پر کھڑا کر دیتی تھیں اور چار پانچ سال کے بچے کے منہ سے معجزوں اور حدیثوں کو سن کر محظوظ ہوتی تھیں۔

انصار بھائی کو ہمارے دادہالی گاؤں سینی سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہاں جانے کے لیے اسرار بھائی بے چین رہتے تھے۔ حالانکہ وہاں پہنچنے پر کاشتکاروں کے لیے یہ لازمی تھا کہ چونی اٹھنی چودھری کے بیٹوں کے ہاتھ پر رکھیں اور اس وقت کی چونی اٹھنی آج کل کے سو دو سو روپیوں سے کم نہ تھی، انصار بھائی کو اگر مزا آتا تھا تو اپنے ننہالی گاؤں حیدر گنج میں، جہاں ہماری ماں کے ماموں زاد بھائیوں کی رہائش تھی۔ ہمارے یہ ماموں ردولی کے ان زمینداروں کی طرح نہیں تھے جو کاشتکاروں کے مسائل سے بے خبر صرف ان سے لگان کی وصولی کا رشتہ رکھتے ہوں۔ ہمارے ماموں کا روزمرہ کا معمول تھا بعد نماز فجر اپنے کھیتوں کا گشت لگانا۔ راہ ملتے کسانوں سے ان کی خیریت معلوم کرنا اور ان کو جانوروں کی صحت چارہ دانے اور کھیتی باڑی کے سلسلہ میں مشورہ دینا۔ بیماری دکھی کی صورت میں کھڑے کھڑے ہی سہی ان کے گھر جا کر ان کا حال چال پوچھنا۔ جاڑوں کی شام چوپال کے اندر اور گرمیوں کی شام چوپال کے باہر کھلے میدان میں وہ چارپائی پر لیٹے نظر آتے اور ان کی چارپائی کے چاروں طرف کسانوں کا مجمع ہوتا۔ اس فصل بارش کم ہوئی یا زیادہ وقت پر ہوئی یا بے وقت۔ فلاں کی لڑکی شادی کے

قابل ہے پیسہ کا انتظام کیوں کر ہو۔ فلاں کی بیوی بیمار رہتی ہے، کس گاؤں کے مولوی آسیب اتارنے میں ماہر ہیں۔ موضوعِ گفتگو اسی قسم کے مسائل ہوتے تھے، انصار بھائی حیدر گنج پہنچ کر صبح سے شام تک انھی ماموں کے ساتھ چپکے رہتے تھے۔ کسانوں اور مزدوروں کے مسائل سے از حد دلچسپی لیتے اور حسبِ عادت دخل اندازی سے بھی نہیں چوکتے۔ عوام سے قربت کی ٹریننگ میں حیدر گنج کا قیام انصار بھائی کا پہلا قدم تھا۔

اسرار بھائی کی طرح انصار بھائی کا نام بھی مستقل طور پر مخدومیہ اسکول کے رجسٹر میں تھا۔ کچھ بڑے ہوئے پر بڑے بھائی کے ساتھ ان کا داخلہ بھی امین آباد میونسپل اسکول لکھنؤ میں تیسری جماعت میں کروا دیا گیا۔ یہ وہ دور تھا جب تحریک خلافت اپنے عروج پر تھی۔ فضا مہاتما گاندھی زندہ باد، علی برادران زندہ باد کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی زباں پر تھا، بولی اماں محمد علی کی بیٹا جان خلافت پر دے دو۔ انصار بھائی کا یہ کھیل تھا کہ ہاکی کے ڈنڈے میں ہمارا ڈوپٹہ باندھ کر اور دو چار محلے کے لڑکوں کو اپنے پیچھے لگا کر گلی یا آنگن میں یہ نعرے لگاتے پھریں۔

ہمارے ابا سرکاری ملازم تھے۔ محنت اور ملازمت کی ذمہ داری کو اپنا ایمان سمجھتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ مطالعہ اور اپنے اردگرد کے حالات سے بھی واقفیت کا از حد شوق رکھتے تھے۔ کم آمدنی رہی ہو یا زیادہ، ہمارے گھر دو اخبار ضرور آتے رہے ایک انگریزی کا ایک اردو کا۔ ہم بچوں کے لیے انھوں نے ''غنچہ'' نام کا رسالہ جاری کروا رکھا تھا۔ اس رسالہ کے آخری دو صفحات میں اہم سیاسی و سماجی خبریں ہوتی تھیں۔ انصار بھائی اور صفیہ آپا میں ہمیشہ اس رسالہ کے سلسلہ میں چھینا جھپٹی ہوتی۔ انصار بھائی کے ہاتھ یہ رسالہ لگا اور جب تک یہ دو صفحے ختم نہ ہوتے کسی دوسرے کو ملنا ناممکن۔ ان کو نظموں قصے کہانیوں وغیرہ سے ذرا کم ہی دلچسپی تھی۔ ہمارے گھر پر ہر صبح حالاتِ حاضرہ پر تھوڑی دیر ضرور ہی بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔ اور اس میں ہماری ان پڑھ ماں اور انصار بھائی جوش و خروش سے شریک نظر آتے۔ ابا کبھی کبھی بہت ہی ملائمت کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کر دیتے۔

انصار بھائی کے سیاسی شعور میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور اسکول میں ان کے باغیانہ رجحان کا اظہار مختلف طریقوں سے ہونے لگا۔ مثلاً وفادار ساتھیوں سے بحثا بحثی کر کے۔ خوشامد پرست استادوں کی نافرمانی کر کے۔ سفید چمڑی والے آفیسر کی اسکول میں آمد پر تیاری کی گہما گہمی سے غائب ہو کر۔ غرض یہ کہ ان کی اس قسم کی حرکتوں سے اسکول کے انتظامیہ کو خطرہ پیدا ہوا

کہ ایسا نہ ہو کہ اس لڑکے کے غلط اثرات دوسرے طلباء پر پڑیں اور انھیں حکومت کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑے۔

اسکول مسلمانوں کے علاقے میں تھا جمعہ کو انٹرول لمبا ہوتا تھا۔ دوسرے لڑکے فائدہ اٹھاکر کھیل کود میں وقت گزارتے تھے۔ انصار بھائی نے قریب کی مسجد میں بعد نماز قومی تحریک پر تقریر بازی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اسکول کے اندر کی باتیں تو دبائی جاسکتی تھیں، لیکن مسجد میں تقریروں کا معاملہ ذرا زیادہ خطرناک تھا۔ ہیڈ ماسٹر نے ابا کو بلایا، انصار بھائی کی حرکتوں سے پہلے بھی کئی بار خبر دار کر چکے تھے۔ اس دفعہ انھوں نے بہت ہی واضح طور پر یہ کہا کہ لڑکا تیز ہے اور انگریزی بولنے کا شوقین۔ اسے کسی بہتر اسکول میں داخل کرادیا جائے، میونسپل اسکول اس کے لیے موزوں نہیں۔ غرضیکہ لکھنؤ کے مہذب انداز میں انصار بھائی امین آباد اسکول سے ریسٹکیٹ کر دیے گئے اور دوڑ دھوپ کے بعد ان کا داخلہ چرچ مشن اسکول میں ہو گیا۔

اسی دوران ہم لوگ مولوی گنج سے کچے احاطہ میں منتقل ہو گئے۔ یہ گھر امین آباد کے بڑے پارک سے بہت قریب تھا۔ بیچ میں پارک کے بغلی سڑک کے کنارے کی دکانیں حائل تھیں۔ اس پارک میں آئے دن تحریکِ آزادی کے سلسلے میں میٹنگس اور تقریریں ہوا کرتی تھیں۔ ملک کے سارے ہی نیتا ان جلسوں میں شرکت کے لیے یہاں آتے تھے۔ اور انھی جلسوں اور میٹنگوں کی بدولت انصار بھائی کو بہت ہی کم عمری میں گاندھی جی، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس، علی برادران، مسز نائیڈو اور مولانا آزاد جیسے لیڈروں کے دیدار کا موقع ملا۔ ان جلسوں کی ابتدا میں دریوں کو بچھا کر اور خاتمہ پر انھیں لپیٹ کر عملی طور پر انصار بھائی کا قومی تحریک سے ناطہ بندھا اور یہ ناطہ یہ رشتہ دھیرے دھیرے مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔

۱۹۲۷ء میں کانگریس نے مدراس کے سیشن میں مکمل خود مختاری کا ریزولیشن پاس کیا۔ اور تمام دوسری پارٹیوں کے ساتھ مل کر سوراج کونسٹی ٹیوشن پاس کرنے کا فیصلہ کیا۔ حالات کے اس رجحان سے حکومتِ برطانیہ کو چوکنا ہونا ہی تھا۔ ۱۹۲۸ء میں سر جان سائمن کی سربراہی میں ایک کمیشن ہندوستان بھیجا گیا تاکہ وہ موقع پر پہنچ کر حالات کا جائزہ لے سکے اور اس بھڑکتی ہوئی آگ کو مزید پھیلنے سے روکنے کے لیے حکومتِ برطانیہ کے سامنے کچھ تجاویز رکھ سکے۔

یہ کمیشن کل سے جز تک حکمرانوں کے رنگ وروپ کا تھا۔ اس میں ہندوستان کی کسی پارٹی کی نمائندگی اور شمولیت ضروری نہیں سمجھی گئی تھی نتیجہ ظاہر تھا۔ کانگریس میں مسلم لیگ سب ہی نے اس کمیشن سے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا۔

جس دن یہ کمیشن لکھنؤ پہنچنے والا تھا تقریباً بیس ہزار افراد کا مجمع امین آباد پارک میں جمع ہوا۔ اس میں مرد عورت بوڑھے جوان سب ہی شریک تھے۔ پنڈت نہرو اور یوپی سوراج پارٹی کے لیڈر پنت جی کی قیادت میں یہ جلوس کالے جھنڈے لے کر گاندھی جی کی جے اور سائمن کمیشن گو بیک کے نعرے لگاتا ہوا چار باغ اسٹیشن کی طرف بڑھا۔ اسٹیشن پہنچنے سے کچھ ہی قبل گھوڑ سوار پولیس آفیسروں نے ان کا راستہ روکنا چاہا۔ ان میں زیادہ تعداد اینگلو انڈین کی تھی اور دستہ کے سرجنٹ خان بہادر عین الدین تھے۔ جنھوں نے آگے بڑھ کر پنڈت جی اور پنت جی کو خبردار کیا کہ اگر جلوس واپس نہ ہوا تو نتائج خطرناک ہوں گے۔ آزادی کے یہ علمبردار خطروں سے آگاہ تھے اور ان کا سامنا کرنے کے لیے تیار۔ سو انکار کی صورت میں جلوس پر لاٹھی چارج ہوا۔

اس جلوس میں کانگریس کے کمسن ترین نمائندے انصار بھائی تھے۔ ان کی عمر اس وقت لگ بھگ بارہ سال تھی۔ پولیس کا لاٹھی چارج، جلوس کی بھگدڑ، پنڈت جی اور پنت جی کا اپنی جگہ کھڑا رہنا اور آخر کار لاٹھیوں کی چوٹ سے زمین پر منھ کے بل گر جانا یہ سب انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ عمر کے اس حصہ میں ایسے واقعات کے جو اثرات پڑتے ہیں۔ وہ بہت ہی دیرپا اور گہرے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اسی ظالمانہ نظارے نے ان کے کو گاندھی جی کی عدم تشدد کی پالیسی پر ایمان لانے سے روکے رکھا۔ انھیں اگر عقیدت تھی تو نہرو جی سے گاندھی جی سے نہیں۔

سائمن کمیشن کی واپسی کے کچھ ہی دنوں بعد کانگریس نے مدراس سیشن میں ملک کی انتیس تنظیموں کا تعاون حاصل کر کے پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک سب کمیٹی کا تقرر کیا، جس کے سپرد آزاد ہندوستان کے لیے کونسٹی ٹیوشن تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ متعدد اور طویل میٹنگس کے بعد موتی لال نہرو رپورٹ تیار کی گئی جو سفید بارہ دری لکھنؤ میں آل پارٹی کانفرنس کے سامنے پیش کی گئی۔

اس کانفرنس کے لیے انصار بھائی نے کانگریس کے دفتر میں والنٹیروں کی لسٹ میں اپنا نام لکھوایا۔ اس فہرست میں بھی وہ کمسن ترین تھے۔ ان کے سپرد ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے

کاغذات اور فائلوں کی دیکھ بھال اور بار برداری کی گئی۔ یہ تھا انصار بھائی کا اس سیڑھی پر پہلا قدم جو ان کو کچھ سالوں بعد یو پی کانگریس کی سکریٹری شپ اور ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا کانگریس کے سب سے کم عمر ممبر شپ کی منزل تک لے گیا۔

کچھ ہی دنوں بعد ابا کا تبادلہ آگرہ ہو گیا۔ انصار بھائی کا داخلہ سینٹ کا جانسن اسکول میں کروادیا گیا۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا قرب اور ان کے بچے وہاں کی تعلیم سے محروم رہیں ہمارے باپ کو اس کی شدید کہک تھی۔ ہم پانچ عدد تھے۔ چار ہم بھائی بہن اور ایک ہمارے بھانجے میرے ہی ہم عمر۔ سب کو ہوسٹل میں رکھنا ممکن نہ تھا۔ بہر حال ابا کی کارکردگی اور ایمانداری کام آئی اور ان کو علی گڑھ اپنا ہیڈ کوارٹر بنانے کی اجازت مل گئی۔ ابھی سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ ہم سب اسرار بھائی کو ہوسٹل میں چھوڑ کر بوریہ بستر باندھ کر علی گڑھ کے لیے روانہ ہو گئے۔

علی گڑھ کی فضا۔ انصار بھائی کی نیشنلزم کے اس پودے کو بہت ہی راس آئی جس کا بیج تحریکِ خلافت کے دوران گاندھی جی زندہ باد علی برادران زندہ باد کے نعروں نے بویا تھا اور جن کی آبیاری امین آباد کے پارک میں لیڈران قوم کی تقریروں نے کی تھی۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران اس پود کی تازگی اور توانائی میں روز افزوں اضافہ رہا۔

انتقال سے چند ہی ماہ پہلے میں نے انصار بھائی سے یہ سوال کیا تھا کہ ایسا کیوں کر ہوا کہ اتنی کمسنی سے ان میں یہ جرأت پیدا ہو گئی کہ انھوں نے اپنے کو اس دور کی ہیجانی سیاست کے سپرد کر دیا۔ ہمارے خاندان کا ماحول تو قطعی غیر سیاسی تھا۔ زمیندارانہ ماحول کھاؤ پیو اور خوش رہو۔ ہمارے ابا البتہ حالات کا شعور رکھتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ تحریک آزادی سے کسی قسم کا عملی لگاؤ سرکاری ملازم ہونے کی بناء پر اپنے فرائض کے منافی سمجھتے تھے ریٹائر ہونے کے بعد بھی ان کا رویہ یہی رہا۔ میرے اندازے کے مطابق اگر رجحان تھا بھی تو ان تحریکوں کی طرف جو ان کے مذہب اور تہذیب کے تحفظ کے وعدے کر رہی تھیں۔ لیکن ان کی خاموش طبیعت اس سلسلہ میں بھی خاموش ہی تھی۔ اگر کھلے طور پر ہمارے گھر میں کسی کے ساتھ ہمدردی اور لگاؤ کا اظہار ہوتا بھی تھا تو وہ ہماری ماں کی طرف سے پنڈت جی کے لیے جن کے جیل جانے پر وہ آنسو بہاتی تھیں۔

میرے سوال کے جواب میں انصار بھائی نے اپنے بچپن کے دو واقعات بتائے ان کے خیال میں ان دو واقعات نے ان کے ذہن کو تحریک آزادی کی طرف رجوع کرنے میں بہت اہم

رول ادا کیا۔

ایک واقعہ تو بہت ہی بچپن کا تھا۔ ردولی کے ہر با حیثیت گھر کی ڈیوڑھی میں ایک پالکی ٹنگی رہتی تھی۔ بروقت ضرورت گاؤں سے کہاروں کو بیگار پر بلالیا جاتا تھا۔ ان کی محنت کا معاوضہ چند مٹھی چنے اور ایک بھیلی گڑ کی ہوتی تھی۔ جو اس وقت کی زبان میں چبیا کہلاتا تھا۔ بھادوں کے مہینہ میں کٹی باغ میں زہرہ بی کا میلہ لگتا تھا۔ یہ جگہ رودولی سے قدرے فاصلے پر تھی سو کہاروں کی ضرورت پڑتی تھی۔ زمینداروں کے بیٹوں کی میلے میں شرکت کے لیے ایک ایسے ہی موقعہ پر سہنی سے کہار بلوائے گئے۔ ان میں سے ایک کو ردولی پہنچنے میں قدرے تاخیر ہوئی جانے اس غریب کی آنکھ دیر میں کھلی یا چلتے وقت اس کے بچے ضد کرنے لگے کہ بابا ہم بھی ساتھ چلیں گے۔ بہر حال زمینداروں کے بیٹوں کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی۔ ہمارے رنگیلے مزاج چاچا نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ ہنٹر اٹھا کر غریب کہار کی پٹائی شروع کر دی۔ کمسن بچے سہم کر رہ گئے پر کہار کے زخم زدہ کاندھوں پر سوار ہو کر میلے پہنچ گئے اور میلے کی چمک دمک میں اس بدمزہ تماشہ کو بھول گئے۔ انصار بھائی نے بتایا کہ میلے کے ہنگامہ میں بھی ان کو کہار کا گڑگڑا کر معافی مانگنا اور اس کے پھٹے کرتے سے ڈھکی ہوئے پیٹھ پر اپنے عمو جان کے کوڑوں کی مار رہ رہ کر یاد آتی رہی۔ رات کو بھی بار بار آنکھ کھلتی رہی۔ اِس وقت اس کچے ذہن کے لیے بے چینی کا تجزیہ تو ممکن نہ تھا البتہ انسان کا انسان پر جبر کا نظارہ آنکھوں کے سامنے پھرتا رہا۔ آخر ایسا کیوں؟ غیر شعوری طور پر اس سوال نے جنم لیا اور یہ کھٹک بڑھتی گئی۔

دوسرا واقعہ اپنی جگہ خاصا دلچسپ ہے۔ انصار بھائی کو اچھے کھانے اچھا پہننے کا ہمیشہ سے شوق تھا۔ ابا نے آفیشل فنکشن کے لیے دو ایک سوٹ سلوا رکھے تھے ورنہ ہمارے مردوں کے گھر کا لباس سفید کرتا اور سفید پاجامہ تھا۔ باہر جاتے وقت شیروانی پہن لی جاتی تھی۔ اور سر پر ٹوپی۔ انصار بھائی نے ضد کر کے ایک سوٹ اپنے لیے بھی سلوالیا انگریزی بولنے کا بے حد شوق تھا شاید ذہن میں یہ خیال رہا ہو کہ حاکموں کا طرز رہائش اپنا کر وہ ان سے برابری کر سکیں گے۔

ابا نینی تال دورے پر جارہے تھے۔ انصار بھائی بھی ان کے ساتھ لگ لیے۔ نو دس سال کی عمر تھی۔ ایک میدان میں کچھ لڑکے ہاکی کھیل رہے تھے ہمیشہ سے طبیعت کے تیز طرار تھے۔ کچھ دیر تو کھڑے ہو کر انھیں دور سے دیکھتے رہے۔ پر طبیعت نہ مانی آگے بڑھ کر ان سے انگریزی میں بات کرنی چاہی۔ ان لڑکوں میں سے ایک نے بہت ہی منھ بنا کر خفگی سے کہ we dont talk to brownies (ہم ہندوستانیوں سے بات نہیں کرتے) اس جملے پر اس

کے تمام ساتھی قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ انصار بھائی کا کہنا تھا کہ الفاظ سے زیادہ اس انگریز لڑکے کا حقارت آمیز لہجہ تھا جسے وہ بھول نہ پائے۔ ان کے خیال میں اس کم عمر میں حکمرانوں کے خلاف ان کے غصہ اور نفرت میں ان کے اس تجربہ کا بڑا ہاتھ تھا۔ ان دونوں واقعات کا ذکر اپنی کتاب Before Freedom And After میں کیا ہے۔

علی گڑھ پہنچنے پر انصار بھائی کا داخلہ یونی ورسٹی کے اسکول منٹو سرکل میں ہوا۔ چند مہینوں کے بعد ہی ان میں اور باچھو بھائی جان (خواجہ احمد عباس) میں دوستی ہو گئی۔ یہ بھی اپنی جگہ دلچسپ سی بات ہے آپسی وجہ کشش تھی انصار بھائی کی کھدر کی لال ترکش کیپ۔ ورنہ سینئر اسٹوڈنٹس جونیئرس کو منھ لگانا ایک طرح سے اپنی عزت کے خلاف سمجھتے تھے۔ اور اس وقت باچھو بھائی جان یونی ورسٹی میں تھے اور انصار بھائی اسکول میں۔ اسکول ہو یا یونی ورسٹی علی گڑھ کے اسٹوڈنٹس کا یونیفارم تھا کالی شیروانی اور سرخ ترکش کیپ خواہ گرمی ہو یا سردی باچھو بھائی جان اور انصار بھائی دونوں ہی کھدر پوش تھے۔ سوانھوں نے اور ان طلباء نے جو قومی تحریک سے وابستہ تھے اپنی شیروانیاں تو کالے کھدر کی بنوا رکھی تھیں لیکن بحالت مجبوری ان کی ٹوپیوں کا کپڑا بدلی تھا۔ اور سرخ کیپ کا استعمال لازمی تھا۔ ایک دن باچھو بھائی جان کی نظر انصار بھائی کی ٹوپی پر پڑی جو لال کھدر کی تھی انھیں یہ جستجو ہوئی کہ ایسی ٹوپی کہاں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ پتہ چلا کہ انصار بھائی نے شہر میں کوئی درزی تلاش کر لیا ہے جس نے سفید کھدر کو لال رنگوا کر اور اس میں بکرم کی تہ دے کر ان کی ٹوپی تیار کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ درزی یقیناً گاندھی جی کا عقیدت مند رہا ہو گا۔ اس کے بعد سے یونی ورسٹی میں کھدر کی ترکش کیپ کی تعداد میں اضافہ شروع ہو تا گیا اور ساتھ ہی ساتھ درزی کی آمدنی میں سو بہر ملاقات تھا یہ بہانہ۔ دونوں ہی ہم خیال تھے دونوں ہی کی دلچسپیاں یکساں تھیں۔ دوستی اس طرح بڑھی کہ کہنا چاہئے ایک جاں دو قالب کی صورت پیدا ہو گئی اور یہ دوستی زندگی کی آخری سانس تک برقرار رہی۔

باچھو بھائی جان یونی ورسٹی میگزین کے اڈیٹر تھے۔ انصار بھائی کے مضامین شائع کرتے رہے۔ لیکن دونوں کو ہی احساس تھا کہ میگزین میں شائع کردہ مضامین میں یونی ورسٹی کی عائد کردہ پابندیوں کی وجہ سے وہ اپنے خیالات کا ایمانداری سے اظہار نہیں کر پا رہے ہیں سوان دونوں نے چند اور دوستوں سے صلاح مشورہ کے بعد ایک ہفتہ وار اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا۔ آپس میں چندے جمع ہوئے کچھ پیسہ گھر والوں سے وصول کئے گئے شہر میں ایک سستا سا پریس ڈھونڈ لیا گیا اور تقسیمِ عمل کے تحت آپس میں ذمہ داریاں تقسیم ہوئیں اور یہ اخبار

Aligarh Opinion کے نام سے جاری ہو گیا۔ جمعہ کا آدھا دن اور اتوار کا پورا دن ان ہی ذمہ داریوں کے سنبھالنے میں گزرتا تھا۔ اس کے علاوہ انصار بھائی اور باچھو بھائی جان دونوں ہی ہندوستان ٹائمس اور بمبئی کرانکل کو وہ خبریں خفیہ طور پر بھیجتے رہتے تھے جن پر یونی ورسٹی پردہ ڈالے رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ انصار بھائی اور باچھو بھائی جان کو بارہا یونی ورسٹی بدر ہونے کی دھمکیاں ملیں۔ جانے کیسے اور کیوں کر بچتے رہے۔

علی گڑھ یونی ورسٹی کے متعلق لوگوں کی یہ رائے کہ وہ ہمیشہ سے برطانوی حکمرانوں کے وفاداریوں کا اڈا رہا سراسر بے بنیاد ہے۔ اگر علی گڑھ نے سر سکندر حیات خاں اور سر نظام الدین جیسے انگریزوں کے وفادار پیدا کیے تو راجہ پرتاپ سنگھ اور حسرت موہانی جیسے قوم پرست بھی پیدا کیے۔ مہم آزادی کے ان سپاہیوں کو کون بھول سکتا ہے۔ راجہ پرتاپ سنگھ نے پہلی جنگِ عظیم کے دوران برلن میں ہندوستان کی پروونزل گورنمنٹ کا اعلان کر دیا تھا اور مولانا حسرت موہانی نے ۱۹۲۰ء میں احمد آباد کی آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں ہندوستان کی مکمل خودمختاری کا ریزولیشن رکھا تھا۔

یہ رائے بھی صحیح نہیں کہ علی گڑھ کے تمام طلبا قائدِ اعظم جناح میں ایمان رکھتے تھے۔ ان نوجوانوں کی خاصی بڑی تعداد تھی جن کے دلوں پر پنڈت جی کے یہ الفاظ کندہ تھے۔

"You will not get independence by logic. You will get it when they feel that it will be hell for them in India till agree to it.

"خودمختاری دلائل سے نہیں ملے گی یہ اس وقت ملے گی جب ان کو یہ احساس ہو جائے گا کہ اگر انھوں نے ہندوستان کی آزادی قبول نہیں کی تو ہندوستان ان کے لیے جہنم بن جائے گا۔"

اس قوم پرست گروپ میں سوشلسٹ کمیونسٹ پر رجحان کے ہی نوجوان شامل تھے۔ باعث یکجائی تھا ان کا ایمان ملک کی آزادی میں قوم کی وحدت میں اور سماجی و سیاسی جمہوریت میں۔ اس گروپ میں نمایاں تھے۔ خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری، سبطِ حسن قاضی جلیل عباس، اختر رائے پوری اور تمام ترقی پسند ادیب یہ وہ دور تھا جب غلامی کی زنجیریں توڑنے کی کاوشیں تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ نوجوان خون اُبال پر آ جائے حالات خطرناک صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ اس اندیشہ کے تحت حکومت برطانیہ کی نگاہیں ہر یونی ورسٹی پر

تھیں خصوصی طور پر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی پر جہاں انھوں نے بھانپ لیا تھا ان کی Divide and Rule کی پالیسی کارگر ہو کر رہے گی۔ مستقبل نے یہ ثابت کر دیا کہ ان کا اندازہ غلط نہ تھا۔

علی گڑھ کے طلباء کے اخلاقیات میں دو باتیں جائز تھیں، کھانے کی چیزوں کی چوری اور بلا ٹکٹ ٹرین کا سفر پلیٹ فارم کے ٹکٹ کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔

آج کے نوجوانوں کی تفریح بازی کے لیے جو اہمیت فائیو اسٹار ہوٹلوں کے ریسٹوراں کی ہے۔ وہی اہمیت اس وقت علی گڑھ کے طلباء کے لیے ریلوے پلیٹ فارم کی تھی۔ رات گئے اسٹیشن آکر پلیٹ فارم کی چہل قدمی کرنا ان کے لیے دل چسپ ترین مشغلہ تھا۔ پراکٹر آفس کی عائد کردہ پابندیوں کے توڑنے کا مزا تو تھا ہی ساتھ ساتھ اس کا امکان کہ شاید ٹرین سے اترتی چڑھتی یا جھانکتی ہوئی کسی لڑکی کے چہرے سے نقاب کھسک جائے اور ان کو کسی حسین چہرے کی جھلک نصیب ہو جائے۔ جاڑوں کی راتوں اسٹیشن کی گرم چائے میں بھی ایک خاص مزا تھا کبھی کبھی بک اسٹال سے کوئی کتاب یا رسالہ میں بھی خرید لیا جاتا تھا۔

ان لڑکوں کو ایک رات اس تفریح کے دوران کسی ریلوے ملازم سے یہ اطلاع ملی کے اگلے دن میل سے پنڈت جی دلی سے الہ باد جانے والے ہیں۔ انصار بھائی اور باچھو بھائی جان دونوں نے ہی یہ طے کیا کہ خورجہ پہنچ جایا جائے۔ علی گڑھ میں ٹرین دو منٹ کے لیے رُکے گی پولیس کا اور شہر کے کانگریسیوں کا مجمع ہو گا پنڈت جی کی جھلک بھی مشکل سے مل پائے گی بات چیت کا سوال تو الگ رہا۔ غرض یہ کہ دونوں خورجہ پہنچ گئے اور چلتی گاڑی میں کسی صورت پنڈت جی کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں داخل ہو گئے۔ ان کی کالی شیروانیاں ان کی شناخت تھیں لامحالہ پنڈت جی کی توجہ ان کی طرف ہوئی اور انھوں نے پوچھا کلاسیں چھوڑ کر خورجہ میں کیا کر رہے ہیں انھوں نے جواب دیا آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ پنڈت جی سے ان دونوں کی غالبًا پہلی تفصیلی ملاقات تھی۔ باچھو بھائی جان یونیورسٹی یونین کے پریذیڈنٹ تھے انھوں نے پنڈت جی کو یونی ورسٹی آنے کا دعوت نامہ بھی دے دیا اور وہ قبول بھی ہو گیا۔

اس وقت سر راس مسعود یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ خیالات میں قدرے لبرل تھے پر اتنے بھی نہیں کہ انھیں پنڈت جی کے یونین میں آنے کی بہت خوشی ہو۔ پابندی لگانا بھی مناسب نہ تھا پنڈت جی سے ان کے ذاتی تعلقات تھے اس کے علاوہ ان سے عقیدت رکھنے والے نوجوانوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔ بہر حال راس مسعود نے بہت ہی مصلحت اندیشی

سے کام لیا مقررہ تاریخ اسٹیشن پہنچ کر بذاتِ خود پنڈت جی کا استقبال کیا اور اپنے ہی گھر لا کر ٹھہرایا۔ اور یونین میں ان کا تعارف ان الفاظ میں کروایا۔ یونی ورسٹی پنڈت جی کا پرتپاک استقبال کرتی ہے لیکن ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے نہیں بلکہ بانی یونی ورسٹی کے دوست کے بیٹے کی حیثیت سے۔ پنڈت جی کی شرافت کا تقاضہ کہ وہ اپنی تقریر میں کوئی ایسی بات نہ کہیں جس سے ان کے میزبان کی پوزیشن پر غلط اثر پڑے۔ غرضیکہ وائس چانسلر کی اس ڈپلومیسی نے انصار بھائی اور باچھو بھائی جان کی توقعات پر پانی پھیر دیا۔

ملک میں جہد آزادی کی جو آگ پھیل رہی تھی اس سے مسلم یونی رسٹی علی گڑھ کو محفوظ رکھنے کے لیے ڈاکٹر سر ضیاء الدین زیادہ مناسب سمجھے گئے اور سر راس مسعود کے استعفی کے بعد باوجود ڈاکٹر انصاری اور ان کے ساتھیوں کی مخالفت کے کورٹ نے وائس چانسلری کی کرسی ضیاء الدین صاحب کے سپرد کر دی۔

انصار اور باچھو بھائی جان دونوں ہی نے اپنی کتابوں میں کچھ ایسی حرکتوں کا ذکر کیا ہے جو یقیناً یونی ورسٹی کی انتظامیہ کے لیے پریشان کن صورتیں پیدا کرتی ہوں گی۔

اس دور میں انٹر یونی ورسٹی ڈیبیٹ کی بہت اہمیت تھی۔ یہ دونوں دوست یونی ورسٹی کے بہترین مقررین سمجھے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کا ہر یونی ورسٹی سے تعلق تھا ایک انگریزی کی تقریر میں فرسٹ پرائز لاتا تھا تو دوسرا اُردو کی تقریر میں۔

انٹر یونی ورسٹی ڈبیٹ میں بمبئی کے کچھ اسٹوڈینٹس علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔ ان کی خاطر مدارات کی ذمہ داری اُن دونوں دوستوں پر تھی۔ بڑے فخر کے ساتھ یہ ان کو اپنے سوئمنگ پول لے گئے۔ ان کا سوئمنگ پول دوسری یونی ورسٹیوں کے پولس کے مقابلہ میں وسیع بھی تھا اور اس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی اس کے اوپر چھت تھی آسمان کے نیچے کھلا ہوا نہ تھا۔ بمبئی کے طلبا اس کے سائز اور ساخت سے متاثر ضرور ہوئے لیکن انھیں وہاں دیوار پر شہنشاہ برطانیہ اور ان ملکہ کی لائف سائز تصویر ٹنگی نظر آئی۔ بولے اچھا تو تمھاری یونی ورسٹی کو اپنی وفاداری کے ثبوت کے لیے اس تصویر کی ضرورت ہے۔ ہم نے تو فلورا فاؤنٹن پر ملکہ کے اسٹیچو کی ناک توڑ کر رکھ دی ہے میزبانوں کی غیرت و حمیت کو چوٹ پہنچی۔ دوسرے ہی رات گئے باچھو بھائی جان انصار بھائی اور محسن عبداللہ جو قد میں قدرے لمبے تھے سومنگ پول پہنچے ان کے ہاتھ میں ایک ہاکی کا بلا تھا جس کے سرے پر تولیہ لپٹا ہوا تھا۔ اس بلے کی مدد سے کسی طرح انھوں نے بلڈنگ کی پیچھے کی کھڑکی کا شیشہ توڑا اور انصار بھائی باچھو بھائی جان

محسن بھائی کے کاندھے پر چڑھ کر اندر پہنچے اور تصویر کو فریم سے نکال کر باہر لے آنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور پھر ملکہ اور شاہ دونوں کے چہروں پر سیاہی پھیلا کر وائس چانسلر کے لان کی باؤنڈری سے لگا کر کھڑا کر آئے۔ صبح وہ تصویر ہٹ گئی معاملہ ہش ہش کر دیا گیا۔ رنگے ہاتھوں کوئی پکڑا نہ گیا تھا۔ شبہ کی بناء پر کارروائی کرنا مناسب نہ سمجھا گیا۔ اس کے علاوہ سمجھداری کا تقاضہ تھا کہ ایسی حرکتوں کی پبلسٹی نہ ہو۔

آغا خاں یونی ورسٹی کے پیٹرن تھے ایم اے او کالج کو یونی ورسٹی کا درجہ دلوانے میں آغا کا اہم رول تھا یونی ورسٹی میں ان کے پرزور استقبال کے لیے بہت ہی گہما گہمی تھی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں مسلمان کے حق میں سرکار برطانیہ کی حکومت کے استحکام پر روشنی ڈالی۔ تقریر کے خاتمہ پر حسبِ دستور طلباء سے کہا گیا کہ اگر کوئی سوال ہو تو اجازت ہے۔ سوالوں کے لیے جو ہاتھ اٹھے اس میں ایک انصار بھائی کا بھی تھا۔ اور ان کا سوال تھا کہ آیا سر آغا خاں کو ہندوستان کے مسلمان باشندوں سے زیادہ واقفیت ہے یا عربی و ہندی نژاد کے گھوڑوں کے بارے میں۔ نوجوان مجمع اپنی ہنسی نہ روک سکا سوال بہت ہی معصومانہ انداز میں کیا گیا تھا۔ اور سوالوں کی اجازت تھی پر انتظامیہ کو تو خفت اٹھانی ہی پڑی۔

ایک دفعہ قائدِ اعظم جناح اسٹوڈنٹس کو ایڈریس کر رہے تھے انھوں نے اپنی تقریر میں کہا سیاست شطرنج کا کھیل ہے اور اس کھیل میں ہر لحہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ انصار بھائی کا ہاتھ اُٹھ گیا اور بولے آپ کس کے مہرے ہیں۔ جناح صاحب تھے حاضر دماغ اس سے انکار نہیں صدر جلسہ کی طرف مخاطب ہو کر بولے یہ لڑکا کون ہے جس کی شکل ہندوستان کے نقشہ پر لنکا جیسی ہے ان کے اس جملہ پر قہقہوں کا شور ہونا لازمی تھا اور اس شور میں انصار بھائی کا سوال ڈوب گیا۔

بارہا اس قسم کی حرکتیں ہوتی رہیں مجھے تو حیرت ہے کہ انصار بھائی کے قدم یونی ورسٹی میں جمے کیسے رہے شاید ہر دور میں تعلقات اور سفارشوں میں اثر رہا ہے۔ صرف ڈگریز کا فرق پڑا ہے ہمارے ابا کے ڈاکٹر ضیاء الدین سے تعلقات تھے ہم لوگ ان کے کرایہ دار تھے اور ابا کی اکثر شامیں ان کے ساتھ گزرتی تھیں، باچھو بھائی جان کے سرپرست اور چچا زاد بھائی غلام السیدین تھے جو یونی ورسٹی کے بہت ہی ممتاز اور بااثر پروفیسر تھے۔ بہر حال ایک دفعہ بقول انصار بھائی ان کے لیے بالکل Touch and go کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔

یونین کی طرف سے ایک ڈبیٹ کا اعلان ہوا۔ عنوان تھا مسلمانوں کا مستقبل۔ مقررین میں

تھے نواب چھتاری سکندر حیات صاحب اور نواب زادہ لیاقت علی خاں۔ اسٹوڈنٹس کی طرف باچھو بھائی جان انصار بھائی اور کچھ اور طلباء۔ انصار بھائی نے غالباً اپنی زبان کو کچھ زیادہ ہی چھوٹ دے ڈالی اور مقرر مہمانوں کی خوشامدانہ رویہ پر دل کھول کر چوٹ کی۔ دوسرے ہی دن وہ پرووائس چانسلر ریس بوتھم کے آفس بلائے گئے اور ان کے سامنے دو کاغذ رکھ دیے گئے ایک تھا معافی نامہ اور دوسرا تھا پرووائس چانسلر کا دستخط شدہ ریسٹیکیشن کا حکم نامہ انصار بھائی ایک شش و پنج کے عالم میں تھے۔ پہلے کاغذ پر دستخط میں غیرت اور دوسرے کاغذ پر دستخط کے لیے ان کی مصلحت حائل تھی۔ یونی ورسٹی چھوڑنے کا مطلب تھا اسٹوڈنٹس کی تحریک سے دوری۔ ان کی حاضر دماغی کام آئی بولے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ میں اس کاغذ پر دستخط نواب صاحب کے سامنے کروں۔ پرووائس چانسلر صاحب نے سوچا کہ نواب صاحب کی ناراضگی دور کرنے کا یہ بہتر طریقہ ہے سو راضی ہو گئے۔ دوسرے دن وہ انصار بھائی کو لے کر نواب صاحب کے پاس گئے اور ان کے سامنے صورت حال رکھی گئی۔ ان کی نوابی رگ کام آئی ویسے بھی دل کے بڑے تھے اس بات سے خوش ہو گئے کہ باغی لڑکا خود معافی مانگنے آیا ہے۔ آگے کے لیے تنبیہ کر کے معاملے کو رفع دفع کروادیا۔

غرضیکہ انصار بھائی ۳۸ء تک یونی ورسٹی میں رہے اور وہاں سے ایل ایل بی کر کے نکلے۔ اسی دوران ۳۷ء میں انھوں نے آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی باضابطہ تنظیم کی۔ اس کی کہانی بھی اپنی جگہ دل چسپ ہے۔

پنڈت جی اور سبھاش بابو دونوں ہی کو نوجوانوں کی قوت کا اندازہ تھا اور دونوں ان کو منتظم کرنے کے خواہش مند تھے۔ لیکن اس کام کی ابتدا ہوئی یوپی کے گورنر سر ہیلی کے بوئے ہوئے بیج سے۔ ان کے بوئے ہوئے بیج نے جو صورت اختیار کی وہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ رہی ہوگی۔ انھوں نے سر تیج بہادر کو سپرو کی چیر مین شپ میں نوجوانوں کے مسائل پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی۔ اور لکھنؤ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کو مشورہ دیا کہ صوبہ کی تمام یونی ورسٹی یونینس کو ایک فیڈریشن کی صورت دیں۔ ان کا مقصد تھا کہ اس تنظیم کے ذریعہ طلبا کو قابو میں رکھنا زیادہ آسان ہوگا۔ سر یعقوب خاں کی صدارت میں کانفرنس منعقد کی گئی۔ علی گڑھ یونی ورسٹی یونین کی نمائندگی انصار بھائی نے کی۔ صدارتی تقریر کے بعد یہ تجویز پیش کی گئی کہ مزید کارروائی سے پہلے شہنشاہ جارج پنجم کی موت پر تعزیتی ریزولیشن پاس کیا جائے۔ اسی سال برٹش ہاؤس آف کامن کے ایک کمیونسٹ ممبر شوجی سکست والا کا انتقال ہوا تھا۔ انور جمال قدوائی اور انصار بھائی نے مطالبہ کیا کہ ان کا نام بھی تعزیتی ریزولیشن

میں شامل کیا جائے۔ میٹنگ میں ایک ہنگامی صورت پیدا ہو گئی۔ اور سر محمد یعقوب خاں کو میٹنگ کو ملتوی کر کے عقبی دروازہ سے ہال چھوڑنا پڑا۔ بہتیرے ان کے ساتھ ہوئے۔ جو باقی رہ گئے تھے۔ انھوں نے ایم ایم بدیع الدین کی صدارت میں ایک ریزولیوشن پاس کیا۔ کہ ہندوستان کی تمام یونی ورسٹیوں کے نمائندوں کو بلا کر ایک میٹنگ کی جائے اور آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد ڈالی جائے اور یہ ذمہ داری انصار بھائی کے سپرد ہوئی۔

انصار بھائی نے تمام یونی ورسٹیوں سے رابطہ قائم کیا اور یہ طے پایا کہ صدارت کے لیے مسز نائیڈو کو مدعو کیا جائے اور افتتاح کے لیے پنڈت نہرو کو۔ اس سلسلہ میں انصار بھائی مسز نائیڈو سے ملنے بمبئی پہنچے۔ مسز نائیڈو نے مشورہ دیا کہ اس کام کے لیے مسٹر جناح زیادہ مناسب رہیں گے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے اور مسلمانوں کے ابھرتے ہوئے جذبات کا خیال کرتے ہوئے سب ہی کو یہ تجویز مناسب نظر آئی۔ انصار بھائی جناح کے پاس پہنچے اور ان سے ان کی رضامندی حاصل کرلی۔ انصار بھائی نے اپنی اوٹوگراف بک ان کو دی جس پر انھوں نے لکھا Work For Hindu Muslin Unity (ہندو مسلم اتحاد کے لیے کام کرو۔) اس وقت تک ان کے ذہن میں دور دور یہ بات نہ تھی کہ وہ خود اس اتحاد کے سب سے خطرناک اور جان لیوا دشمن ثابت ہوں گے۔

آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی پہلی میٹنگ ۳۶ء میں ہوئی اور اس تنظیم کی بناء پر پڑ گئی۔ یہ آخری موقعہ تھا جب پنڈت جی اور مسٹر جناح ایک ڈائس پر بیٹھے۔ اس کے بعد تو ان دونوں کا درمیانی فاصلہ بڑھتا رہا۔ آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی شاخیں برہما اور انگلستان تک پھیلیں۔ برہما انصار بھائی خود گئے۔

آگے چل کر مذہب نے طلبا کی تحریک کو کمزور کرنے میں بھی اپنا رنگ دکھایا اور سر ضیاء الدین کے اشارہ پر مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام ایک ایسوسی ایشن الگ قائم ہو گئی اس کے باوجود تاریخ گواہ ہے کہ سلطنت برطانیہ کے پیر اکھاڑنے میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا ایک بہت ہی اہم رول رہا۔ یونی ورسٹی لائف ختم کرنے کے بعد بھی انصار بھائی پیٹرن کی حیثیت سے اس تنظیم کے کرتا دھرتا بنے رہے۔

۱۹۳۸ء میں ہمارے ابا سرکاری نوکری سے ریٹائرڈ ہو گئے اور ہم لوگ علی گڑھ سے لکھنو آ گئے۔ اور انصار بھائی اور باچھو بھائی جان جرنلزم کی ٹریننگ کے لیے بمبئی روانہ ہو گئے۔ بمبئی کرانکل کے اڈیٹر عبداللہ بریلوی نے ان کو پینتیس روپیہ ماہانہ پر آپرینٹس شپ کی جگہ دے

دی۔ صبح سے شام تک کے لیے مختلف نوعیت کے کام ان کے سپرد کیئے گئے۔ کچھ دن تو باسط انصاری کی کھولی میں زمین پر سو کر گزارے پھر پندرہ روپیہ مہینہ پر ایک الگ کوٹھلی مل گئی۔ ان کے ساتھ دو ستو کے تھیلے تھے ایک گیہوں کے ستو کا جو پانی پت سے باچھو بھائی جان اپنے ساتھ لائے تھے اور دوسرا تھیلا چاول کے ستو کا جو انصار بھائی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ادل بدل کر صبح کا ناشتہ اس سے ہو جاتا تھا۔ ناشتہ کر کے ایک ایک روپیہ جیب میں ڈالتے اور ٹرام سے سفر کر کے اخبار کے دفتر پہنچتے سستا زمانہ تھا کھانے پینے اور ٹرانسپورٹ کا انتظام ایک روپیہ میں ہو جاتا تھا۔ رات گئے واپس ہوتے بمبئی کے اس قیام کے دوران انصار بھائی کو مسز کملا دیوی چٹوپادھیائے صفیہ سوم اور عطیہ فیضی جیسی خواتین سے ملنے کا موقعہ ملا عطیہ فیضی مسلمان خواتین میں پہلی تھیں جنھوں نے پردہ کی قید توڑی تھی۔ ان کے گھر ہر اتوار کو ایک کلچرل پروگرام ہوتا تھا۔ نوعیت خواہ ادبی ہو یا سیاسی و سماجی ان سے کسی موقعہ پر ان کے گھر انصار بھائی کو برناڈ شاہ و رادھا کرشنن کو دیکھنے کا موقعہ ملا تھا۔ اور اسی دوران مسز نائیڈو سے قربت بڑھی۔

اخبار کی ٹریننگ ختم کر کے انصار بھائی لکھنو واپس ہوئے۔ اور پنڈت جی کی ہدایت پر نیشنل ہیرالڈ جوائن کیا۔ اس وقت یوپی سے دو انگریزی اخبار نکلتے تھے دونوں کا ہی رجحان تحریک آزادی سے میل نہیں کھاتا تھا کسی نیشنلسٹ رجحان کے اخبار کی شدید ضرورت تھی۔ پنڈت جی نے ایسوسی ایشن آف جرنلزم کے نام سے ایک کمپنی کا اعلان کیا۔ ایک ایک روپیہ اور دس دس روپیہ کے کوپن چھپے جن کی فروخت کی ذمہ داری وڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی کو دی گئی۔ پنڈت جی اور رفیع احمد قدوائی کے توسط سے زمینداروں اور رؤساء سے کچھ بڑے چندے بھی حاصل ہوئے۔ اور پنڈت جی کی چیرمین شپ اور رفیع صاحب کی ڈائریکٹر شپ میں نیشنل ہیرالڈ کا اجراء ہو گیا اور ساتھ ہی ساتھ انصار بھائی کے جرنلزم کے کریئر کی باضابطہ ابتدا۔ آگے چل کر انصار بھائی نے جرنلسٹوں کی ایک ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی تاکہ ان کے تحفظ کے لیے اخبار والوں کے ہاتھ مضبوط ہوں اور وہ ڈائریکٹر کے رحم و کرم پر نہ رہیں۔

یہ دور عالمی تاریخ میں اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستان اور کانگریس کی تاریخ میں بھی بہت ہی ہنگامی دور تھا۔ دنیا دوسری جنگ عظیم کے دہانے پر کھڑی ہوئی تھی۔ ۱۹۳۵ کے ایکٹ آف انڈیا کے تحت ہندوستان کو صوبائی خود مختاری مل چکی تھی۔ اور دو سال بعد صوبوں میں قومی اسمبلیاں بھی منتخب ہو چکی تھیں۔ لیکن مکمل آزادی اور خود مختاری کا مطالبہ اپنی جگہ تھا جو زور پکڑ رہا تھا۔

کانگریس میں انتہائی انتشار کی صورت حال تھی۔ ۳۸ء میں گاندھی جی کی اجازت اور مرضی کے مطابق آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی صدارت کے لیے سبھاش جی منتخب ہو چکے تھے۔ لیکن گاندھی جی کی یہ توقع کہ بوس بابو کی سوچ کا اندازہ بدل گیا ہے بے بنیاد ثابت ہوئی۔ اُن کے رجحان اور گاندھی جی کے بتائے ہوئے راستہ میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ بوس کا مطالبہ تھا کہ جنگ میں مبتلا حکومت برطانیہ کے مسائل اور پریشانی سے پورا فایدہ اٹھایا جائے اور ان کو ہندوستان سے اپنا بوریہ بستر باندھنے کے لیے چھ مہینہ کا نوٹس دے دیا جائے۔ اِدھر گاندھی جی کا مشورہ انگریزوں کے لیے یہ تھا کہ ہتھیاروں کا استعمال ترک کر کے اپنی اخلاقی قوتوں کے استعمال سے ہٹلر کے تشدد کا مقابلہ کریں۔

۱۹۳۹ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے الیکشن میں سبھاش بوس کے مقابلہ میں پتابھائی پٹیل کھڑے ہوئے۔ انھیں شکست ہوئی اور اس شکست کو گاندھی جی نے اعلان کیا کہ ان کی شکست ہے اور ساتھ ہی ساتھ مشورہ دیا کہ نئی کیبنٹ بنائی جائے تاکہ بوس بابو کے بتائے ہوئے راستہ پر پارٹی چل سکے۔ پنڈت جی نے حد بھر گاندھی بوس بابو کے درمیان سمجھوتے کی کوشش کی لیکن ناکامیاب رہے۔ بالآخر نتیجہ میں ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں نے نیتا جی کے ساتھ تعاون سے انکار کیا اور ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ اس صورت حال میں سبھاش چندر بوس کو کانگریس سے استعفیٰ پر مجبور ہونا پڑا۔

انصار بھائی اسی سال یوپی کانگریس کمیٹی کی طرف سے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ممبرشپ کے لیے منتخب ہوئے تھے اور اس وقت اس کمیٹی کے کمسن ترین ممبر تھے۔

گاندھی جی اور بوس کے اختلافات نے انھیں ایک دوراہے پر کھڑا کر دیا تھا۔ لیکن ان کے ذہن میں کوئی کشمکش نہ تھی۔ انھیں گاندھی جی کے مذہبی رجحانات میں ڈوبے ہوئے وچاروں سے کبھی بھی عقیدت نہ تھی۔ ابتدا سے ان کے ہیرو پنڈت جی تھے۔ لیکن اس ہیرو ورشپ اور عقیدت میں بھی دھیرے دھیرے کمی ہو رہی تھی اور اس کی وجہ پنڈت جی کی وہ جنٹلمین شپ اور سادہ لوحی تھی جس کی طرف باچھو بھائی جان نے اپنی سوانح عمری میں اشارہ کیا ہے اور جو پنڈت جی کو پٹیل جیسے فرقہ پرست انسان کے دباؤ میں لے آتی تھی۔ اس وقت انصار بھائی میں جوانی کا جوش تھا آزادی کے لیے ہر قربانی کا جذبہ تھا انھوں نے پنڈت جی کا دامن جھٹک کر بوس کا ہاتھ تھاما اور کانگریس چھوڑ فارورڈ بلاک جوائن کیا۔ یہ قدم انھیں اس طرف لے گیا جو مستقبل میں ان کے ذاتی مفاد کے لیے بہت ہی مضر ثابت ہوا۔

اسی دوران وائس رائے نے ہندوستان کو ڈومینین اسٹیٹس کا تحفہ عطا کیا۔ لیکن تاریخ غیر متعین اور شرط یہ کہ تمام مذہبی فرقوں میں اتفاق رائے ہو جنگ میں ہندوستان کے تعاون کی اہمیت بڑھتی جارہی تھی۔ اس کے زیر نظر کانگریس نے ۱۹۴۰ء کے پونا سیشن میں اپنے تعاون کا اعلان کیا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ شرط رکھی کہ ہندوستان کو مکمل خود مختاری دی جائے۔ اس وقت چرچل کا رویہ سخت تھا۔ سو جواب انکار میں ملا اور تحریک آزادی کے تمام لیڈرس جیل میں بند کردئے گئے۔

جنگ کے شعلے تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ ہندوستان کے تعاون کے سلسلہ میں امریکہ کا برطانیہ پر دباؤ تیزی سے بڑھ رہا تھا ہندوستان سے کسی قسم کا سمجھوتہ وقت کی شدید ضرورت تھی۔ سو تیس اکتوبر ۱۹۴۰ء کے سیاسی قیدی چار دسمبر ۱۹۴۱ میں رہا کردئے گئے۔ اس کے تین دن بعد جاپان نے پرل ہار پر بمباری کردی۔

کانگریس کی قومی تحریک کسی جھکاؤ پر آمادہ نہ تھی عوام کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔ لہذا سات اگست ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی کو کوئٹ انڈیا (بھارت چھوڑو اور "ڈو اینڈ ڈائی" (کرو اور مرو) کا نعرہ اپنانا ہی پڑا۔ اور انفرادی طور پر ستیہ گرہ کی تحریک چلائی گئی۔ سب ہی ممتاز لیڈروں کو گرفتار کرلیا گیا۔ ایک اسٹڈی کے مطابق ملک میں ساٹھ ہزار گرفتاریاں اور ایک ہزار موتیں ہوئیں۔

یہ تھا وہ سیاسی پس منظر جب انصار بھائی نے کانگریس چھوڑ فارورڈ بلاک جوائن کیا تھا۔ اور دیس کے کونہ کونہ سبھاش بوس کا پیام پہنچانے کے لیے کمربستہ تھے۔ ۱۹۴۱ء میں اشتعال انگیز تقریر لکھے جانے پر گرفتار کرلیے گئے۔ ایک سال قید اور پانچ سو روپیہ کا جرمانہ۔ جرمانہ کی غیر ادائیگی کی صورت میں جیل کی مدت میں مزید چھ مہینہ کا اضافہ یہ تھی سزا۔

گھر والوں نے بغیر ان کو بتائے ہوئے جرمانہ کی رقم ادا کردی۔ اور وہ ایک سال بعد رہا کردئے گئے۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد ۱۹۴۲ء کی گرفتاریوں کی لسٹ میں ان کا بھی نام تھا۔ ایک پولیس آفیسر کے ذریعے جس سے اسرار بھائی سے بچپن کی دوستی تھی۔ انصار بھائی کو اپنے وارنٹ گرفتاری کی خبر مل گئی۔ اور وہ انڈر گراؤنڈ ہوگئے انھوں نے ایک پٹھان کا بھیس بدل کر مغربی سرحد پار کرکے ہندوستان کے باہر جانا چاہا تاکہ ہندوستان کی آزادی کے لیے باہری قوتوں سے مدد حاصل کرنے میں سبھاش جی کا ہاتھ بٹا سکیں۔ اس کوشش میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر وہ مشرق کی طرف آئے اور ہمایوں کبیر کی مدد سے برما میں پہنچنے میں کامیاب

ہو گئے۔ اتفاق کہیے یا قسمت۔ تھکے ہارے ایک کھیت میں پڑے تھے کہ ایک فوجی کے ڈنڈے نے انھیں اپنی آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا۔ پتہ چلا کہ اُسی دن برما انگریزوں کے قبضہ میں آچکا تھا۔ ان کو گرفتار کر کے کلکتہ لایا گیا۔ اور علی پور جیل میں نظر بند کر دئے گئے۔

جنگ کے خاتمے پر تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا اور انصار بھائی کو بھی علی پور اور اس کے بعد بریلی جیل میں کئی سال گزارنے کے بعد رہائی نصیب ہوئی۔

اٹھارہ اگست ۱۹۴۵ میں سبھاش بوس کی ایک جہاز حادثے میں موت ہو چکی تھی۔ اب انصار بھائی کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ کانگریس جوائن کریں۔ سیاسی زندگی کے ان موڑوں کی انھیں آگے چل کر خاصی بھاری قیمت چکانی پڑی۔

دیس کو غلامی سے آزاد کرانے کے لیے سبھاش بابو نے فاشسٹ قوموں کا ہاتھ تھاما تھا اور انصار بھائی نے سبھاش بابو کا۔ اس عمل میں انصار بھائی اپنے اس نیتا کا اعتبار اور اعتماد کھو چکے تھے جس نے گاندھی جی کے بتائے ہوئے راستہ پر چل کر ہندوستان کی آزادی حاصل کی تھی۔ بھلے اس کی قیمت دیس کا اتحاد تھا۔ قیمت کتنی بھاری تھی تاریخ اس کا فیصلہ کرے گی۔

دو جون ۱۹۴۷ء کی میٹنگ میں پنڈت جی نے ماؤنٹ بیٹن کی اس اسکیم پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ جس کے تحت ہندوستان مذہب کی بناء پر دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ ہندوستانی قوم اور ہندوستانی قوم پر ہندو اور مسلمان کا ٹھپہ لگ گیا۔ ہندوستانی مسلمان آج تک اس تصفیہ کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔

چودہ جون کو کرزن روڈ پر کانسٹی ٹیوشن ہاؤس میں آل انڈیا کانگریس منعقد ہوئی۔ ماؤنٹ بیٹن کی تجویز ووٹرس کے سامنے رکھی گئی۔ اور تقسیم ہند کے فیصلے پر باضابطہ مہر لگ گئی۔ ایک سو ستاون ووٹس موافقت میں تھے۔ صرف انتیس مخالفت میں۔ غرضیکہ قبولیت کی مہر لگ گئی۔ ملک تقسیم ہو گیا۔

چودہ اگست کی رات کو پنڈت جی نے ان الفاظ کے ساتھ ملک کی باگ ڈور سنبھال لی۔

"At the strike of mid night hour, when the world sleeps, India will awake to life and freedom".

"جب بارہ کا گھنٹہ بجے گا اور دنیا سو رہی ہو گی ہندوستانی آزادی اور زندگی کی سانس لے گا"

انصار بھائی ۴۶ء میں جیل سے رہا ہوئے۔ کانگریس بے شک جوائن کی۔ نیشنل ہیرالڈ انہیں جوائن کیا۔ جانے ان کی پرانی ملازمت انھیں ملی نہیں یا ان کے دل نے پوری طرح سے کانگریس کا ماؤتھ پیس بننا قبول نہیں کیا۔

جنگ کے دوران خصوصاً جنگ میں جاپان کی شرکت کے بعد کلکتہ کے خوشحال طبقہ میں ہجرت کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ اور بنگالی آبادی کی خاصی بڑی تعداد یوپی کی طرف منتقل ہو رہی تھی۔ کلکتہ کے اخبار امرت بازار پتریکا نے تشنکر کانتی گھوش کی اڈیٹر شپ میں اپنا ایک ایڈیشن الہ آباد سے نکالنے کا فیصلہ کیا اور انصار بھائی نے اس اخبار کے لیے لکھنو کا ڈیسک سنبھالا۔

امرت بازار پتریکا بھی کانگریسی رجحان کا اخبار تھا۔ لیکن اس وقت تک صحت مند تنقید پارٹی کے مفاد میں سمجھی جاتی تھی۔ صحیح جرنلزم کا مقصد تھا سچ کو پبلک کے سامنے لانا۔ یہ نہیں کہ جھوٹ کو سچ بنایا جائے اور سچ کو جھوٹ۔ لیکن سچ ہمیشہ سے کڑوا رہا ہے۔ عام طور پر مسئلہ کا تعلق کسی نہ کسی ذات سے ہوتا ہے۔ اور جیسے جیسے ذاتی مفاد کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے صحت مند تنقیدوں کی راہوں میں رکاوٹیں پیدا ہوتی جا رہی تھیں۔ انصار بھائی نے اپنے پیشہ میں بھی مصلحت اندیشی سے کام نہ لیا۔

پنت جی یوپی کے وزیر اعلیٰ تھے۔ انھوں نے انگریز حکمرانوں کے نقشِ قدم پر چل کر موسم گرما میں اپنا سکریٹریٹ نینی تال منتقل کیا۔ اس سلسلہ میں جو اخراجات ہوئے اس پر انصار بھائی نے اخبار میں اعتراضات کر کے پنت جی کی ناراضگی میں مزید اضافہ کیا کچھ سرکاری اداروں کی بدعنوانیوں کا پردہ فاش کر کے اور افسران کے ذاتی اخراجات پر نکتہ چینی کر کے اخبار کے اڈیٹروں پر بھی مصلحتوں کی عائد کردہ کچھ پابندیاں تو ہوتی ہیں انصار بھائی سے کہا گیا کہ وہ لکھنو کا ڈیسک چھوڑ کر الہ آباد کے دفتر کا کوئی دوسرا شعبہ سنبھال لیں۔۔ انصار بھائی کی انا کو چوٹ لگی اور انھوں نے یہ ملازمت بھی ترک کر دی۔

پنت جی کی انصار بھائی سے ناراضگی کتنی جائز تھی اور کتنی ناجائز میرے لیے کچھ کہنا مناسب نہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ انصار بھائی کو سبق سکھانا چاہتے تھے یوپی اسمبلی میں خلیق الزماں صاحب کے استعفیٰ دینے کے بعد سیٹ خالی ہوئی یوپی کانگریس نے انصار بھائی کا نام تجویز کیا لیکن اوپر سے یہ نام رد کر دیا گیا۔ کونسٹی ٹیوشن اسمبلی میں انصار بھائی کے مقابلے میں حیدر حسین لیگ کے نامور کارکن کو ترجیح دی گئی۔ اس وقت کی پالیسی بھی کچھ اس

اصول پر تھی کہ اپنے تو اپنے ہی رہیں گے۔ غیروں کو اپنانا چاہیے۔ اس پالیسی کا فائدہ لیگ کے ان کارکنوں کو ملا جو اپنی کسی ذاتی مجبوری کی وجہ سے پاکستان نہیں جاسکے تھے۔ ۱۹۵۱ء کے لوک سبھا کے پہلے الیکشن کے لیے باوجود مولانا آزاد کی کوششوں کے باوجود یوپی سے انصار بھائی کا نام نہیں بھیجا گیا۔ نام تھا بیگم اعزاز رسول کا جو مسلم لیگ کی خواتین کے ونگ کی صدر رہ چکی تھیں اور نواب چھتاری و کرنل زیدی وغیرہ کے۔

امرت بازار پتریکا چھوڑنے کے بعد کچھ عرصہ انصار بھائی بے روزگار رہے۔ بہت ہی مشکل سے اپنے دوست خواجہ احمد عباس کی کوششوں سے انھیں بلٹز میں کام ملا اور مسٹر کرنجیا نے یوپی کی خبروں کی ذمہ داری ان کے سپرد کی۔

انصار بھائی نے لگتا ہے بالکل ہی عقل کا دامن چھوڑ دیا تھا سبق پر سبق ملتے رہے پھر بھی کچھ نہ سیکھا۔ چاہیے تو پنت جی کی کدورت کے خلاف غصہ سمجھیے یا انتہائی حد گی اصول پرستی۔ قلم کو کچھ زیادہ ہی بے لگام چھوڑ دیا۔ بہر حال بلٹز میں کچھ ایسی خبریں چھپیں کہ پنت جی کی طرف سے بلٹز کے ایکٹنگ اڈیٹر کے لیے وارنٹ گرفتاری کی نوبت آگئی۔ اور بمبئی سے ان کو گرفتار کر کے لکھنؤ کی عدالت کے سامنے پیش کرنے کے لیے لایا گیا۔ دوڑ دھوپ کے بعد اس قانونی نکتہ سے فائدہ اٹھایا گیا کہ لکھنؤ سے جاری کیے ہوئے وارنٹ کی حدیں یوپی ہی تک ہیں سو لکھنؤ سے باہر گرفتاری غیر قانونی ہے۔ سو ہوا یہ کہ جیل سے باہر تو کر دئے گئے لیکن اس انتظام کے ساتھ کہ لکھنؤ سے ان کی نکاسی کے تمام راستوں پر پہرہ رہے اور دوسری صبح وہ لکھنؤ میں ہی گرفتار کر لئے جائیں۔ انصار بھائی اور ان کے ساتھیوں کی انڈر گراؤنڈ رہائش کی ٹریننگ کام آئی اور جانے کس طرح راتوں رات ایکٹنگ اڈیٹر صاحب لکھنؤ سے دلی پہنچ گئے۔ یوپی گورنمنٹ کو بھی بہانے چاہیے تھے کہ بارہا بلٹز کے خلاف نوٹس جاری ہوتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انصار بھائی کو یہاں سے بھی چھٹی مل گئی۔

یہ دوران کی زندگی کا تاریک ترین دور تھا۔ تمام اخباروں کے دروازے ان پر بند تھے۔ صرف اپنی بھوک کا معاملہ ہوتا تو پیٹ پر پتھر باندھ کر گزارا کر لیتے۔ پھر چھوٹے چھوٹے بچوں اور بیوی کا ساتھ تھا۔ کچھ دن تک بیوی کے جہیز کے زیور اور برتن کام آتے رہے۔ لیکن آخر کب تک۔ مجبور ہو کر پنڈت جی کی مدد مانگی۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے پبلیکیشن ڈیپارٹمنٹ میں ایک معمولی سی نوکری ملی اور روٹی کا سہارا ہوا۔

دوسرے الیکشن کا وقت آیا۔ رامپور کی سیٹ کے لیے مولانا آزاد کا نام تجویز کیا گیا۔ پہلے ہی

الیکشن سے ٹکٹ کی تقسیم کے سلسلہ میں غالباً یہ اصول اپنالیا گیا تھا کہ ٹکٹ اس کو ملے گا جس کے سامنے ووٹ حاصل کرنے کے زیادہ سے زیادہ امکانات ہوں۔ ان امکانات کی بناء کیا ہے؟ ذات پات مذہب یا پیسہ اس سے کوئی سروکار نہیں۔ قومی خدمت کا پلہ بہت ہلکا پڑ گیا تھا۔ مولانا آزاد کی شخصیت ایسی تھی کہ انھیں ووٹس حاصل کرنے کے لیے کسی ایسی کونسٹی ٹیونسی کی ضرورت نہ تھی جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہو۔ انھوں نے رام پور کے ٹکٹ سے انکار کر دیا اور اپنی جگہ انصار بھائی کا نام تجویز کیا۔

سمپورنانند یوپی کے چیف منسٹر تھے۔ انھوں نے انصار بھائی سے پوچھا کہ وہ شیعہ ہیں یا سنی۔ چوں کہ نواب رام پور شیعہ تھے ان کی مدد اس صورت میں حاصل ہو سکتی تھی کہ امید وار شیعہ ہو۔ غرضیکہ مولانا کی تجویز رد کر دی گئی۔ لال بہادر شاستری نے بالکل آخری وقت میں یہ طے کیا کہ وہ فتح پور سے نہیں بلکہ الہ آباد سے الیکشن لڑیں گے۔ ان کے اور مولانا کے بھرپور زور لگانے کے بعد انصار بھائی کو فتح پور کی سیٹ ملی اور وہ ووٹوں کی کافی اکثریت سے اس جگہ پہنچے جہاں دیس کی قسمت کے فیصلے ہوتے ہیں۔

تیسرے الیکشن میں بھی وہ اپنی پرانی سیٹ چاہتے تھے لیکن اس سیٹ کے خواہش مند کوئی وہ صاحب تھے جو پنڈت جی سے بہت قریب تھے۔ بہر حال انصار بھائی کو اپنی پرانی سیٹ تو نہ ملی البتہ بسولی کی سیٹ مل گئی اور وہ وہاں سے جیت گئے چوتھے الیکشن میں ہوا کا رُخ کانگریس کے خلاف تھا۔ کانگریس کو چھ صوبوں میں ناکامیابی ہو گئی۔ اس ہوا کے زد میں انصار بھائی بھی آئے اور انصار بھائی کا دس سالہ پارلیمنٹ کا کیرئیر ختم ہو گیا۔

ممکن ہے یہ میری خوش فہمی ہو یا ماضی کی یادوں کو خوبصورت رنگ دینے کا رجحان۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت کے ممبران میں نمایاں پوزیشن ان کی تھی جو ملک کے مسائل میں خواہ مخالفت ہو یا موافقت اپنی ذاتی اغراض سے کچھ حد تک اونچے ہو کر حصہ لیتے تھے۔ انصار بھائی اور فیروز گاندھی پارلیمنٹ کے بہت ہی سرگرم ممبروں میں سے تھے۔ ان دونوں کی دوستی بہت ہی پرانی تھی۔ نیشنل ہیرالڈ میں دونوں ساتھی تھے۔ فیروز گاندھی بے حد محنتی تھے اور انصار بھائی اچھے مقرر۔ دونوں بلا لحاظ اس کے کہ مسئلہ کی ذمہ داری اپنی پارٹی پر ہے یا مخالف پارٹی پر۔ اعتراضات تنقید اور بحث و مباحثہ سے باز نہ آتے تھے۔

پنڈت جی میں جو بھی کمزوری رہی ہو۔ ان کی اس خصوصیت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ جمہوریت میں عقیدہ ان کا ایمان تھا اور وہ صحت مند تنقید ہمت افزائی کرتے تھے خواہ تنقید

ان کی اپنی پارٹی ہی کی کیوں نہ ہو۔

کرشنم اچاری کے پاس منسٹری اوف کامرس تھی۔ پنڈت جی کو ان پر بہت بھروسا تھا۔ منسٹر صاحب نے اشیاء تعیش کے امپورٹ کے لائسنس دینے میں ضرورت سے زیادہ ہی فیاضی دکھائی۔ جس کی وجہ سے ملک کے بیرونی زر کے اثاثہ پر بہت نقصان دہ اثر پڑا۔ اس کے علاوہ اور بھی خرد برد کیے۔ مندھرا جیسے شخص کی سرپرستی کی۔ جسے اپنے کالے کرتوتوں کی بناء پر جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ انصار بھائی اور فیروز گاندھی نے ان تمام معاملات کے متعلق مال مسالہ جمع کر کے ہاؤس کے سامنے رکھا۔ پنڈت جی کو مجبور ہونا پڑا کہ مندھرا کیس جسٹس چھاگلا کے سامنے پیش ہو۔ اور اس عدالت کے فیصلے کے بعد کرشنم اچاری کو استعفیٰ دینا پڑا۔

پارلیمنٹ کے ایک ممبر تھے ڈاکٹر دھرماتیجا۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ کسی امریکن یونی ورسٹی سے نیوکلیر سائنس میں پی ایچ ڈی کر کے آئے ہیں پنڈت جی ان سے خاصے مرعوب تھے۔ انھوں نے جانے کہاں سے پیسہ حاصل کر کے ایک بحری جہاز کی کمپنی کھول لی اور بغیر اجازت سرکاری گارنٹی کا ناجائز استعمال کیا۔ فیروز گاندھی اور انصار بھائی کو اس کی ہوا لگی اور انصار بھائی پنڈت جی کو خبردار کرنے پہنچ گئے۔ اور ڈانٹ سن کر لوٹا دیے گئے کہ مارواڑیوں میں ایک پڑھی لکھی شخصیت آگے بڑھ رہی ہے اور تم لوگ اس کے پیچھے پڑے ہو۔ آگے چل کر دھرماتیجا کا کاروبار ایسے خطرناک موڑ پر پہنچا کہ انھیں ملک چھوڑنا پڑا اور کچھ دنوں بعد ہندوستان لائے گئے اور تہاڑ جیل کے سپرد کر دیے گئے۔ پرائم منسٹر کے اسپیشل سکریٹری ایم او متھائی کو اپنی پوسٹ سے ہاتھ دھونا پڑا اس میں بھی ان دونوں دوستوں کا ہاتھ تھا۔ مزید مال مسالہ جمع کر کے انھوں نے بھوپیش گپتا (کمیونسٹ ممبر) کے سپرد کر دیا تھا۔

کیرلا کی کمیونسٹ گورنمنٹ کو گرانے کا مسئلہ اٹھا۔ فیروز گاندھی اور انصار بھائی نے پریذیڈنٹ رول اور کانگریس کے مسلم لیگ سے مل کر کیرلا میں گورنمنٹ بنانے کی شدید مخالفت کی لیکن مسز گاندھی کا پلہ جو اس وقت کانگریس پارٹی کی صدر تھیں بھاری رہا۔ اور یہ لوگ اپنی کوشش میں ناکامیاب رہے۔

پارلیمنٹ سے الگ ہونے کے بعد کچھ عرصہ کے لیے انصار بھائی کو مائینورٹی کمیشن کی چیرمین شپ مل گئی۔ اس پوسٹ کی مدت ختم ہونے پر ان کے ہاتھ خالی تھے اور سر چھت سے محروم۔

یہ تھی انصار بھائی کی سیاسی و معاشی زندگی۔ اس سے شاید ہی کوئی انکار کرے کہ آزادی کے

پودے کی آبپاشی انھوں نے جان توڑ کر کی۔ لیکن یہ پودا جب توانا ہوا اس میں پھل لگ آئے۔ تقسیم میں انصار بھائی کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ انھوں نے کبھی کسی کے خلاف شکایت و شکوہ کا اظہار نہیں کیا لیکن جیسے ان کا پھلوں سے کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو۔

ان کی زندگی کی کہانی میں دوسرا باب ان کی نجی اور خانگی زندگی کا ہے۔ افسوس یہاں بھی قسمت نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ اور انھیں ناخوشگواریوں کا مقابلہ کرتے ہی رہنا پڑا۔

جوانی میں ان کی شخصیت بہت پر کشش تھی۔ اچھے کھانے اچھے پہنے اور اسمارٹ رہنے کا شوق تھا۔ اس سلسلہ میں باچھو بھائی جان نے ایک دل چسپ واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ دیر رات وہ ہمارے گھر پہنچے انصار بھائی کو پلیٹ فارم گردی کے لیے بلانے۔ دوستوں میں طے تھا کہ کھڑکی کے پاس وہ کتے کے بھونکنے کی آواز نکالیں گے اور اس آواز پر انصار بھائی خاموشی کے ساتھ باہر نکل آئیں گے۔ ایک رات ان کے نکلنے میں دیر ہوئی۔ دوستوں نے وجہ تاخیر پوچھی۔ انصار بھائی نے جواب دیا کہ وہ کولڈ کریم کی شیشی تلاش کر رہے تھے جو اندھیرے میں مل نہیں رہی تھی۔ سوال ہوا کہ اس وقت کولڈ کریم کی کیا ضرورت پڑ گئی۔ جواب تھا کیا خبر کوئی لڑکی نظر آجائے۔ کھدپوش ہونے کے بعد بھی وہ اپنے کرتے پاجاموں کی سفیدی اور کلف واستری کا بہت دھیان رکھتے تھے۔

جوانی کے کچھ تقاضہ ہوتے ہیں۔ ان کے تشفی کے لیے۔ اور ان کے دوست عبداللہ لاج پہنچ جایا کرتے تھے۔ پاپا میاں (شیخ عبداللہ) سے بہت قرب رکھتے تھے بہانہ تھا تعلیم نسواں کی حمایت اور اس تحریک میں شرکت۔ اس وقت اس کوٹھی کی حیثیت ایک پرستان کی سی تھی۔ اس کی باسی لڑکیاں حسین پڑھی لکھی اور پردے کی پابندیوں سے آزاد تھیں۔ آگے چل کر ان کی زندگی سیاسی و سماجی مسائل میں کچھ ایسی الجھی کہ ملک کی آزادی ہی جذبہ عشق کا مرکز بن کر رہ گیا۔ تھوڑے بہت ہلکے پھلکے فلرٹیشن ضرور ہوئے ہوں گے لیکن دل کو پوری طرح کسی کے سپرد کر دیا جائے اس کی فرصت نہ تھی۔

ملک کو آزادی مل گئی۔ محبوبہ حاصل ہو گئی۔ سوچا کہ اب گھر بسایا جائے خوبرو تھے طبیعت کے نیک و شریف خاندان بھی ٹھیک تھا۔ آزاد بھارت کے لوگوں کی نظروں میں ان کا مستقبل بہت روشن تھا۔ میرج مارکیٹ میں ان کی مانگ تھی لیکن ماں کے لیے مسئلہ یہ تھا کہ بڑے بیٹے (مجاز) کی شادی نہ ہو اور چھوٹے کی کر دی جائے کچھ مناسب نہیں۔ اسرار بھائی کے لیے جو بھی رشتہ مانگا جاتا جواب یہ ملتا بڑے سے تو نہیں چھوٹے سے کر لو۔ اور ہمارے گھر میں

خاموشی اختیار کرلی جاتی۔ اس کا امکان ہے کہ انصار بھائی کے ذہن پر غیر شعوری طور پر ماں کے اس رویہ کا اثر پڑا ہو۔

مجھے نہیں معلوم کیسے انصار بھائی کے تعلقات لکھنؤ کے ایک رئیس گھرانے سے ہو گئے۔ بہر ملاقات غالباً اس خاندان کے نوجوانوں کی اسٹوڈنٹ فیڈریشن سے دلچسپی تھی۔ بہر حال اس گھرانے کے بڑے بیٹے سے انصار بھائی کے تعلقات بڑھتے گئے یہ حضرت یقیناً خاندان کے لیے ایک باغی کی حیثیت رکھتے ہوں گے۔ ان کی بیوی غیر مسلم تھیں۔ اور غالباً گریجویٹ۔ یہ جوڑا شاندار کوٹھی کی اینکسی میں رہتا تھا۔ جہاں پیسہ کی مہیا کردہ سہولتوں کے ساتھ باہر کی کچھ تازی ہوا بھی تھی۔ کوٹھی کے اندر کی گلی سڑی جاگیر دارانہ فضا سے قدرے مختلف انصار بھائی کو پینے پلانے پر پرہیز نہیں تھا شامیں وہاں گزرنے لگیں اور دوستی بڑھتی گئی۔

ہمارے ابا نے اپنے دوست کو ایک خط میں لکھا تھا ایک بیٹا شاعری کے جنگل میں کھو گیا دوسرا سیاست کے ریگستان میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انصار بھائی ریگستان میں مارے مارے پھرنے سے تھک چکے تھے۔ اور نخلستان کی کشش انھیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اچھی طرزِ رہائش کی اس خواہش نے جو بچپن میں سوٹ سلوا کر اور جوانی میں چہرے پر کولڈ کریم لگا کر اور کپڑوں پر روزانہ استری کر کے پوری کی جاتی تھی اور جس کو دیس بھگتی نے ذہن کے گہرے ترین حصہ میں دبا ڈالا تھا اپنا سر اٹھایا۔ نہرو جی کی جس کمزوری کی طرف انصار بھائی نے بہت ہی واضح طور پر اشارہ کیا ہے اور جس کا ذکر مسٹر درگا داس نے اپنی کتاب India from curzon to Nehru میں کیا ہے:

"They were old men too weary to carry on the struggle any further, in their heart of hearts anxious to grasp power and enjoy the furits whithout further dealy".

"وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ جدو جہد کی زندگی سے تھک چکے تھے۔ طاقت حاصل کرنے اور اس کے پھلوں سے جلد از جلد لطف اندوز ہونے کی خواہش ابھر رہی تھی۔"

انصار بھائی خود اسی نوعیت کی کمزوری کا شکار بنے۔ انھوں نے اپنے دوست کی بہن سے شادی کا فیصلہ کیا۔ عشق و محبت وجہ کشش نہ تھی۔ غالباً انصار بھائی بھی چاہتے تھے گھر بار ہو بیوی بچے ہوں آرام و آسائش کی چیزیں ہوں۔ ٹی وی ہو گاڑی ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ بھی تھک ہی چکے تھے انسان تھے کوئی فرشتہ نہ تھے۔

ہماری ہونے والی بھابھی کے گھر میں بھی غالباً بیٹی کی شادی کے سلسلہ میں اسی قسم کی پریشانیاں رہیں جو ہمارے گھر میں صفیہ آپا کی شادی کے سلسلہ میں تھیں۔ لڑکی سولہ سترہ سال کی ہوئی اور اس کے ہاتھ پیلے نہیں کئے گئے آسمان ٹوٹ پڑا قیامت آگئی۔ غرضیکہ ان کے گھر والوں نے ہونے والے داماد کے سنہرے مستقبل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس رشتہ کو قبول کر لیا۔

ہمارے گھر میں البتہ اس رشتہ کے سلسلہ میں کشمکش رہی۔ ان کی طرف سے یہ اندیشہ ضرور تھا کہ وہ کسی ایسی لڑکی کو جو مذہب میں بھی میل نہ کھاتی ہو لا کر کھڑا کر دیں گے لیکن اس نوعیت کا انتخاب کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا۔ باپ حسبِ عادت خاموش تھے اور ماں مخالفت میں پوری طرح صاف گو۔ اللہ گواہ ہے کہ مخالفت کی بناء ذات پات پر نہ تھی۔ بہو کی صورت و سیرت پر نہ تھی۔ خاندان کی طرف سے کسی قسم کی شکایت پر نہ تھی۔ وہ لوگ تو ہمارے لیے بالکل اجنبی تھے۔ اختلاف کی وجہ تھی اقداروں اصولوں طرز رہائش معیار زندگی اور سوچ کے طریقوں کی درمیانی خلیج۔ مجھے اماں کا یہ جملہ اکثر یاد آتا رہا "انسو تمھیں تو ایسی لڑکی چاہیے جو تھیلا لٹکا کے ترے ساتھ چلے۔"

ہماری بھابھی کا خاندان نانپارے کے رجواڑے سے تعلق رکھتا تھا۔ رانی نانپارہ ان کی سگی خالہ تھیں اور ان کے باپ ریاست کے منیجر۔ راجاؤں نوابوں کو اپنے عیش و عشرت سے کب فرصت ہوتی تھی ریاست کی کل سے جز تک ذمہ داری انھیں منیجروں پر ہوتی تھی۔ سو بھابھی کے والد بھی راجہ صاحب سے کسی طرح کم نہ تھے۔ ویسے سنا ہے کہ وہ طبیعتاً بہت شریف اور نیک اور اپنی بیوی سے دبے ہوئے۔

برعکس اس کے ہمارا خاندان ایک متوسط درجہ کے زمینداروں کا تھا۔ زمینداری بھی ختم ہو چکی تھی۔ معاوضہ کے بانڈس زیادہ تر تو آپا اور اسرار بھائی کے علاج اور صفیہ آپا کی شادی میں خرچ ہو چکے تھے جو باقی تھے وہ آئندہ کی متوقع اور غیر متوقع ضروریات کے لیے محفوظ کر لئے گئے تھے۔ اب رہ گئی تھی باپ کی پنشن، میری اور ابو کی تعلیم کا خرچ اور گھر کے دیگر اخراجات وضروریات کے لیے بیٹوں سے تو کوئی مدد ملتی نہ تھی گاہے گاہے بوجھ ہی پڑ تا تھا۔ یہ تو اماں اور آپا کی سلیقہ شعاری تھی کہ رہن سہن کے اوپری انداز پر کوئی اثر نہ پڑا۔ آنے جانے والوں کی خاطر مدارات، موقعہ مناسب پر نیوتے اور نذرانوں میں کوئی فرق نہ پڑنے پایا۔ اس سلسلہ میں مجھے کسی کا یہ جملہ یاد آتا ہے۔ تنخواہ داروں کا کیا ان کا پہلا ہفتہ ہوتا ہے تراتری کا دوسرا روادی

کا تیسرا کشاکشی کا اور چوتھا فاقہ کشی کا۔ ماں بہن کی سلیقہ شعاری نے کنبہ کو اللہ کا شکر ہے فاقہ کشی سے بچا رکھا تھا لیکن کشاکشی کی کیفیت ضرور تھی۔

جہاں تک خیالات و رجحانات کا سوال تھا۔ دونوں خاندانوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ایک طرف خاندانی اقدار میں سونا چاندی ہیرے جواہرات کی اہم ترین حیثیت اور دوسری طرف علم و ادب اور پڑھائی لکھائی کی۔ یہاں تک کہ لڑکیاں بھی سماج کے بندھنوں کو توڑ کر برسر روزگار اور مزدور پیشہ۔ ہمارے گھر کی فضا میں سیاسی و سماجی مسائل پر بحثیں۔ اقدار کی تبدیلیوں پر رائے زنی، اور بھابھی کے گھر میں تفریح طبع کی خاطر میراثنوں کی ڈھولکوں کی تھاپ۔ مصاحب پیشہ خادماؤں کی خوشامدانہ گفتگو۔ غرض یہ کہ جوڑ تھا مخمل میں ٹاٹ کے پیوند کا ہم وزن۔ یہ بات الگ رہی کہ ہم اپنے ٹاٹ کو مخمل سے برتر سمجھتے تھے اور اس پر ہمیں فخر تھا۔ اس مخمل کے تانے بانے گل چکے تھے اور آگے چل کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو ہی گئے۔

بھابھی کی اماں ملکہ بیگم کو پہلی دفعہ میں نے اپنی ایک دوست کی شادی میں دیکھا تھا۔ سرخ سفید خوبصورت اور بارعب کارچوبی جوڑے میں ملبوس زیورات سے مرصع دو خادمائیں ساتھ ایک کے ہاتھ میں چاندی کا مورچھل اور دوسری کے ہاتھ میں چاندی کا خاصدان۔ اور ہماری ماں بیچاری دبلی پتلی رنگت میں سانولی بیٹی کی بیوگی کی وجہ سے سر سے پیر تک سفید پوش اور کلائیاں کانچ کی چوڑیوں سے بھی محروم۔ بیچاری ملکہ بیگم کو اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بہت ہی پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ گھر گرہستی کا اللہ جانے کیا حشر ہوا تھا۔ زیادہ تر اولادیں پاکستان چلی گئیں تھیں۔ وہ ہر لحاظ سے بالکل ہی بے سہارا رہ گئیں تھیں۔ دیکھ کر عبرت ہوتی تھی۔

بہر حال اماں نے جب دیکھا کہ انصار بھائی اپنے ارادہ پر اٹل ہیں تو سمجھداری کا تقاضہ یہی سمجھا کہ رضا دے دیں۔ اور حسبِ حیثیت بیٹے کی شادی کی تیاری میں لگ گئیں۔ اور ۴ر فروری ۱۹۳۹ء کو نکاح کے دو بول کے بعد انصار بھائی گوہر آرا بیگم عرف بنو بی کو بیاہ لائے۔ شادی کے اخراجات قابو سے باہر نہ ہوں اس لیے میری شادی کی تاریخ ۵ر فروری رکھی گئی تھی۔ سو میں ان معصوم خوشیوں سے بھی محروم رہی جو بھائی کے سر پر دوپٹہ کی چھاؤں ڈال کر اور بھاوج کی آمد پر ان کی ڈولی روک کر اور نیگ کی رقم پر بھاؤ تاؤ کر کے بہنوں کو حاصل ہوتی ہیں۔ میں تو دارالسراج کے اوپر کے کمرے میں مایوں کی قید میں تھی۔

لڑکی والوں کی طرف سے اصرار تھا کہ بارات میں خواتین ضرور آئیں۔ ردولی کے کلچر میں عورتوں کی بارات میں شرکت کی رسم نہ تھی۔ خاندان کی لڑکیوں کو شوق بھی رہا ہوگا۔ بہرحال آپا کی سربراہی میں یہ سب بارات میں گئیں۔ ملکہ بیگم (بھابھی کی اماں) غالباً اس وقت بھول گئیں کہ انھوں نے اس رشتہ پر رضامندی داماد کے 'مستقبل' کے امکانات کو مد نظر رکھ کر دی۔ اس کے "حال" کے حالات سے بے نیاز ہو کر۔ بری کے سوٹ کیس کو کھولنے کی فرمائش ہوئی اس میں گیارہ ہلکے پھلکے ریشمی جوڑے تھے ایک زیور کا سیٹ اور خاندانی روایت کے مطابق چاندی کی پازیب۔

چڑھاوا دیکھتے ہی ملکہ بیگم کا چہرہ سرخ ہو گیا غصہ اور حقارت سے بولیں اس سے بہتر چڑھاوا تو ہم اپنے ملازموں کے گھر بھیجتے ہیں۔ مجمع کچھ بنے اور کچھ بگڑے ہوئے رؤساء کی بیگمات کا تھا۔ رسوائی کا احساس شاید بے جا بھی نہ تھا۔ آپا غریب تو میری طرح خاموش طبیعت کی تھیں غم و غصہ سے تھر تھرانے لگیں۔ صفیہ آپا زوردار تھیں بپھر گئیں اور اٹھ کھڑی ہوئیں اور بولیں بلایئے انصار کو ہم واپس جاتے ہیں۔ ہم وہ لوگ ہیں جس کے بھائی کی جیب میں ایک پیسہ نہیں ہوتا لیکن ملک کا کونہ کونہ اس کے نام سے واقف ہے۔ خاصا ہنگامہ ہوا باہر خبر پہنچی۔ انصار بھائی معہ دلھن کے بھائیوں کے اندر آئے اور سمجھا بجھا کر صفیہ آپا اور ملکہ بیگم کو ٹھنڈا کیا گیا۔

رشتہ کے سلسلے میں سسرال والوں کی مخالفت کی بھنک تو بھابھی کے کانوں تک پہنچ ہی گئی ہوگی۔ شادی کے وقت کا یہ ہنگامہ۔ غرضکہ اس پس منظر کے ساتھ بھابھی نے اپنی شاندار کوٹھی چھوڑ دارالسراج کی دہلیز پر قدم رکھا۔

شادی کی تاریخ کے تعین کے سلسلے میں آپا کے ساتھ بھابھی کے گھر گئی تھی۔ یہاں اس گھر کا سجا دھجا ڈرائنگ روم، نرم نرم مخملی گدّوں والے صوفہ، دیواروں پر سنہرے فریم میں تصویریں۔ آتش دان پر قیمتی گلدان و نادر سجاوٹ کی اشیا، چھت پر جھاڑ فانوس اور فرش پر ایرانی قالین، ڈائننگ روم میں چمکتی ہوئی بیضاوی میز چوطرفہ بارہ عدد گدے دار کرسیاں، سائڈ بورڈ قیمتی چینی شیشہ اور چاندی کے برتنوں سے آراستہ۔ ایسا نہیں کہ ہم ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم سے ناواقف رہے ہوں۔ پر ہم نے چادر کی وسعت دیکھ کر پیر پھیلانے کا سبق سیکھا تھا۔ ہمارے ڈرائنگ روم میں ایک بینت کا صوفہ سیٹ تھا۔ دو چار کرسیاں اور ایک عدد چوکی سیٹی کے طور پر استعمال کے لیے۔ کشن اور گاؤ تکیہ کے غلاف ہماری سلائی اور

دستکاری کی پیداوار تھے۔ وسط میں چھوٹے سے قالین پر ایک گول میز تھی۔ بہت زمانہ تک ہم تخت پر دستر خوان بچھا کر کھانا کھانے کے کلچر کو اپنائے رہے۔ کچھ شوق بڑھا تو چھوٹے کمرہ میں فرش بچھا کر بیچ میں ایک چوکی رکھ کر اور اس پر چادر ڈال کر ڈائی نگ روم کی شکل دے دی۔ کھانے کے کمرہ کے لیے میز اور کرسیاں غالباً ہماری شادی سے کچھ ہی پہلے خریدی گئی تھیں۔

بھابھی کے لیے اوپر کے بڑے کمرے کو ردولی کی گرہستی سے آئی ہوئی ایک مسہری پرانی وضع کی اونچی سنگھار میز اور ماں کے تخت پر بچھے ہوئے قالین سے سجادیا گیا تھا۔ کہاں ان کے گھر کا فرنیچر اور کہاں ہمارے گھر کا۔ شاید میں بھی ان کی جگہ ہوتی اور ان کے جیسے ماحول میں پلی بڑھی ہوتی تو مجھے بھی شاک پہنچتا اور غالباً چیخ چیخ کر رونے کا جی چاہتا۔ اس شاک کو تو کسی صورت ہماری بھابھی انصار بھائی کے سنہرے مستقبل کے خوابوں کے بل بوتے جوان کے بھائی بھاوج نے انھیں دکھائے تھے برداشت کر گئیں۔ لیکن زندگی محض خوابوں پر تو نہیں چلتی۔ دھیرے دھیرے یہ خواب بکھرتے گئے اور ہاتھ لگیں روزمرہ زندگی کی پریشانیاں اور آپس کی تلخیاں۔

سسرال والوں کے ساتھ رشتہ میں دراڑ تو تھی ہی ساتھ آنے والی جاہل بواؤں اور خاداؤں نے اس میں مزید اضافہ کیا۔ بھابھی کا جہیز بے تحاشا تھا لیکن انتہائی روایتی اور جاگیردارانہ۔ بڑی بڑی دیگیں سینیاں اور لگن چاندی کے لوٹے، کٹورے، پیالے طشتریاں اور پان دان خاص دان یہاں تک کہ اگالدان بھی چاندی کا۔ پلنگ کے موٹے موٹے پاؤں پر چاندی چڑھی ہوئی۔ میرا مختصر سا جہیز لیکن پریکٹیکل نوعیت کا اسی کمرہ کے ایک حصہ میں تھا۔ بھابھی کی ایک عدد بوا جنھوں نے آخری سانس تک اپنے طور کی وفاداری نبھائی اس اندیشہ سے کہ کہیں بھابھی کے جہیز کی کوئی چیز میری طرف نہ کھسکادی جائے اپنی بھوک پیاس بھولے کر پہرے داری کرتی رہیں۔ اور یہ پہرہ صفیہ آپا کے ہی کسی طنزیہ جملے سے ختم ہوا۔

دوسرے دن جب مہمان رخصت ہوئے اور چند قریبی رشتہ دار بیویاں رہ گئیں جن کو بہو کے کپڑے زیور دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ ماں نے بند سوٹ کیسوں کی چابیاں منگوائیں۔ انکار ہو گیا غالباً بوا کے قسم کی وفادار ساتھیوں کا مشورہ رہا ہوگا۔ اماں کی سبکی ہوئی وہ خاموشی سے پی تو گئیں لیکن درمیانی درار میں مزید اضافہ ہوا۔

ہم ہندوستانی لڑکیوں کی گھٹی میں یہ بات ڈالی جاتی رہی ہے کہ نکاح کے بعد زندگی کے نقشہ

کی ذمہ داری تم پر ہے بناؤ یا بگاڑو۔ یہ بندھن ان ٹوٹ ہے ایک دفعہ بندھ گیا تو بندھ گیا ہنس کر گزار دو یا رو کر تمہاری مرضی تمہاری قسمت۔ اب تک عام طور پر ہوتا یہ رہا ہے کہ لڑکی اپنی شناخت سے دستبردار ہو جاتی ہے سو ٹکراؤ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ دونوں اپنے اپنے راستوں کو ایک دوسرے پر مسلط کرنے کی کاوش میں بھی رہتے ہیں نتیجہ میں دن رات کی یہ چیخ پخ ہاتھ لگتی ہے۔ تیسرا راستہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں ہی ہار مان لیتے ہیں اور سمجھوتہ اس پر ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا تمہاری اندر کی ہماری۔ اپنے اور بچوں کے لیے صحتمند راستہ وہ ہوتا جس پر کچھ ایک جھکتا ہے اور کچھ دوسرا سو ایک مشترک راستہ ہاتھ لگ جاتا ہے مجھے نہیں معلوم کہ اس راستہ کی تلاش ہمارے بھائی اور بھابھی نے کی اور ناکامیاب رہے یا کوشش کی ہی نہیں کی۔ جو راستہ اپنایا وہ یہ کہ میاں کی دنیا الگ اور بیوی کی الگ۔ یہ صورت حال شاید اس صورت میں ممکن ہو جہاں وسائل لا انتہا ہوں۔ پر جہاں وسائل کی کمی ہو اور شوہر پر پوری طرح سے معاشی ذمہ داری ہو ہر لمحہ کی کھٹ پٹ ناگزیر ہے۔ شوہر کی دنیا الگ اور بیوی کی دنیا الگ کا نسخہ کارگر ہو ممکن نہیں۔ انصار بھائی کی زندگی میں ایک دور وہ بھی آیا جب ان کی آمدنی صفر تھی۔ ان حالات میں گھر کے تناؤ میں اضافہ ہوتا گیا۔

ایم۔پی ہونے کے بعد انھیں فیروز شاہ روڈ پر ایک وسیع بنگلہ ضرور ملا۔ لیکن بڑے گھر کی ضروریات بھی بڑی ہوتی ہیں۔ پھر آدھے درجن نکمے نوکر اور کچھ عدد ہاں میں ہاں ملانے والی مصاحب پیشہ شخصیتیں خود میاں بیوی اور ماشاء اللہ چار بچے۔ خرچ زیادہ آمدنی کم۔ اس وقت ایم۔پی الاؤنس بھی مختصر تھا۔ اور انصار بھائی کے بس کا یہ روگ نہ تھا کہ ناجائز طریقوں کو اپنا کر اپنی جھولی بھرتے۔ گو کہ راستے کھلے ہوئے تھے۔ اسے اصول پرستی یا کہیے بے عقلی۔ بہر حال تنگی کا مسئلہ اپنی جگہ رہا اور زندگی کی ناخوشگواریوں میں بھی کمی کی صورت نہ نکلی۔

انصار بھائی نے فرار کا جو راستہ ڈھونڈھا اس نے تلخیوں اور ناخوشگواریوں میں مزید اضافہ کیا۔ شراب پی اور بے تحاشہ پی شراب کی تلخی اور زندگی کی تلخی دونوں میں سبب اور نتیجہ کا رشتہ قائم کرنا بہت مشکل ہے۔ ایک کا اضافہ دوسرے میں اضافہ کا باعث بن رہا تھا۔ غرضیکہ زندگی بری بھلی گزرتی رہی۔

۱۹۷۵ء میں ہماری بھابھی کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو گئیں اور انصار بھائی تنہا رہ گئے۔ بڑی بیٹی کی شادی اپنی زندگی میں کر گئی تھیں۔ باقی دو کی شادیاں ان

کے انتقال کے بعد ہوئیں۔ یہ وہ دور تھا جب لڑکیوں کے لیے بھی میرج مارکٹ میں بی۔اے کی ڈگری کی اہمیت دی جانے لگی تھی۔ انصار بھائی کے بچوں کا داخلہ کانونٹ اسکول میں کروایا گیا۔ چھوٹی ذہین ہونے کے باوجود پڑھائی میں بد شوق تھی گھر کا ماحول ایسا نہ تھا کہ اس کے ذہنی مسائل کو سمجھ کر پڑھائی کی طرف زور دیا جاتا غالباً ہائی اسکول تک پہنچی تھی۔ منگنی ماں کی زندگی میں ہوئی ایک سال بعد اس کی شادی ہوگئی۔ آج کل شوہر کے ساتھ امریکہ میں ہے۔ بڑی بیٹی اور منجھلی بیٹی نے بی۔اے کیا۔ مجھے اپنی ان دونوں بھتیجیوں پر فخر ہے باوجود نامساعد حالات کے ان دونوں نے انتہائی محنت اور ریاضت سے اپنا راستہ ڈھونڈھا۔ بڑی کو باپ سے جرنلزم کا رجحان ملا بی بی سی سے وابستہ ہے اور اپنا مقام رکھتی ہے۔ دوسری اکسپورٹ بزنس میں ہے۔ چاروں اولادوں میں بیٹا سب سے چھوٹا ہے۔ اس کی تعلیم لاڈو پیار کی نذر ہوئی۔ انصار بھائی کی زندگی کسی بندھے ٹکے راستہ کو اپنا نہ پایا۔ قدرت نے اسے گلے کی صلاحیت دی تھی۔ آج کل موسیقی کی راہ اپنانے کی کاوش میں ہے۔

میرے اور انصار بھائی کے درمیانی تعلق کی کیفیت کچھ الجھی سی رہی۔ اس سے انکار نہیں کہ میری سمجھ اور شعور پر ان کی وجہ سے بہت صحتمند اثرات پڑے۔ میری تعلیم میں ان کا ہاتھ رہا۔ ان کی اور میری دلچسپیوں میں یکسانیت تھی۔ حالات سے مجبور تھی ورنہ ان کی راہ اپناتی۔ سودماغ کا ایک حصہ ان کو ہیرو مانتا تھا۔ لیکن دوسرے حصہ میں کچھ ریزرویشن سے۔

ان میں کچھ ایسی کمزوریاں تھیں جن سے ہم سب کو تکلیف پہنچی۔ اور ان کے گھریلو زندگی پر اور بچوں کی پرورش پر غلط اثرات پڑے ہر انسان پر انواع اقسام کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ اور ان ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے وہ اپنے اقدار کی روشنی میں ایک ترجیحی پیمانہ بناتا ہے۔ اس سلسلہ میں انصار بھائی کی طرف سے مایوسی ہوئی۔

ان کی زندگی کا مشن ملک کی آزادی تھی۔ سب کچھ بھول کر انھوں نے اپنے کو مہم آزادی کے سپرد کر دیا تھا۔ حالات کی روشنی میں یہ سپردگی قابل تعریف تھی۔ لیکن لگتا ہے زندگی کے دیگر مسائل سے بیگانگی ان کی عادت سی بن گئی ہو۔ بیٹوں کے ساتھ ماں باپ کی کیسی کیسی توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ ہمارے ماں باپ کی قسمت میں یہ خوشیاں نہ تھیں انھیں تو ایم۔پی بیٹے کا بنگلہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔ شاید انصار بھائی کے ذہن میں یہ بات رہی ہو کہ ساس بہو کے رشتہ کی بنیاد کمزور ہے کبھی قربت کے بجائے فاصلے میں مزید اضافہ نہ ہو جائے۔ اگر بیٹے کی حیثیت سے وہ معیار پر پورے نہیں اترے تو باپ کی حیثیت سے بھی انکا

یہی حال تھا۔ بچے کس کلاس میں ہیں ان کی پڑھائی کیسی چل رہی ہے۔ گھر کے ماحول کی کون سی باتیں ان کی صحیح تربیت میں حائل ہیں۔ ان مسائل سے وہ بے نیاز رہے۔ جیسے الجھاؤں سے بے نیاز رہنے کی انھوں نے عادت سی ڈال لی ہو۔

ان کی کتاب "بیفور فریڈم اینڈ آفٹر فریڈم" پڑھنے پر اندازہ ہوا کہ ایک وقت ان پر ایسا گزرا کہ بٹی کے لیے دودھ کے ڈبہ کے پیسہ ان کے پاس نہ تھے۔ گورنمنٹ ہاؤس یوم آزادی کی شرکت کے لیے تیار ہورہے تھے۔ بیوی نے بتایا دودھ کا ڈبہ بالکل خالی ہے۔ بنئے کی دکان پر گئے اس نے ادھار پر مزید سودا دینے سے انکار کردیا۔ واپس لوٹے گھر کی کوئی چیز یا بیوی کا کوئی زیور گروی رکھنے کے لیے لے گئے اور اس طرح سے بلکتی ہوئی بچی کے لیے دودھ کا انتظام ہوا۔ اس آزادی سے فنکشن میں جس کے لیے جان لڑائی تھی۔ شرکت سے محروم رہ گئے۔ یہی وہ دور تھا جب ہم لوگوں سے چھوٹے موٹے قرض لیے اور ان کی ادائیگی کی نوبت نہ آئی۔ سالم سے اپنے اخبار کے لیے مضمون لکھوایا اور ہم اس کے معاوضہ کے انتظار ہی میں رہ گئے۔ یہ تھیں وہ چھوٹی چھوٹی باتیں جو ان کی طرف سے ہماری مایوسی اور تکلیف کا باعث بنی رہتی تھیں۔ لیکن جس واقعہ سے ہم سب کو شدید تکلیف پہنچی وہ تھی رانچی کے مینٹل اسپتال سے یہ اطلاع کہ اسرار بھائی کے داخلے کے وقت بل کی پوری ادائیگی نہیں ہوئی تھی۔ اور یہی تھا انصار بھائی کی خستہ حالی کا وہ دور جب ان کی جیب میں اپنی بچی کے لیے دودھ کے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ غالباً ہوا یہ ہوگا کہ رانچی روانگی کے وقت بیوی نے کہا ہوگا کہ اگر کچھ پیسوں کا انتظام نہ ہوا تو گھر کا چولھا ٹھنڈا رہے گا۔ جو رقم اسپتال کے اخراجات کے سلسلہ میں ان کے پاس تھی اس میں سے کچھ انھوں نے بیوی کے ہاتھ میں رکھے ہوں گے یہ سوچ کر واپسی پر کچھ انتظام کرکے بھیج دیں گے۔ رانچی سے وہ کسی میٹنگ کے سلسلہ میں کلکتہ چلے گئے اور اس دوران ہمارے پاس یہ اطلاع پہنچ گئی۔ افسوس یہ ہے کہ انصار بھائی کی یہ کوشش کہ اپنے حالات پر پردہ ڈالے رکھیں اور ہم سب کو تکلیف سے محفوظ رکھیں۔ اکثر اُلٹی ثابت ہوئی۔ اگر اس حد تک ان کی مالی پریشانی کا اندازہ ہوتا تو تکلیف تو یقیناً ہوتی پر غصہ تو نہ آتا۔

ناخوشگوار باتوں کو انسان کسی بھی گہرائی میں چھپائے گاہے گاہے ابھرتی ہی رہتی ہیں۔ میرے ذہن میں بھی یہ سوال اٹھتا تھا کہ آیا مجھے اپنے اس بھائی سے محبت زیادہ ہے یا ہمدردی۔ کاش میں نے ان کی زندگی کی کہانی کے اوراق پر اس توجہ سے پہلے نظر ڈالی ہوتی تو اتنا کہہ سکتی ہوں اُن کے لیے میری محبت اور عزت میں اضافہ ہی ہوتا کمی نہیں۔

انصار بھائی میں اگر کچھ کمزوریاں تھیں جو ان کے اپنے لیے اور ان سے قریب کے لوگوں کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوئیں تو کچھ ایسی خوبیاں بھی تھیں جو اپنی جگہ حیرت انگیز تھیں اور نایاب۔ مائینوریٹی کمیشن کی سکریٹری شپ کے خاتمہ پر نہ سر پر ان کی اپنی چھت تھی نہ جیب میں ایک پھوٹی کوڑی۔ جائیں تو کہاں جائیں۔ ویسٹرن کورٹ میں ایک کمرہ لیا چند ماہ کے قیام کے بعد اندازہ ہو گیا کہ ہوٹل کتنا ہی سستا ہو۔ باپ بیٹے کا خرچ برداشت سے باہر ہے۔ ایک مہربان دوست کا خلوص کام آیا۔ کالج امپوریم کی پست پر جن کی متعدد فلیٹوں کی ایک عمارت ہے جس پر سالہا سال سے پندرہ بیس روپیہ ماہانہ کرایہ دینے والے قابض ہیں سو مرمت سے محروم اور نہایت ہی فرسودہ حالت میں۔ دوست نے کسی صورت میں ایک کمرہ خالی کروا کر انصار بھائی کے سر پر سایہ کا انتظام کیا۔ کمرہ کا فرش اکھڑا ہوا دیواروں کا پلاسٹر جھڑتا ہوا۔ گنجائش اتنی کہ بمشکل دو پتلے پلنگ بچھ گئے درمیان میں ایک چھوٹی میز اور ایک کرسی دیوار سے لگا ہوا ایک اسٹول جس پر پرانا ٹائپ رائٹر، غسل خانہ باروچی خانہ متعدد کرایہ داروں میں مشترک۔

یہ تھا طرز رہائش انصار بھائی کا، فیروز شاہ روڈ اور راؤز ایونیو کے بنگلوں کو چھوڑنے کے بعد۔ ان کا بچپن اور جوانی بھی اچھے ہی گھروں میں گزری تھی۔ کھاتے پیتے حالات میں پلے بڑھے تھے۔ دیکھنے والوں کو تکلیف ہوتی تھی لیکن اس بندے کی پیشانی پر کبھی ایک شکن نہ دیکھی۔ کبھی شکایت کا ایک لفظ نہ سنا۔ جیسے ان کے ذہن میں کبھی یہ بات آتی ہی نہ ہو کہ ان کی قربانیوں کا کوئی معاوضہ ہونا چاہیے تھا۔ دیس آزاد ہو گیا ان کی ریاضت ان کی مشقت سپھل ہو گئی پھر شکوہ کاہے کا یہ تھا سوچ کا انداز۔

ان کی قوت ارادی اس ضعیفی میں اس حد تک مضبوط تھی کہ ستر سے اوپر کی عمر میں انھوں نے اپنے کو شراب نوشی کی عادت سے ایک جھٹکے میں آزاد کر لیا۔ اس عادت کی انتہا یہ تھی کہ ہمیشہ ایک شیشی جیب میں رہتی تھی بغیر پیے نیند نہیں آتی تھی چھوڑی تو اس طرح کہ اس کی طرف نگاہ نہیں اٹھائی اس عادت سے چھٹکارا پانے کے لیے نہ انھیں دواؤں کی ضرورت پڑی نہ ہی مخصوص اسپتال کی۔ ان کے لیے اپنا ارادہ ہی کافی تھا۔ کاش یہ عادت پہلے چھوٹ گئی ہوتی۔ زندگی کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔

عمر تھی اور یہ حالات زندگی، جسم کو دھیرے دھیرے کمزور ہونا ہی تھا۔ لیکن آخر وقت تک ہمت جواں رہی۔ چلتے تھے تو لگتا تھا کہ پھونک مارو تو اڑ جائیں لیکن سہارے کے لیے کوئی ہاتھ

بڑھاتا تو انکار کر دیتے۔ کچھ دنوں سے نوالہ نگلنے میں دقت ہونے لگی تھی۔ حلق تنگ ہوتی جارہی تھی۔ بہر حال پوچھنے پر ہمیشہ یہی جواب ملا کہ ٹھیک ہوں۔ تکلیف کا اظہار ان کی فطرت کے خلاف تھا۔

کچھ عرصہ بعد گلے پر گلٹی ابھر آئی۔ ڈاکٹر نے بایو پسی تجویز کی۔ اپنی ذات کے سلسلہ میں اگر میں نے انھیں کبھی پریشان دیکھا تو ڈاکٹر کی اس تجویز پر۔ بیوی کی بے انداز تکلیف دیکھ چکے تھے۔ کینسر جیسے موذی مرض کے اندیشہ سے کون نہیں ہل جاتا۔ بہر حال رزلٹ آیا پتہ چلا کہ اندیشہ صحیح تھا اور ڈاکٹر کے اندازے کے مطابق مرض اپنی تیسری اسٹیج پر تھا اور مشورہ تھا کہ پرہیز اور پابندیوں سے کچھ حاصل نہیں۔ زندگی کے چند مہینہ باقی ہیں مریض کو اپنی مرضی خوشی سے بسر کرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔

ہم سب اپنی اپنی جگہ روئے دھوئے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ انھیں نہ بتایا جائے۔ پریشانی یہ تھی کہ وہ رپورٹ دیکھنا چاہیں گے۔ ان پڑھ گنوار تو تھے نہیں۔ حیرت ہے کہ انھوں نے رپورٹ دیکھنے کی فرمائش نہیں کی۔ ایسا لگتا ہے جیسے انھوں نے اس اندیشہ سے بھی سمجھوتا کر لیا تھا۔ اگر ان کے دماغ میں کچھ اندیشے تھے بھی تو مرض کے اندازے سے انھیں دور کرنے کا رول ادا کیا اور ہم سب کے جھوٹ پر پردہ ڈالے رکھا۔ ڈھائی سال بغیر کسی بیماری حیرانی ان کی زندگی اسی معمول پر چلتی رہی جس کے وہ عادی تھے۔ جیسے کوئی اندرونی قوت ہو جس نے مرض کو دبائے رکھا ہو۔ اسی دوران انھوں نے اپنی دوسری کتاب "گاندھی ٹو گاندھی" لکھی اس کتاب کی اشاعت میں ان کے قلم کی بیباکی کی وجہ سے بہت دشواریاں پیش آئیں۔

ان کے قلم کی بیباکی کے سلسلہ میں میں اگر مسز گاندھی کے نام ان کے کانگریس سے استعفیٰ کے خط کے کچھ اقتباسات کا حوالہ دوں تو بے جانہ ہوگا۔ سیاسی زندگی میں انھوں نے غلط قدم اٹھائے یا صحیح اختلاف رائے کی گنجائش ہے لیکن ان کی راہیں سود و زیاں کی مصلحتوں سے بے نیاز تھیں اس سے انکار ممکن نہیں۔ یاد رہے کہ یہ دور ایمرجنسی کا تھا جب حسب ذیل خط لکھا گیا تھا۔

20 March 1977
My dear Indraj ji,
It is with a heavy heart that this morning I have decided to quit Congress to which during the last forty years , I gave my time, toil, talent and tears for all that they were worth"

(اندرا جی۔ بہت دکھ کے ساتھ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کانگریس سے اپنا ناطہ توڑ لوں جس کی خدمت میں اپنی سکت بھر میں نے اپنی زندگی کے چالیس سال صرف کیے) آگے انھوں نے اپنے اس جذبات کا ذکر کیا جو انھیں کملاجی کے ساتھ تھی اور اس عقیدت کا جو کسی زمانہ میں پنڈت جی کے ساتھ تھی اور پھر ان کاوشوں کا جو انھوں نے پرائم منسٹر شپ کے الیکشن میں ڈیسائی کے مقابلہ میں اندرا جی کے لیے کیں تھیں۔ آگے لکھتے ہیں:

" though I had my reservations as you were not a grassroots. Congress worker, You began your political career as a nominated member of the Congress working committee........................ However in the beginging you did well. I regret that ultimately you prefered to be more the mother of an incompetent son than the mother of India. Which the community considered you.

It has been a matter of destress for all of us to see a poor motor mechanic to be escorted to state receptions by Chief Ministers........... his concbines to be given preference to a tried patriot like Shrimati Subhadra Joshi."

"آپ کے سلسلہ میں میرے دل میں کچھ شکوک تھے کیوں کہ آپ بنیادی طور پر کانگریس کارکن نہ تھیں۔ آپ کے پولیٹکل کریئر کا آغاز کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ایک نامزد ممبر کی حیثیت سے ہوا تھا .... ابتدائی دور میں آپ کا عمل قابل تعریف رہا لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آگے چل کر جب کہ دیس آپ کو اپنی ماتا کے روپ میں دیکھ رہا تھا آپ نے ایک نالائق و نکمے بیٹے کی ماں بننے کو ترجیح دی۔

یہ دیکھ کر کہ اسٹیٹ فنکشنز میں چیف منسٹر س ایک معمولی موٹر میکینک کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں۔ محض اس وجہ سے کہ وہ پرائم منسٹر کا بیٹا ہے اور شریمتی سبھدرا جوشی جیسی محبّ وطن ہستی کے مقابلہ میں اس کی رکھیلوں کو ترجیح دی جا رہی ہے ہم سب کو شدید تکلیف پہنچی ہے۔"

آگے چل کر انھوں نے یہ بھی لکھا کہ کس طرح اندرا جی اپنے خوشامدی حلقہ کے اس نعرہ کے جال میں آگئی ہیں "اِندرا اِز انڈیا اور انڈیا اِز اِندرا"

ہے کسی میں یہ ہمت جو پرائم منسٹر کو اور وہ بھی اندرا گاندھی جیسی پرائم منسٹر کو اس طرح مخاطب کرے۔ اندرا جی انصار بھائی کے ہر خط کا جواب اپنے دستخط کے ساتھ دیا کرتی تھیں۔ اس خط کا جواب نہیں آیا۔ خدا جانے ان تک پہنچا بھی یا نہیں۔ یہ دور تھا سنجے گاندھی اور ان کے غنڈے دوستوں کی حکمرانی کا۔

بالآخر مرض نے سر اٹھایا۔ گردن پر ایک گلٹی نے ابھرنا شروع کیا۔ کچھ دن گھر سے ہی ریڈیولوجی کے لیے اسپتال جاتے رہے۔ اس دور میں بھی نہ کسی نے ان کے سامنے کینسر کا نام لیا اور نہ ہی انھوں نے اپنی تکلیف کو اس نام سے وابستہ کر کے کسی سے ذکر کیا۔ مرض کو بھی اسی دلیری سے قبول کیا جس طرح سے زندگی کے دیگر مسائل۔ کو تکلیف زیادہ بڑھی اسپتال میں داخل کر دیے گئے۔ آخری وقت تک باہوش وحواس رہے اور حالات حاضرہ سے دلچسپی لیتے رہے۔

اٹھائیس اکتوبر کی شام کو مجھے اسپتال سے واپس ہوئے کوئی پون گھنٹہ گزرا ہوگا کہ فون کی گھنٹی بجی اور یہ اطلاع ملی کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ میرے کانوں میں ان کا یہ جملہ گھوم رہا تھا جو انہوں نے اسپتال سے چلتے وقت میرا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا۔ "تمھارا گھر بہت دور ہے روزانہ نہ آیا کرو'

انصار بھائی کی خواہش تھی کہ ان کو جامعہ ملیہ کے قبرستان میں دفن کیا جائے وہاں ان کے اپنے لوگ ہیں۔ جامعہ ملیہ کے قبرستان کے ایک حصہ کا نام جس میں ڈاکٹر انصاری، عابد صاحب، مجیب صاحب وغیرہ کی قبریں ہیں۔ وی آئی پی قبرستان پڑ گیا ہے۔ شاید اسلامی مساوات کا منہ چڑھانے کی خاطر۔ انصار بھائی کی خوش قسمتی کہ پروفیسر مشیر الحسن اس وقت ایکٹنگ وائس چانسلر تھے ان سے خاندانی تعلقات بھی تھے اور تاریخ داں ہونے کے ناطے وہ انصار بھائی کی قومی خدمات کی پرکھ بھی رکھتے تھے۔ غرضیکہ انصار بھائی کو بھی وی آئی پی

قبرستان میں جگہ مل گئی۔ ورنہ جسے زندگی میں نہ پوچھا گیا اسے موت کے بعد کون پوچھتا۔

سیاسی زندگی میں انصار بھائی کا پہلا قدم سفید بارہ دری لکھنؤ میں ڈاکٹر انصاری کے پیچھے ان کی فائلوں کا بوجھ سنبھال کر اٹھانا تھا۔ وہ کانگریس کے کمسن ترین نہایت ہی تیز رفتار اور تیز گفتار والینٹیئر تھے اور ان کا آخری قدم بھی انھیں کی طرف بڑھا لیکن اب ان کے بے جان جسم کو چار کاندھوں کی ضرورت تھی۔ انصار بھائی کی قبر ڈاکٹر انصاری کی قبر سے بالکل ملحق ہے۔

انصار بھائی کی موت کی خبر صرف ایک دو یوپی کے اردو اخباروں میں آئی۔ ان کے جنازے میں شریک ہونے والوں کی تعداد بہت ہی مختصر تھی لیکن آج کے دور میں یہ شکایت کہ ان کی ناقدری ہوئی نادانیہی ہوگی۔ حال ہی میں جنوری تا مارچ ۱۹۹۸ء کے ورلڈ آفیئرس کے شمارے میں مسٹر گجرال ہمارے ایکس پرائم منسٹر کا ایک انٹرویو نظر سے گزرا۔ اس کی چند لائنیں یاد آرہی ہیں:

> 'Indian's journey as a unified dynamic society over the last half century is a great tribute to Mahatma Gandhi,Pandit Nehru, Ptel and a hundred others"

"ہمارے دیس نے پچھلی نصف صدی میں جو متحرک اور میل جول کا راستہ اپنایا وہی ہے خراجِ عقیدت گاندھی جی، پنڈت جی، سردار پٹیل اور اس راستہ پر سیکڑوں اور چلنے والوں کے لیے۔"

گجرال جی اپنی سیکولرازم کے لیے بہت مشہور ہیں ان کو بھی سردار پٹیل کا نام تو یاد رہا لیکن مولانا آزاد کا نام بھول گئے۔ جو مہم آزادی میں دو مخالفین کا سامنا کر رہے تھے۔ مولانا کو اپنوں نے کافر قرار دے دیا تھا۔ کتنی اذیب ناک بات رہی ہوگی اس بلند و بالا عالم کے لیے۔ لیکن اس کی قوم پرستی میں ایک لمحہ کے لیے لرزش نہ آئی۔

یہ تھی انصار بھائی کی زندگی کی کہانی۔ اسے ختم کرتی ہوں، اپنے سلامِ عقیدت کے ساتھ ان ہستیوں کے لیے جو سماجی اور ملی خدمت ہی کو خدمت کا معاوضہ سمجھتے ہیں۔ آج کتنی عنقا ہیں یہ ہستیاں۔

صفیہ جان نثار اختر

جادو

تمھاری خواہش ہے کہ میں تمھاری ماں پر مضمون لکھوں۔ یہ کام میرے لیے کتنا اذیت انگیز ہے، جانے تمھیں اندازہ ہے یا نہیں۔ وقت نے جس زخم پر موٹی سی پپڑی جما دی ہے۔ تم چاہتے ہو اسے میں اپنے ہی ناخونوں سے اکھیڑوں، ہمت چاہیے اس کے لیے۔ سوچ کر ہی جی لرز جاتا ہے۔ قلم پکڑنے سے پہلے انگلیاں کانپنے لگتی ہیں۔ ایسا نہیں کہ مجھے خود یہ خیال نہ آیا ہو۔ کچھ دوستوں نے بھی کہا کہ آخر میں اپنی اس بہن پر کچھ کیوں نہیں لکھتی جس کی اپنی زندگی بھلے مسائل اور آزمائشوں سے بھرپور رہی پھر بھی زندگی کو بہت کچھ دے گئی۔ انجانے میں ہی سہی اردو ادب پر ایک ایسے پر سحر اور پر اثر اندازِ نگارش کی چھاپ چھوڑ گئی جس کا اپنا مقام ہے۔

میں تو بہن ٹھہری کون ایسا ہوگا جس کی آنکھیں "حرف آشنا" اور "زیر لب" پڑھنے کے بعد پرنم نہ ہو جاتی ہوں۔ کون سا دل ہوگا جس کی دھڑکن تھوڑی ہی دیر کے لیے سہی تیز تر نہ ہو جاتی ہو کون ہوگا ایسا جو ان خطوط کے ہر ہر جملے سے چھلکتے ہوئے احساسات کی صداقت، جذبات کی شدت اور بصیرت کی گہرائی سے متاثر نہ ہوتا ہو۔ جادو تم تو شاعر ہو۔ مجھ سے بہتر جانتے ہو یہ اثر، یہ سحر صرف خوب صورت الفاظ کا ہی نہیں۔ بہت دفعہ سوچا بہت دفعہ ارادہ کیا کہ کچھ کہوں کچھ لکھوں لیکن یادوں کے الجھاوے میں پھنس کر رہ گئی۔ کیا لکھوں کیا نہ لکھوں۔ کہاں سے شروع کروں کہاں ختم کروں۔ کہانی کے تانے بانوں کو الگ کرنا تو دور کی بات رہی اپنے ہی کو اس میں الجھا محسوس کیا۔ جو تصویر اپنے ذہن میں صاف نہ ہو اسے دوسروں کے سامنے کیسے پیش کروں۔ ہمیشہ ہمت جواب دے گئی۔ ارادہ پست ہو گیا۔

عجیب سی بات ہے جادو اپنی ایسی بہن کے لیے میرے جذبات میرے احساسات کچھ اس طرح خلط ملط ہیں کہ انھیں الفاظ دینا بہت دشوار ہے۔ غم ہے غصہ ہے اور ساتھ ہی ساتھ احساسِ ندامت و شرمندگی اور احساس جرم۔ ندامت اور شرمندگی اسی بات کی کہ ہم دونوں بہنیں ایک ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے۔ ایک ہی باپ کی شفقت تلے پنپے ایک ہی گھر کی چہار دیواری کے اندر پلے بڑھے لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ ہم دونوں میں ابتدا سے دوستی کا رشتہ تھا۔ ہم ایک دوسرے کی دلچسپیوں کے ساتھی تھے ایک دوسرے کے مسائل میں شریک تھے۔ میں اپنے ماضی پر نظر ڈالتی ہوں تو جو دھندلی یادیں ابھرتی ہیں وہ ان دو بہنوں کی نہیں ہیں جن میں آپس میں بڑا قرب ہو بڑا لگاؤ ہو۔ جب ایک کو چوٹ لگتی ہو تو دوسرے کو تکلیف پہنچتی ہو۔ جب ایک ڈانٹا جاتا ہو تو دوسرا روتا ہو۔ یہ صحیح نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ اپنے چھوٹے موٹے مسائل کے حل کے لیے میری نظریں صفیہ آپا کی طرف اٹھتی تھیں۔ رہبری کے لیے میرے ہاتھ ان کی طرف بڑھتے تھے۔ سہارے کے لیے مجھے ان کے کاندھوں کی تلاش ہوتی تھی، اپنے پر غصہ و غم اور احساس جرم اس کا ہے کہ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ کسی صورت میں میں ان کی پریشانیوں ان کی الجھنوں میں شریک رہی۔ ان کا درد بٹا سکی۔ بچپن سے جوانی تک میری اس بہن کو جانے کتنے ان گنت مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ کن کن بندشوں کو بھگتنا پڑا۔ ہر اول بن کر وہ میرے لیے راستہ صاف کرتی گئیں اور مجھے احساس تک نہ ہوا۔ مددگار بننا تو الگ رہا میں ان کی رازداں بھی نہ بن پائی۔

بہنوں کے آپسی رشتہ میں وہ رنگینی تو نہیں ہوتی جو ہندوستانی بہن بھائیوں کے رشتہ میں ہوتی ہے لیکن ایسی مضبوطی اور پائیداری ضرور ہوتی ہے جس کی بنیادیں بہت گہری ہوتی ہیں اور جس کی اہمیت کا احساس عمر پانے پر ہی ہوتا ہے۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ بچپن کے دور میں ہم دونوں بہنوں کا رشتہ کچھ عجیب و غریب تھا۔ ہم قریب ہوتے ہوئے بھی دور تھے اور دور ہوتے ہوئے بھی قریب تھے۔ میں ان سے ڈرتی تھی ان سے خوفزدہ رہتی تھی اور ساتھ ہی ان کے رعب میں بھی تھی۔ رعب تھا ان کی بے تحاشہ ذہانت کا غیر معمولی یادداشت کا۔ ڈرتی تھی ان کے غصہ سے ان کے طنز و طعن سے۔ میں ان سے دوری کی بھی کوشش کرتی تھی اور ان کے پیچھے پیچھے چل کر ان جیسا بننا بھی چاہتی تھی۔ اور میرا یہ دو رنگی طور طریقہ ان کی جھنجھلاہٹ کا سبب بنتا۔ ردولی کی زبان میں جب بھی موقعہ ملتا وہ مجھے خوب خوب دھونستی تھیں اور میرا مذاق اڑاتی تھیں۔ میرے لیے یہی راستہ رہ جاتا تھا کہ اماں یا آپا کے پاس جاکر آنسو بہاکر شکایتیں پہنچاؤں۔ غم ہو یا غصہ آنسو بہانے میں میں بہت فیاض تھی۔ پھر چھوٹی بھی تھی کمزور

سی دبلی پتلی۔ صفیہ آپا پر ڈانٹ پڑتی پر موقعہ ملتے ہی ان ڈانٹوں کا غبار مجھ پر ہی نکلتا۔ آج سوچتی ہوں تو سمجھ پاتی ہوں کہ غیر شعوری طور پر وہ میری آئیڈیل تھیں اپنے بچکانہ طریقوں سے میں ان سا بننا چاہتی تھی ان کی ہر پسند اور ناپسند کو اپنانا چاہتی تھی۔ میری اس احمقانہ نقلچی پن پر ان کا غصہ ان کی جھنجھلاہٹ بے جا تو نہ تھی۔

اس وقت چھوٹی چھوٹی باتیں یاد آرہی ہیں۔ اس زمانہ میں یہ رواج تو تھا نہیں کہ لڑکیاں یا عورتیں دکانوں پر جائیں اور اپنی ضرورت اور پسند کی چیزیں خریدیں۔ ویسے سچ پوچھو تو شادی سے پہلے لڑکیوں کی ضرورتیں بھی کون سی ایسی لمبی چوڑی ہوتی تھیں۔ سادے کپڑے پہننے کے لیے سات آٹھ سال کی عمر کے بعد ہم لڑکیوں کے لیے لچکا گوٹا ممنوع یہاں تک کہ سرمہ کاجل تلوؤں پر مہندی کے استعمال پر بھی پابندی۔ ان تمام آرائشی اشیاء کے لیے شادی کا انتظار لازمی تھا۔ سو ہمیں کیا چاہیے تھا ہاتھوں کے لیے شیشہ کی چوڑیاں کانوں کے لیے چند بندے بالیاں اگر صاحب حیثیت ہوئے تو گلے کے لیے جگنو یا چمپا کلی بن گئی ہاتھوں میں سونے کے کڑے ڈال دیے گئے۔ جہاں تک ان زیوروں کا سوال تھا فیصلہ ماں اور خاندانی سنار کے درمیاں ہو جاتا تھا۔ البتہ کپڑوں کے انتخاب میں ہم لڑکیوں کا دخل تھا۔ گھر کے لگے بندھے مہاجن کپڑوں کے پلندے لے کر گاہے گاہے خصوصاً تیوہاروں سے پہلے گھر آجاتے تھے۔ اور گھر کی نوکرانیاں کپڑے کے تھانوں کو اندر باہر کرتی رہتی تھیں اور ہماری پسند کا کپڑا کاٹ دیا جاتا تھا۔ منہارنیں بھی وقتاً فوقتاً آتی رہتی تھیں اور بہو بیٹیوں کی کلائیوں میں ان کی پسند کی چوڑیاں ڈال جاتی تھیں۔ جب بھی کپڑوں اور چوڑیوں کے انتخاب کا سوال پیدا ہوتا میری حد بھر کوشش یہ ہوتی کہ مجھے صفیہ آپا کی پسند معلوم ہو جائے پھر میں بھی وہی کپڑا اسی رنگ کی چوڑیاں اپنے لیے مانگ لوں۔ لیکن صفیہ آپا کوئی ایسی ویسی چیز نہ تھیں۔ انھوں نے طے کر رکھا تھا کہ جب تک میرے لیے خریداری نہیں ہو جائے گی وہ اپنی پسند کا اظہار ہی نہیں کریں گی۔ خواہ ان کے اس ٹال مٹول پر انھیں اماں کی کتنی ہی ڈانٹیں سننے کو کیوں نہ ملیں۔ یہی صورت حال پیش آتی تھی جب کپڑوں کے سلنے کا وقت آتا تھا۔ ہم جیسے گھروں میں سلائی ٹکائی کے لیے مغلانیاں تو شادی بیاہ ہی کے وقت بلائی جاتی تھیں ورنہ گھر کے مردوں کی شیروانیوں اور کالر والی قمیضوں کے علاوہ تمام کپڑے گھر ہی پر سلتے تھے۔ میں چھوٹی تھی میرے لیے کپڑوں کو سینے کی ذمہ داری بڑی آپا کے سپرد تھی۔ اور وہ بیچاری گھریلو پیداوار تھیں۔ ہم دونوں یعنی میں اور صفیہ آپا اسکول جاتے تھے۔ جمپر کی کاٹ چھانٹ اور گلے اور کالر کے رائج فیشن سے واقفیت رکھتے اور شوق بھی۔ آپا اس کوشش میں رہتی تھیں

کہ صفیہ آپا اپنا کپڑا سی لیں وہ دیکھ کر میرا بھی اُسی طرح کا بنا دیں۔ پر صفیہ آپا ایسا لگتا تھا کہ انھوں نے طے کر رکھا ہے کہ اس وقت تک اپنا کپڑا نہیں سئیں گی جب تک میرا نہیں سل جائے گا۔ اگر اتفاقاً سل بھی گیا تو اسے اِس طرح مقفّل تالے میں رکھیں گی کہ آپا کو اس کی ہوا بھی نہ لگنے پائے۔

صفیہ آپا کو جب کبھی بخار آتا تھا بہت ہی تیز آتا تھا۔ سرسامی کیفیت ہو جاتی تھی۔ ان کا مزاج ہر لحاظ سے گرم تھا۔ ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں رکھی جاتی تھیں۔ کتنی بچکانہ بات ہے مجھے حسرت تھی کہ مجھے بھی اتنا ہی تیز بخار چڑھے۔ اور یہ حسرت کبھی بھی پوری نہیں ہوئی۔ میری زیادہ تر تکلیفوں کا باعث میرا ہاضمہ ہوتا تھا۔ جب کبھی طبیعت خراب ہوتی ماں کا ہاتھ پیشانی پر رکھواتی۔ اُسکی گرمی تیز بخار کی گواہی کیوں کر دیتی گردن نسبتاً گرم ہوتی تھی سو اصرار کرتی کہ گردن چھوئیں اور یقین کریں کہ مجھے بھی اتنا ہی تیز بخار ہے جتنا صفیہ آپا کو آخر کو ماں سوئی لگوانے کی دھمکی سے اپنی جان چھڑاتیں۔

اوپر تلے کے بھائی بہنوں کے آپسی رشتہ کی یہ نوعیت کوئی عجوبہ بات نہیں۔ تم دونوں بھائیوں کی اپنی مثال موجود ہے۔ یاد کرو کس طرح اویس غریب تمہارے پیچھے پیچھے لگا رہتا تھا۔ اور ہم دانت پیس پیس کر اس کی پٹائی کرتے تھے۔ ایک جگہ صفیہ آپا نے اپنے خط میں لکھا بھی کہ اویس تو سوچتا بھی جادو کے ہی دماغ سے ہے۔

آج مجھے اس اعتراف میں کوئی جھجھک نہیں کہ صفیہ آپا کی شخصیت مجھ سے بہت بلند تھی بہت اعلیٰ۔ میں وہ ذہانت و دماغ کہاں سے لاتی جو قدرت نے انھیں دیا تھا۔ ان جیسا بننے ان تک پہنچنے میں مجھے ناکامیابی اٹھانی پڑتی۔ نتیجہ تھا میری کھسیاہٹ اور انکی جھنجھلاہٹ۔ افسوس کہ بچپن میں ہم دونوں کے درمیان دوستی اور یگانگت کا وہ رشتہ نہ بن سکا جس کی آرزو آج بھی اس عمر میں بھی میرے دل میں کھٹکتی ہے۔

اسباب و نتائج کے رشتہ کی پہچان تو بہت دیر میں ہوئی۔ صفیہ آپا غریب کو بہت ہی کم عمری سے جانے کن کن رسم و رواج کی عائد کردہ پابندیوں اور بندشوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ دل کچھ چاہتا ہو گا اور کرنا کچھ پڑتا تھا۔ غصہ آتا تو کس پر غبار نکلتا تو کیسے۔ میں چھوٹی تھی اور کمزور بھی نتیجہ ظاہر ہے۔ کاش میں سمجھ سکتی کہ وہ کس پتھریلے راستہ پر چل کر آگے بڑھ رہی ہیں اور میرے لیے راستہ صاف کر رہی ہیں میرے لیے ہراول بن رہی ہیں۔

کمسنی سے ہی صفیہ آپا کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑا ان کو سمجھنے کے لیے اس پس منظر، ان

اچھے یا برے اقدار و روایات سے واقفیت ضروری ہے جس کے سایہ میں ہماری نسل خصوصاً ہم عورتیں پلے بڑھے۔ ماشاء اللہ تمھاری نگاہیں بہت دور رس ہیں بہت کچھ جانتے ہو بہت کچھ کی سمجھ رکھتے ہو۔ پر کچھ ہو بھی تم ہمارا بچپن دہرا نہیں سکتے۔ ہمارے دل و دماغ میں چھپے ہوئے ان اثرات تک نہیں پہنچ سکتے جو ان رسم و رواج کی دین ہیں۔ تم تو تم ہو یہ کام تو ہم اپنے لیے مشکل پاتے ہیں۔ تمھاری معلومات تو صرف علمی اور کتابی ہے۔

ہمارے گھر کے بچوں میں سب سے بڑے تم ہی تھے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ابا اپنے ساتھ ایک دفعہ تمھیں ردولی لے گئے تھے۔ تم کہتے ہو کہ تمھیں اپنی تین سال کی عمر کے بعد کی باتیں یاد ہیں۔ شاید تمھیں نبی خانہ کے احاطہ کا وہ اونچا شاندار پھاٹک اور لمبی چوڑی کشادہ بارہ دریاں اور محرابوں والے بڑے بڑے دالان اور سہ دریاں بھی یاد ہوں۔ اب تو ان کے ملبہ رہ گئے ہیں ماضی کی یاد دلانے کے لیے۔ ہم سب بھائی بہن انھیں سہ دریوں میں سے ایک میں پیدا ہوئے۔ تمھاری ماں کی جائے پیدائش وہی گھر اور وہی قصبہ ہے۔

کسی زمانہ میں ردولی اودھ کے قصبوں میں ایک اپنی نمایاں خصوصیت رکھتا تھا۔ اپنی درگاہوں مزاروں اور عرس کے لیے مشہور تھا تمام تر آبادی مسلمان زمینداروں اور تعلقداروں پر مشتمل تھی ایک چھوٹا سا طبقہ ان غیر مسلم مہاجنوں کا تھا جو بگڑے ہوئے زمینداروں کو ان کی جھوٹی آن بان کو قرض کا سہارا دیتے تھے اور کچھ وہ پیشہ ور تھے جن کا وجود زمینداروں کی زندگی میں آرام پہونچانے کے لیے ضروری تھی۔ جاگیردارانہ معاشرے کی ناانصافیوں سے اگر نظر بچانا ممکن ہو تو بہت خوبصورت تھی یہ زندگی۔ خون پسینہ کی محنت ہو آس پاس کے گاؤں کے کاشتکاروں کی اور عیش ہوں زمینداروں کے۔ ہمارا خاندان بھی اسی طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن ابا کی افتاد طبع اپنے باپ بھائیوں سے کچھ بہت ہی مختلف تھی۔ سیدھے سادھے خاموش طبیعت نماز و روزہ کے پابند اپنے کام سے کام نہ کسی کے لینے میں نہ کسی کے دینے میں ۔ کہتے ہیں ہمارے دادا بہت ہی چاق چوبند اور ذہین تھے۔ آس پاس کے مواضعات میں زمینداری کی گتھیاں سلجھانے کے لیے بلائے جاتے تھے یقیناً ان کی نگاہیں بہت دور رس رہی ہوں گی اور انھوں نے اپنے چھوٹے بیٹے کی کمسنی ہی میں یہ بھانپ لیا کہ ان کا بیٹا اس میدان میں بالکل ناکارہ رہے گا سو انھوں نے اس کو انگریزی کی تعلیم دلوائی۔

جادو جانے تمھیں معلوم ہے یا نہیں ہمارے ابا ردولی کے سب سے پہلے میٹرک پاس تھے اور سب سے پہلے گریجوٹ۔ اس زمانہ کے لحاظ سے اس انقلابی قدم کا سہرا بھی انھیں کے سر رہا

کہ زمیندارانہ رہائش پر ملازمت کو ترجیح دی اور جھانسی جاکر محکمہ تعلیمات کو جوائن کیا اس زمانہ میں ردولی سے جھانسی جانا بالکل ایسا ہی رہا ہوگا جیسا آج کل 'پھورین' جانا۔

باپ کی قائم کردہ ان روایات کو تمھاری ماں نے نبھایا۔ وہ ردولی کی اور شاید ضلع کی سب سے پہلی بی۔اے بی۔ٹی پاس ملازمت پیشہ خاتون تھیں۔

تمھاری ماں کی ابتدائی تعلیم کی تمامتر ذمہ داری ابا نے لے رکھی تھی انگریزی اردو فارسی سب ہی کچھ صفیہ آپا ابا سے پڑھتی تھیں البتہ حساب میں کبھی کبھار اسرار بھائی سے مدد لے لیتی تھیں۔ قرآن شریف پڑھانے ایک استانی جی آتی تھیں۔ شام کو دفتر سے واپسی پر گرمیوں میں شربت پی کر جاڑوں میں چائے کے بعد ابا صفیہ آپا کو پڑھانے کے لیے بلاتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے اپنی اس بیٹی کو پڑھانے سے ان کی دن بھر کی تکان دور ہو جاتی ہو۔ ان کو اماں سے اکثر یہ کہتے سنا کہ "دیکھ لینا تمھاری یہ بیٹی تمھارے بیٹوں سے کہیں آگے رہے گی"۔ ہو سکتا ہے کہ میرے کچے ذہن میں ابا کے اس جملے نے صفیہ آپا سے رقابت کا جذبہ پیدا کیا ہو میں چھوٹی اور کمزور و بیمار ہونے کی بناء پر ابا کی لاڈلی تھی وہ مجھے میری پیٹ پوچھنی کہتے تھے۔ مجھے ان سے محبت مل رہی تھی۔ محافظت مل رہی تھی۔ لیکن صفیہ آپا کی پڑھائی کے سلسلہ میں ان کے لہجہ میں جو فخر ہوتا تھا 'اس لڑکی کو ایک دفعہ کچھ بتادو دوسری دفعہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو بہت کچھ خود سیکھ جاتی ہے وغیرہ وغیرہ"۔ مجھے بھلا اس قسم کی تحسین وستائش کیوں کر حاصل ہوتی۔ پڑھائی کی طرف میرا دل بہت آگے جاکر رجوع ہوا ہے شاید میری اس تبدیلی میں بھی ان جملوں کا بھی کچھ ہاتھ رہا ہو کون جانے۔

جادو مستقبل کو کوئی نہیں جانتا وہ اپنا ہو یا پرایا۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو میرے باپ اپنی بیٹی سے تمھارے بارے میں بھی کہتے "دیکھ لینا تمھارا بیٹا تم سے آگے رہے گا" ان کی زندگی میں تم اپنی قیامت خیز ذہانت کو جن راہوں پر لگا رہے تھے ان کا ذکر نہ ہو تو ہی بہتر ہے۔ تمھارے حصہ میں تو صرف نانا کی نصیحتیں و فضیحتیں اور لعنتیں ملامتیں ہی آئیں۔ ہمارے ماں باپ کی عمر کا آخری حصہ فکروں اور پریشانیوں میں ہی گزرا۔ کتنی فکر تھی انھیں تم دونوں بھائیوں کی تم کیا سمجھ پاؤ گے۔

صفیہ آپا نے بی۔اے کرنے کے بعد خاصا لمبا گیپ لے کر ایم۔اے کیا۔ ۱۹۴۶ میں تمھاری پیدائش کے بعد۔ اولیس پیٹ میں تھا۔ نوکری کی ذمہ داریاں گھر داری کا بوجھ طبیعت کا بھاری پن اور نوکر صاحب کا داغِ مفارقت۔ یہ تھے وہ حالات جنھوں نے تمھیں اپنے سے

دور کرنے پر مجبور کیا۔ تمھارے باپ کا مشورہ تھا کہ تمھیں فاطمہ بہن کے پاس بھیج دیا جائے۔ جانے فاطمہ بہن نے یہ ذمہ داری قبول نہیں کی آخر وہ بھی تو کام کرتی تھیں یا صفیہ آپا نے اس سلسلے میں پہلی دفعہ تمھارے باپ کی رائے کے خلاف اسٹنڈ لیا۔ ویسے بات تعجب کی ہے۔ بہر حال یہ پہلا موقعہ تھا جب میں علی گڑھ جا کر تم کو اپنے ساتھ لکھنؤ لائی۔ کیا گزر رہی ہوگی ماں کے دل پر اپنے اس جگر کے ٹکڑے کو اپنے سے الگ کرتے ہوئے جو انھیں جان سے بھی زیادہ عزیز تھا جو ان کے لیے شبیہ حبیب تھا۔ جو ان کے دیوتا کا اوتار تھا، مجھے آج بھی ان کا وہ اداس چہرہ یاد آجاتا ہے۔ پلیٹ فارم سے ٹرین کی روانگی پر وہ آنسو بہ ہی گئے جنھیں وہ پوری قوت سے پی جانے کی کوشش کر رہیں تھیں۔ اس آگاہی کے بعد کہ میں تمھاری ماں نہیں خالہ ہوں وہ بھی بن بیاہی اور ناتجربہ کار ہم سفر خواتین کے یہ جملے بھی میرے کان میں گونج جاتے ہیں۔ ”اے ہے پتھر کا دل ہوگا ماں کا اتنے چھوٹے بچے کو اپنے سے الگ کر دیا۔ یہ تو ابھی بول بھی نہیں پاتا کیسے رہ پائے گا تمھارے پاس وغیرہ وغیرہ، جادو تم چلے پہلے بولے دیر میں۔ تم نے اپنی قوت گویائی کو آگے کے لیے محفوظ کر رکھا تھا۔ میں ان معصوم بیویوں کو کیسے بتاتی کہ جس ہستی پر وہ سنگدلی کا الزام رکھ رہی ہیں اس کا تو ایمان ہے جذبات کے حسن اور عظمت میں۔ لیکن مقدر نے اسے ایسے راستہ پر ڈالا تھا کہ قدم قدم پر اسے اپنے جذبات کا خون کرنا پڑ رہا تھا اور عقل کے سامنے سر جھکانا۔ یہ راہ اس کے لیے کتنی کٹھن تھی کون جان سکتا ہے۔

باضابطہ کالج میں لیکچرر شپ کے لیے پوسٹ گریجوٹ کی کاغذی ڈگری لازمی شرط تھی۔ یہ تو ان کی صلاحیت اور اس دور میں پردہ کی بندش کی دین تھی کہ انھیں ٹریننگ کالج میں لیڈی سپروائزر کی جگہ مل گئی تھی۔ تمھارے باپ کے معاشی حالات کچھ خوشگوار نہ تھے۔ گوالیار سے بددل تھے۔ فاطمہ بہن نے ان کی بدحالی میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ سو شرافت کا تقاضہ تھا کہ ان کے تین بچوں کی تعلیم و تربیت میں شرکت کریں۔ ان حالات میں نوکری سے ہاتھ دھونا ممکن نہ تھا۔ دل تو اپنا تھا اس پر زخم پر زخم بھلے لگتے رہیں۔

ایک یاد دوسری یاد کو تازہ کرتی ہے اور لگتا ہے یہ سلسلہ لا انتہا ہے۔ جب صفیہ آپا فائنل کی تیاری کر رہی تھیں ان کے اور بھائی اختر کے حلقہ کے ایک صاحب جو یونی ورسٹی میں مستقل پوسٹ پر کئی سالوں سے کام کر رہے تھے۔ محض شوقیہ اور علم دوستی میں ڈبل ایم اے کرنے کا ارادہ کر بیٹھے وہ اور صفیہ آپا رات کو مختلف ذمہ داریوں سے بری ہو کر جوائنٹ اسٹڈی کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ کسی موضوع پر مضمون لکھ کر ان دونوں نے پروفیسر

رشید احمد صدیقی کو دکھایا۔ رشید صاحب نے ان صاحب سے کہا میاں تمھاری ڈویژن کہیں نہیں گئی ہے لیکن تم پوزیشن نہیں لا پاؤ گے صفیہ کا مقابلہ مشکل ہے سو ان صاحب نے اس سال امتحان میں بیٹھنے کے ارادہ کو ترک کر دیا سو ہمارے باپ کی یہ بیٹی صرف اپنے بھائیوں سے آگے نہیں رہی وہ بہتوں سے آگے تھی۔ تمھارے باپ سے بھی۔ بس قسمت سے ہار گئی۔

جانے بات کہاں سے کہاں بہک گئی۔ ذکر تھا ابا اماں کا۔ کبھی کبھار نانا نانی کی اور اس گھر کی یاد تمھیں بھی آہی جاتی ہو گی جس میں تمھاری ابتدائی کمسنی کا خاصا حصہ گزرا۔ بر آمدہ میں ایک طرف نماز کی چوکی تھی جس کی بغل میں وہ لمبے اور چوڑے ہتھوں والی آرام کرسی جو اب آؤٹ آف فیشن ہو چکی ہے۔ صبح سویرے ابا اس پر بیٹھے نظر آتے تھے۔ ہاتھ میں اخبار ہوتا تھا اور سامنے حقہ۔ قریب ہی وہ پلنگ تھا، جس پر ہماری ماں معہ اپنے قلعی شدہ گول پاندان کے بیٹھی ہوتی تھیں۔ یہ پاندان صبح سے شام تک مستقل کھلتا اور بند ہوتا رہتا تھا۔ شاید اس زمانہ میں ہر آنے جانے والوں کی خاطر داری پان اور الائچیوں سے ہوتی تھی۔ چائے کافی کا رواج نہ تھا جو آج ہے۔

شاید تمھیں بھی اندازہ ہو ہمارے باپ کو کتب بینی اور اخبار بینی سے بہت دلچسپی تھی۔ شعر و شاعری سے بھی ذوق رکھتے تھے۔ حافظہ بہت اچھا تھا تقریباً نصف قرآن مجید اور لاتعداد اشعار ازبر تھے۔ صوفی ازم کی طرف رجحان تھا مزاروں اور فاتحہ درود کے قائل تھے۔ بہت ہی نیک شریف اور خاموش طبیعت کے تھے ہمارے باپ۔ ہماری ماں ویسے تو ان پڑھ تھیں لیکن عملی معاملات میں بہت ذہین اور ہوشیار۔ حالات حاضرہ سے بے حد دلچسپی رکھتی تھیں۔ ابا انھیں اخبار کی سرخیوں میں شریک کرتے تھے اور وہ رائے زنی کرتی تھیں۔ یہی وہ وقت بھی ہوتا تھا جب بیوی شوہر کو گھریلو مسائل میں شریک کرنے کی ناکامیاب کوشش کرتی تھیں۔ کتنا سنتے تھے کتنا نہیں یہ تو میں نہیں بتا سکتی البتہ ہوتا یہ تھا کہ زیادہ تر اماں بولتی رہتی تھیں۔ اور ابا ہاں نہیں میں جواب دیتے۔ خانگی معاملات میں ہمارے باپ کا رویہ غالباً یہ تھا۔ یہ رہی ہماری آمدنی کم سمجھو یا زیادہ پر جو جی چاہے کرو۔ البتہ بچوں کی پڑھائی لکھائی کے مسائل ہوتے تو وہ ضرور دلچسپی لیتے۔ کہتے ہیں ہماری ماں اپنے وقت میں بہت ہی تیز طرار شوقین اور زندہ دل تھیں۔ جب شادی ہوئی تو دولھا میاں زیادہ شرمائے دلھن۔ کم ہماری نانی کو یہ شکایت تھی۔ ہماری ماں کی زندہ دلی اپنے اس جوان بیٹے کی ناگہانی موت کے ساتھ دفن ہو گئی جو صفیہ آپا کو ضرور یاد ہو نگے مجھے نہیں۔ اگر کچھ باقی بچی تھی تو وہ بڑی بیٹی کی جوانی میں بیوگی کی

نذر ہو گئی۔ ہماری یہ بہن ہم سب سے بہت بڑی تھیں اور ماں کا درجہ رکھتی تھیں۔ ماں باپ کی پہلی اولاد تھیں۔ بہت لاڈلی تھیں خصوصاً باپ کی لیکن قسمت کی کھوٹی تھیں۔ کہتے ہیں میاں شدید محبت کرتے تھے لیکن اس کی لازمی شرط تھی کہ بیوی ایک منٹ کے لیے نظر سے اوجھل نہ ہوں۔ البتہ ہر سال معاوضہ میں بیوی کو تحفتاً ایک بچہ دے دیتے تھے۔ پیدا تو ہوئے غالباً پانچ لیکن بچا صرف ایک وہ بھی پولیو کا شکار۔ ساس یعنی ہماری بڑی پھوپھی انتہائی دبنگ قسم کی چیز تھیں۔ اپنی تیزی طراری میں قصبہ میں مشہور۔ یقین کرنا مشکل لیکن زمانہ وہ تھا کہ ہمارے جیسے خاندانوں میں لڑکیوں کو لکھنا سکھانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ بے زبان پیداوار کے سپرد قلم کی طاقت کردی جائے کوئی سمجھداری نہ تھی۔ لیکن ہماری ان پھوپھی نے چھپ چھپا کر ہندی لکھنا سیکھ لی تھی۔ اکثر صفیہ آپا پر اماں کی ڈانٹ میں یہ جملہ ہوتا تھا "یہ تو اپنی بڑی پھوپھی پر پڑی ہے۔" برعکس ساس کے بہو یعنی ہماری آپا بالکل اپنے باپ پر پڑی تھیں۔ خاموش سنجیدہ سیدھی سادھی۔ بہر حال ساس کا تسلط بھی صبر و شکر سے جھیلتی رہیں۔ یہ تو تھی ان کے اس سہاگ کی کہانی جو غالباً شادی کے نو سال بعد اودھ میں پھیلی ہوئی ملیریا کی وبا کا شکار ہو گیا اور دل و دماغ پر لگے ہوئے داغوں میں بیوگی کے داغ کا اضافہ ہو گیا۔ وہ خود بھی ملیریا کا شکار تھیں۔ حالت خراب تھی۔ انصار اور اسرار بھائی چھوٹے چھوٹے تھے۔ ان کو پرانے ملازم عاشق علی کے ہمراہ اس پیام کے ساتھ آپا کی سسرال بھیجا گیا تھا۔ "اب لاش تو ہمارے حوالے کردو" اماں کا یہ جملہ میں کبھی بھول نہیں سکتی گو کہ میں اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ زندگی تھی آپا بچ گئیں۔ ماں باپ نے جوان بیوہ بیٹی کو اور یتیم تین سالہ نواسی کو کلیجہ سے لگایا لیکن ان چوٹوں کا مداوا تو ان کے پاس نہ تھا جو بیٹی کو لگ چکی تھیں۔ غرض یہ کہ بہت ہی بد نصیب تھیں ہماری یہ بہن بھی۔ اور ہمارے ماں باپ بھی جو یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔

میری یہ تمام یادیں بہت مدہم ہیں پھر بھی ذہن پر اثر چھوڑ گئیں ہیں۔ سوچتی ہوں صفیہ آپا ان تمام باتوں سے کس طرح متاثر ہوتی ہوں گی۔ وہ تو مجھ سے چار ساڑھے چار سال بڑی تھیں۔ سمجھدار تھیں حساس تھیں۔

کم عمری سے لڑکیاں جیون ساتھی کے رومانی اور سنہرے خواب دیکھنا شروع کر دیتی ہیں۔ صفیہ آپا کے رنگین خواب ان تلخ حقائق کے اثرات سے کیوں کر محفوظ رہ سکے ہوں گے۔ گھر کے بزرگ بچوں کو ایسے معاملات سے حد بھر دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بھلے کتنی کوشش کریں پر ان کے معصوم اور کچے ذہن کسی صورت میں محفوظ نہیں رہ پاتے۔ پھر صفیہ آپا جیسی حساس اور جذباتی شخصیت ان حالات سے بغیر متاثر ہوئے کیسے رہ پائی ہو گی شاید کم

عمری ہی سے انھیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ خواب اور حقیقت میں بڑا فاصلہ ہے اور شاید انھوں نے اس نوعیت کی تلخ حقائق سے مقابلہ کرنے اور ان کو زیر کرنے کی ترکیبیں بھی سوچ رکھی ہوں۔ کون جانے ماں باپ کو ان دکھوں سے محفوظ رکھنے کا تہیہ بھی کر رکھا ہو۔

ایک واقعہ جس کا علم مجھے حال ہی میں انصار بھائی کی معرفت ہوا تھا میری نظر میں ان اثرات کے سلسلہ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ جو صفیہ آپا کی شخصیت پر پڑے۔ جیسا کہ میں بتا چکی ہوں ہمارے گھر ایک شریف گھرانے کی ضرور تمند بیوہ خاتون ہم دونوں کو قرآن شریف پڑھانے آتی تھیں۔ ان کا ایک اکلوتا بیٹا تھا ذہین و محنتی اسرار بھائی سے ڈھائی تین سال بڑا ہمارے ابا نے اس لڑکے کی تعلیم کی کم وبیش پوری ذمہ داری اٹھا رکھی تھی اور اس کے مستقبل سے بہت توقعات رکھتے تھے۔ بڑی بیٹی کے سلسلہ میں خاندان میں رشتہ کا انجام دیکھ چکے تھے اس کے علاوہ خاندان میں کوئی تھا بھی نہیں صفیہ آپا کے جوڑ کا لڑکا۔ استانی جی بھی صفیہ آپا کو بہت پسند کرتی تھیں۔ ابا اماں کی اس خواہش کی ہمت افزائی استانی جی کی طرف سے ضرور ہوئی ہو گی۔ ایک ٹوٹی ہوئی منگنی کا تلخ تجربہ سہ چکے تھے سو اس خواہش کو اپنے ہی تک محفوظ رکھنا مناسب سمجھا گیا۔ ابا کی ہمت افزائی اور مدد سے یہ صاحبزادے آئی سی ایس کے مقابلہ میں بیٹھے۔ صفیہ آپا کی بد قسمتی سمجھو یا خوش قسمتی کامیاب بھی ہو گئے اب تو ان کی بڑی بڑی بولیاں لگنے لگیں وہ تو ہمارے گھر والوں کی دسترس سے باہر ہو چکے تھے۔ صفیہ آپا کی عمر بارہ تیرہ سال کی رہی ہو گی۔ اس عمر پر پہنچنے کے بعد خاندان کے لڑکوں سے ملنے جلنے پر پابندیاں لگ جاتی تھیں پھر غیر لڑکوں سے ملنے جلنے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہو سکتا کہ صفیہ آپا کو ماں باپ کی خواہش کا اندازہ نہ رہا ہو۔ خوابوں پر تو کوئی پابندی نہیں ہوتی پھر اس عمر کے خواب بہت ہی رنگین ہوتے ہیں بہت ہی دلربا۔ ادھ لان کے چکنا چور ہونے پر بے تحاشہ آنسو بھی بہتے ہیں۔ پر صفیہ آپا نے آنسو بہائے تو اس وقت بھی چھپ کر اور اگر پی گئیں تو اندر ہی اندر چوٹ کھائی۔ اور اس چوٹ کو بھی چھپا لے گئیں۔

سچ پوچھو تو اوپر تلے کے بھائی بہن یہ تین تھے اسرار بھائی انصار بھائی اور صفیہ آپا۔ ان تینوں کی عمروں میں بہت کم فاصلہ تھا۔ آپا کی جگہ سب سے بڑے ہونے کے ناطے اور میری سب سے چھوٹے ہونے کی بنا پر الگ تھی۔ اب رہ گئے یہ بیچ کے تین۔ سو لڑکوں اور لڑکیوں کا بھلا کیا مقابلہ لڑکے تو آج بھی اللہ میاں کے اپنے ہاتھوں کی خاص الخاص اشخاص پیداوار سمجھے جاتے ہیں۔ سب ہی جانتے ہیں اسرار بھائی سے ماں کی محبت دیوانگی کی حد تک کی تھی۔ انصار بھائی سے باپ کی بہت اونچی اونچی توقعات وابستہ تھیں۔ آخر کو بڑھاپے کے سہارے یہ

لڑکے ہی تو ہوتے ہیں لڑکیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔ یہ بات الگ رہی کہ یہ سہارے ہمارے ماں باپ کی قسمت میں نہ تھے۔ اب رہ گئیں تھیں صفیہ آپا بے چاری نہ ادھر کی نہ ادھر کی۔ لڑکوں کے لیے راستہ ہی الگ تھے۔ ان سے وابستہ توقعات الگ۔ ان کے لیے معیار الگ وہ گھر کی مہیا کردہ تمام سہولتوں کے حقدار اور لڑکیاں ان سہولتوں کو بہم پہنچانے کی ذمہ دار۔ ہم لڑکیوں کا بچپن بھی بہت ہی مختصر ہوتا تھا۔ چھ سات سال کے ہوتے ہیں کہ روک ٹوک کا سلسلہ شروع۔ ہنسی پر روک۔ اونچی آواز پر ٹوک، زیادہ بات چیت کی ممانعت۔ اگر دوپٹہ سر سے کھسک گیا تو قیامت آگئی۔ سو صفیہ آپا اور اسرار بھائی و انصار بھائی بہت کم عرصہ تک ایک راستہ پر چلے ہوں گے۔

انکار نہیں کہ فطرت نے بھی لڑکے لڑکیوں کے ساتھ برتاؤ میں تفریق رکھی ہے۔ اور اسی کا لحاظ رکھتے ہوئے عام طور پر لڑکوں اور لڑکیوں کے فطری رجحانات اور دلچسپیوں میں فرق ہوتا ہے۔ لیکن صفیہ آپا کا رجحان تو بچپن ہی سے ان مشاغل اور ان دلچسپیوں کی طرف تھا جو لڑکوں کے لیے مخصوص تھیں۔ میرا محبوب مشغلہ تھا گڑیوں سے کھیلنا ان کے کپڑے سینا ہنڈ کلیاں پکانا۔ لیکن صفیہ آپا کو شاید ہی میں نے کبھی ان دلچسپیوں کے قریب آتے دیکھا ہو۔ بلکہ اکثر میرا مذاق اڑاتی تھیں۔ کسی قسم کی کتاب ہاتھ لگ گئی یا کوئی رسالہ مل گیا وہ کسی کونہ میں چھپ گئیں اور جب تک کتاب ختم نہ ہو چھپے رہنے کی کوشش کرتی رہیں۔ خواہ اماں کی کتنی ہی ڈانٹیں نہ سنی پڑیں۔ ابا البتہ ان کی ہمت افزائی کرتے تھے قصہ کہانیوں کی کتابیں خرید کر لاتے تھے۔ عصمت اور تعلیم نسواں جاری کرا رکھا تھا۔

خانہ داری سے متعلق معاملات میں ہماری تربیت کے سلسلہ ہماری ماں بہت ہی سخت گیر تھیں۔ چلو ان کی بیٹیاں کڑھائی ٹکائی میں ماہر نہ ہوں پر ہر لڑکی کو تھوڑی بہت سلائی اور تھوڑا بہت کھانا پکانا تو سیکھنا ہی تھا۔ لیکن تمھاری ماں تھیں کہ ان کی طبیعت ان مشاغل کی طرف مائل ہی نہ تھی۔ جبر و زبردستی سے یہ ہنر سیکھ تو لیے تھے۔ پر ان کاموں میں ان کا دل کبھی نہ لگا۔ مجھے اماں کا یہ جملہ یاد آرہا ہے "موئی سوئی پکڑتی ہے جیسے سگریٹ پکڑے ہو" وہ کب جانتی تھیں آگے چل کر جب ان کی بیٹی سگریٹ پر سگریٹ پھونکنے والے کیلئے سوئی پکڑے گی تو یہ بورنگ مشغلہ اس کے لیے رنگین بن جائے گا۔

کتب بینی چھوڑ کر اگر ان کی طبیعت کسی تفریحی مشاغل کی طرف جاتی تھی تو وہ انھیں اسرار بھائی اور ان کے دوستوں کی طرف کھینچتی تھی۔ ان سے بحث و مباحثہ لڑائی جھگڑے میں

انھیں مزا آتا تھا۔ پر اس صحبت پر شدید پابندیاں اور روک ٹوک تھی۔ بچپن ہی سے انھیں اس تلخ حقیقت سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا کہ جذبات اور خواہشات کچلنے کے لیے ہوتے ہیں دل کسی طرف کھینچے جانا کسی اور طرف پڑتا ہے۔ تمھیں تعجب ہوگا عمر کے اس حصہ میں تمھاری ماں مزاج کی تیز تھیں صاف گو اور بہت حد تک منھ پھٹ۔ غم و غصہ کو اندر رکھنے کی قائل نہ تھیں۔ کبھی کبھی تو اماں اور آپا سے بھی زبان لڑا جاتی تھیں اور ڈانٹیں کھاتی تھیں۔

ان کی دو کمزوریاں مجھے یاد ہیں۔ چھپکلی سے بے طرح ڈرتی تھیں۔ چھت یا دیوار پر چھپکلی نظر آئی اور وہ چیخ کر بھاگیں۔ دوسرا مسئلہ تھا اندھیرا۔ کچھ رکھنے یا کچھ نکالنے کے لیے اگر انھیں رواق (ایک دروازے والا بڑا سا اسٹور) جانے کی ضرورت پڑتی تو ان کی حالت دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ کسے معلوم تھا کہ انھیں تمام عمر قسمت کی تاریکی سے لڑنا ہے۔ میرے نڈرپن سے فائدہ بھی اٹھاتی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتی تھیں تم میں تخیل (Immagination) کی کمی ہے سو ان کی طرف سے میری جرأت پر بھی پانی پھر جاتا تھا۔

جادو ویسے تمھاری نانی ان پڑھ ضرور تھیں لیکن ہم دونوں کو پڑھانے میں ان کا جو رول رہا ہے اسے میں بھول نہیں سکتی۔ اگر وہ مخالف ہوتیں تو شاید ابا بے چارے کی تعلیم نسواں کے قائل ہونے کے باوجود کچھ نہ چلتی۔ اس سلسلہ میں چمرو ماموں نے ہمارے گھر والوں کی بے حد ہمت افزائی کی۔ چمرو ماموں یعنی چودھری محمد علی ردولی کے تین تعلقداروں میں سے تھے۔ لیکن خیالات اور رجحانات میں انتہائی ترقی پسند، وہ قصبہ کے پہلے شخص تھے جنھوں نے اپنی لڑکیوں کو کرامت حسین اسکول کے ہوسٹل میں داخل کروایا تھا۔ ہمارے انصار بھائی بچپن ہی سے سیاسی و سماجی اصلاحات کی دھن میں تھے۔ ان کا بھی زور پڑا اور ہم دونوں بہنوں کا داخلہ کرامت حسین اسکول میں ہو گیا میرا داخلہ کے جی میں ہوا تھا اور صفیہ آپا کا غالباً چوتھی جماعت میں۔ سمجھو کہ صفیہ آپا کو پہلی دفعہ کھلی ہوا میں سانس لینے کا موقعہ ملا۔ ابھی ایک سال ہی گزرا تھا کہ ابا کی ترقی ہو گئی اور ان کا تبادلہ آگرہ کا ہو گیا۔ میں تو سب کے ساتھ آگرہ آگئی۔ صفیہ آپا کو اس ہوسٹل میں چھوڑ دیا گیا۔ کرنے کو تو اماں یہ حرکت کر گئیں لیکن اس عمر کی لڑکی گھربار سے الگ ماں باپ کی نگاہوں سے دور وہ بھی ایسے ادارے میں جس کی پرنسپل گٹ پٹ انگریزی بولنے والی سفید میم ہو ٹانگیں کھلی ہوئی اور پیروں میں اونچی ایڑی کے جوتے۔ اماں پر تو اختلاجی کیفیت طاری ہونی شروع ہوئی راتوں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ ابا نے دوڑ دھوپ کر کے اپنا تبادلہ علی گڑھ کا کروالیا۔ صفیہ آپا کو علی گڑھ بلالیا گیا۔ اور انصار بھائی نے ہم دونوں کا داخلہ عبداللہ گرلس اسکول میں کروادیا۔ اور ہمارے نام حمیدہ خاتون

سے حمیدہ سراج اور صفیہ آپا سراج میں تبدیل ہو گئے۔ انصار بھائی اپنی جگہ اپنی جدت پسندی اور ترقی پسندی پر نازاں اور فرحاں۔ ان کے تو خواب و خیال میں یہ بات نہ آئی ہو گی کہ وہ آج کی فیمینسٹ تحریک سے دشمنی مول لے رہے۔ جس کی نظر میں عورت کی شناخت کا دارومدار بھی اس پر ہے کہ اس کے نام کے ساتھ باپ یا شوہر کا نام نہ ہو۔ شاید میں تمھیں بتا چکی ہوں کہ صفیہ آپا کا عقیقہ کا نام آصفہ تھا۔ خاندان کے بعض بزرگ ان کو آصفہ ہی کہہ کر پکارتے رہے۔ جانے کیسے اور کب صفیہ میں تبدیل ہو گیا۔ سوچتی ہوں کہ اگر تقدیر کا تعلق نام سے بھی ہوتا ہے جیسا کہ کچھ لوگ سوچتے ہیں تو کتنا اچھا ہوتا کہ تمھاری ماں کا نام نہ بدلا گیا ہوتا اور وہ آصفہ ہی رہتیں۔ ویسے ان کی عرفیت صفو ہی تھی اور گھر کے اور خاندان کے زیادہ تر لوگ انھیں صفو ہی کہتے تھے۔

علی گڑھ میں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اسکول میں ان کا داخلہ ساتویں کلاس میں ہوا تھا اور پہلے ہی سال انھیں ڈبل پروموشن ملا تھا۔ مجھے ان کا کتنا احسانمند ہونا چاہیے۔ یقیناً ان کی نقل ہی میں میں نے جان توڑ کر محنت کی ہو گی۔ ویسے میرا رجحان حساب کی طرف تھا اور اس پرچہ میں مجھے پورے کے پورے نمبر مل جاتے تھے سو وہ اپنی ذہانت کے بل بوتے اور میں اپنی محنت کے بل بوتے کلاس میں فرسٹ پوزیشن لیتے رہے۔ لڑکیوں کی زبان پر تھا جب تک سراج سسٹرس ہیں ان کی کلاس میں کسی کی فرسٹ پوزیشن آ ہی نہیں سکتی۔

اب ہم باشعور تھے ہمارے آپسی رشتہ ہموار تھے۔ ایک دوسرے کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ میں ان کی ذہانت کی قائل تو وہ بقول اپنے میرے پریکٹیکل سینس کی اور کامن سینس کی۔ اب ان میں غصہ و جھنجھلاہٹ کا شائبہ بھی نہ تھا ان کی صلاحیتوں کو راہ مل گئی تھی وہ خوش اور مطمئن تھیں۔ انھیں استادوں کی شفقت حاصل تھی۔ دوستوں اور ساتھیوں کی محبت اور اپنے سے چھوٹوں کی عقیدت۔

اب وہ ایک بردبار خوش گفتار گرلس اسکول کی مقبول ترین طالبہ تھیں۔ ان کا رجحان ہمیشہ سے ادبی تھا ان کے دل پسند مضامین اردو، انگریزی اور فارسی تھے۔

ہماری ماں کے لیے ان کی شادی کی فکر بڑھتی جا رہی تھی۔ کچھ الٹے سیدھے رشتوں کو اسرار بھائی اور انصار بھائی کے مشوروں کی بناء پر رد بھی کیا گیا۔ کچھ ہمدردوں اور بہی خواہوں نے یونی ورسٹی اسٹاف کے ایک آدھ مناسب اور موزوں نوجوانوں کے نام بھی تجویز کیے پر بات آگے نہ بڑھ سکی۔ ویسے تو تمھاری ماں شکل و صورت سے بہت تیکھی تھیں اور بہت ہی

نمکین۔ سالم کی رائے میں بہت ہی سیکس اپیل تھی ان کی شخصیت میں۔ بہر حال یہ تو صنف مخالف ہی جانے ناک نقشہ قد و قامت ٹھیک ٹھاک ہی تھا پر بھرپیٹ سانولی تھیں۔ یعنی رنگت میں کالی تھیں۔ اور کھال کے رنگ کے سلسلہ میں ہمارے کومپلیکس (Complexes) نہ پوچھو۔ حسن کی لازمی شرط جلد کی سفیدی رہ گئی ہے۔ ہمارے ٹی وی کے پروگرام Fair & Lovely کے کتنے اقسام کی اشتہار بازی سے بھرے پڑے ہیں۔ رہا باطنی حسن اس کا کیا ذکر، غرض یہ کہ کوئی سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا ممکن ہے کہ بیوی کا اپنے سے زیادہ ذہین ہونا ان نوجوانوں کی حلق سے نہ اترتا ہو۔ غرض یہ کہ اماں کی فکریں اس سلسلہ میں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اگر مجھے ان نامکمل تحریکوں سے واقفیت تھی تو ایسا تو ممکن نہیں کہ صفیہ آپا کے کانوں میں اس کی بھنک نہ پہنچی ہو۔ حساس طبیعت پر اس کا بوجھ تو رہا ہی ہوگا لیکن اب وہ تلخی کو اندر اندر پی کر مسکرانا سیکھ گئی تھیں۔ زندگی میں جتنی مٹھاس حاصل تھی اس پر قانع تھیں۔

انٹر میڈیٹ تک راستہ صاف تھا۔ چلتی چلی گئیں اور اعزاز کے ساتھ سرٹیفکیٹ سمیٹتی رہیں۔ لیکن ان کا راستہ اس طرح صاف اور ہموار کیوں کر رہتا۔ آگے چل کر تو نہ جانے انھیں راستہ کی کتنی خار دار جھاڑیوں کتنے نکیلے پتھروں کا سامنا کرنا تھا۔ پریکٹس چھوٹ جاتی۔ عادت نہ رہتی۔

گرلس کالج میں ڈگری کلاسیں کھلنے کی خبریں تھی۔ لیکن پاپا میاں کی کوشش کارگر نہ ہوئیں اور جس سال صفیہ آپا نے انٹر میڈیٹ کیا اس سال بی اے کلاسیں نہ کھل سکیں اب پھر تمھاری ماں کے سامنے اندھیرا تھا۔ وہ سال کس اذیت میں گزرا ہوگا ان کا۔ کن اضطرابی کیفیتوں سے دوچار ہونا پڑ رہا ہوگا۔ ان کا دل ہی جانتا ہوگا۔ بعض وقت تو سارے بندھ ٹوٹ جاتے تھے۔ بے وجہ رونے لگتی تھیں جیسے ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا ہو۔ ہر لحہ انھیں اس حقیقت سے دوچار ہونا پڑتا تھا کہ بیٹی خواہ کتنی ہی لاڈلی کیوں نہ ہو ایک وقت آتا ہے جب وہ ماں باپ پر بوجھ بن جاتی ہے۔ اور ان کے دل و دماغ پر بیٹی کو غیروں کے سپرد کرنے کی بے چینی بڑھتی جاتی ہے۔ صفیہ آپا کی عمر بڑھتی جا رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ ان کی شادی کے سلسلہ میں ماں باپ کی فکریں۔

ہم پردہ دار تھے اور گھر کی چہار دیواریوں کے اندر۔ لیکن یہ چہار دیواریاں نہ ہی اتنی مستحکم تھیں نہ ہی اتنی مضبوط کہ ان میں کچھ دراڑیں نہ ہوں۔ اور ان دراڑوں کے ذریعہ باہر کی ابھرتی ہوئی سماجی سیاسی اور ادبی تحریکوں کی ہوائیں ہم تک نہ پہنچتی ہوں۔ ان ہواؤں کے

رخ بھی تو الگ نہ تھے جو باہر ٹکرا کر بکھر جائیں۔ اسرار بھائی کا حلقہ نوجوان ترقی پسند ادیبوں کا تھا اور انصار بھائی کا پرجوش سماجی اور سیاسی کارکنوں کا۔ مقصد میں ایکا سوچ میں اتحاد۔ اگر کچھ اختلافات تھے تو راہوں کے سلسلہ میں۔ ہر شام یہ سارے دوست ہمارے گھر جمع ہوتے تھے اور گرما گرم بحث مباحثوں کی آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچتی رہتی تھیں۔ اکثر سب کے جانے کے بعد گھر کے اندر بھی بحثوں کا یہ سلسلہ جاری ہو جاتا تھا۔ اماں کو وقت کے ان تمام مسائل سے دلچسپی بھی تھی اور معلومات بڑھانے کا شوق بھی۔ میں تو ہمیشہ سے خاموش تھی سنتی زیادہ تھی بولتی کم تھی۔ صفیہ آپا پورے جوش و خروش سے برابر کا حصہ لیتی تھیں۔ سوچتی ہوں ان کا دل کس طرح تڑپتا ہوگا کتنا چاہتا ہوگا کہ پردہ کی بندشوں کو توڑ تاڑ باہر جا بیٹھیں۔ کس مشکل سے وہ اپنے دل کو مارپاتی ہوں گی۔ لیکن انھیں آگے کے لیے یہ سبق سیکھنا ہی تھا کہ محبت و خیال کی لازمی شرط اپنی ذاتی خواہشوں کی قربانی ہے وہ اپنی جارحانہ بغاوت سے دکھی ماں باپ کے دل کو مزید دکھ نہیں پہنچانا چاہتی تھیں۔

میری بہن میں سماج کی عائد کردہ بے جا پابندیوں کو ٹھکرانے اور گھسی پٹی روایات کو توڑنے کا حوصلہ تھا۔ تمھارے باپ کے نام شادی سے پہلے جو خطوط انھوں نے لکھے تھے کیا وہ اس حقیقت کی گواہی نہیں دیتے؟ ہمارے جیسے ماحول کی پلی ہوئی ایک جوان لڑکی اپنے جوان بھائی سے کھل کر سیکس کے موضوع پر بات کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے شادی ہر لڑکے لڑکی کی فطری ضرورت ہے لیکن اس ضرورت کے باوجود ان کی نظر میں جنسی تقاضوں کی ثانوی اہمیت ہے۔ یہ ہیں ان کے اس خط کے جملے جو انھوں نے انصار بھائی کو جیل میں لکھ کر بھیجا تھا اور بھائی اختر کے ساتھ اپنے رشتہ کے سلسلہ میں مشورہ لیا تھا۔ بمبئی دلی جیسے شہروں کی اپنے لحاظ سے اونچی سوسائٹیوں کو چھوڑ کر سیکس کا موضوع لڑکیوں کے لیے اب تک ممنوع ہے۔ جانے کتنی لڑکیاں اپنی اس معصومیت کا شکار بھی ہو جاتی ہیں۔ سچ پوچھو میں خود حیران رہ گئی ان کی اس جرأت پر۔ اس وقت میں اپنی عمر کی آخری منزل پر ہوں۔ لیکن اب بھی میرا تہذیبی ورثہ چپکے سے ہی سہی میرے کان میں یہ کہہ جاتا ہے۔ جنسی مسائل سے متعلق موضوع لڑکیوں میں آپس میں کھس پھس کرنے کے لیے ہیں کھل کر بات کرنے کے لیے نہیں۔ یہ آوازیں صفیہ آپا کے کانوں میں بھی آتی ہوں گی لیکن ان میں ان آوازوں کو ان سنی کرنے کی ہمت تھی۔ اور اسی ہمت اور اسی جرأت نے ان کی مدد کی ان آزمائشوں کے مقابلہ میں جو انھیں اپنے آگے کی زندگی میں پیش آئیں۔

ایک سال بعد گرلس کالج میں بی اے کلاسیں کھل گئیں اور صفیہ آپا کا راستہ ایک دفعہ پھر

روشن ہو گیا۔ کچھ ہی دنوں بعد ابا کے ریٹائرمنٹ کا وقت آگیا۔ اسرار بھائی انصار بھائی کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ میں تھی اور میرا بھانجا ابو جس نے ہائی اسکول کیا تھا۔ صفیہ آپا کو ہاسٹل میں چھوڑا گیا اور ہم دونوں ابا و اماں کے ساتھ لکھنؤ آگئے۔ صفیہ آپا نے علی گڑھ کے ہاسٹل میں رہ کر بی۔ اے اور بی ٹی کیا۔ ان کے اساتذہ ان سے از حد متاثر تھے سو ان کو ٹریننگ کالج میں لیڈی سپر وائزر کی جگہ مل گئی۔

میری نظر میں ہی وہ چند سال تھے جس میں وہ اپنے لیے جییں اور اپنی مرضی سے جییں۔ اس کے بعد تو ان کی زندگی کا ہر لمحہ ہر سانس اس کے لیے تھا جس کا ہاتھ انھوں نے تھاما تھا بلکہ کہنا چاہیے برا مانو یا بھلا اس کے لیے جس نے ان کا ہاتھ تھاما تھا۔ حرف آشنا اور زیرِ لب کی اشاعت کے بعد کون ہے جو نہیں جانتا کہ تمھاری ماں نے اپنی آخری سانس تک تمھارے باپ کے لیے ایک سپر کا کام کیا۔ سپر کتنی ہی آہنی اور مضبوط ہو کبھی نہ کبھی تو ٹوٹ ہی جاتی ہے۔

اپنی ذات کو اور پھر ایسی پر صلاحیت ذات کو اس طرح دوسرے کے لیے وقف کر دینا اور اس عمل میں اپنے کو فنا کر دینا۔ خوبی سمجھی جائے یا خامی۔ اپنی اپنی سوچ کی بات ہے۔ پر اس سے تو انکار ممکن نہیں کہ اپنے لیے تو ہر کوئی جیتا ہے پر دوسرے کے لیے جینا اور اس طرح سے جینا جس کا اندازہ ان کے خطوط سے ہوتا ہے۔ جادو! بڑا دل گردہ چاہیے تھا اس کے لیے۔

صفیہ آپا کی شخصیت میری طرح داخلیت پسند نہ تھی۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران انھیں اپنے ہم مذاق ملے۔ اور انھوں نے اُن سے پورا لطف اٹھایا۔ عصمت آپا اور سلطانہ آپا ان کی ہم عصر تھیں لیکن ان سے ایک یا دو سال سینئر۔ سلطانہ آپا کی چھوٹی بہن ان کی کلاس فیلو اور دوست تھیں۔ ملازمت کے دوران سلمیٰ حقی سعیدہ قدوائی اور آمنہ ملک سے وہ بہت قریب تھیں۔ سلمیٰ آپا اردو پڑھاتی تھیں علمی و ادبی مذاق رکھتی تھیں شعر و شاعری سے بھی ذوق تھا شان الحق حقی کی منگیتر تھیں اور اسٹاف کوارٹر میں صفیہ آپا کی پڑوسن تھیں۔ سعیدہ آپا صفیہ آپا کی اسکول کی ساتھی تھیں۔ ان کا مضمون جغرافیہ تھا اور دلچسپیوں اور مذاق میں خاصی گھریلو تھیں۔ طبیعت میں نیکی تھی شرافت تھی اور خلوص تھا میری نظر میں سعیدہ آپا کی شخصیت کے یہی پہلو تھے جنھوں نے انھیں صفیہ آپا سے اتنا قریب کر رکھا تھا۔ ورنہ اس وقت تک صفیہ آپا کو گھریلو مسائل سے ذرا دور ہی کا لگاؤ تھا۔ کبھی کچھ پکاتی تھیں تو جانو بحالت مجبوری۔ ایم اے کرنے کے دوران اسٹاف کوارٹر میں دو سال میں ان کے ساتھ رہی اکثر نوکر غائب ہو جاتا تھا، ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ میری تیار کردہ ڈشوں کی قصیدہ گوئی کر کے باورچی

خانہ کا کام مجھ پر ڈال دیں مجھے اب تک یاد ہے ایک دن بولیں دیکھو نا حمیدہ تم تو اقتصادیات کی طالب علم ہو ایڈم اسمتھ نے تقسیم عمل کے کتنے فوائد بتائے ہیں۔ تم اتنا اچھا پکاتی ہو۔ اب کوئی کھانے والا اور تعریف کرنے والا تو ہونا چاہیے۔ تم پکاؤ اور لطف لے کر کھانے والا نہ ہو تو بتاؤ یہ کوئی انصاف کی بات ہو گی۔ کتنی مایوسی ہو گی پکانے والے کو اور یقیناً اس کے فن پر اثر پڑے گا ہی۔ ایسا نہیں تھا کہ میں ان کی چال سمجھتی نہ ہوں۔ لیکن کوکنگ سے دلچسپی میری باقی تھی سوا نھیں اوبلائج (Oblige) کرنے میں کوئی نقصان نہ تھا۔ سعیدہ آپا البتہ شریک ہوتی تھیں۔ ان کی ماں اور بھائی بہن میرس روڈ پر رہتے تھے۔ ہر دن کا زیادہ حصہ وہ اپنی ان دوستوں کے ساتھ گزارتی تھیں۔

اب صفیہ آپا کی شخصیت ایک پر عزم اور پر اعتماد لڑکی کی تھی جس نے زندگی کی کچھ تلخیاں جھیلی ضرور تھیں۔ لیکن ان کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا تھا۔ البتہ طبیعت کی بردباری اور استقلال میں کچھ اضافہ ہی ہوا تھا وہ ان لڑکیوں میں سے بھی نہ تھیں جو ہر بات سر ڈھک کر بے چوں چراں قبول کر لیں۔ اور اپنی سعادتمندی پر فخر کریں۔ انھوں نے اکثر سر جھکایا لیکن ماں باپ کی محبت میں ان کی مجبوریوں اور کمزوریوں میں شرکت کی خاطر۔

اب وہ پردہ کی قید سے آزاد تھیں اپنی مرضی کی مالک تھیں ان کی ادبی و علمی صلاحیتوں سے محمود صاحب اور غفور صاحب جیسی ہستیاں ان سے مرعوب تھیں اور اکثر شام ایک پیالی چائے پر ان کے پاس آ جاتیں تھیں۔ علمی اور ادبی مسائل پر گفتگو ہوتی تھی۔ گرما گرم بحثیں ہوتی تھیں۔ کچھ دنوں کے لیے اماں بطور مہمان ہمارے ساتھ ٹھہریں میں نے محسوس کیا کہ وہ اس بات سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھیں کہ ان کی جوان اور کنواری بیٹی ان مردوں کی صحبت میں زیادہ چہکتی تھی بہ نسبت ان ساتھی خواتین کی جن کا مرکز دلچسپی کپڑوں اور ساڑیوں کی قیمت اور ڈیزائن ہوتے تھے۔

ہم دونوں بہنیں علی گڑھ میں بے پردہ تھے لیکن لکھنؤ اسٹیشن پر برقعہ پوش ہو کر اترتے تھے۔ ہمارے ماں باپ بذات خود پابندیوں کے قائل نہ تھے لیکن ان کی بیٹیوں کی طرف انگلی اٹھائی جائے اسے برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ انھیں ہم پر پورا اعتماد تھا کہ ہم ان کی اس اجازت سے غلط فائدہ نہیں اٹھائیں گے کہ علی گڑھ میں ہم جو چاہیں کریں۔ ان کی خاطر ہمیں ردولی اور لکھنؤ میں پردہ کا لحاظ رکھنا ہوتا تھا۔ شادی کے بعد ہی ہم دونوں کو اس پابندی سے نجات ملی۔

۱۹۴۲ صفیہ آپا کی زندگی کے لیے بہت اہم ثابت ہوا۔ سلمیٰ آپا کے رشتہ کے بھائی یعنی تمھارے باپ اپنی کزن سے ملنے گرلس کالج کے ہوسٹل آئے۔ انھوں نے اپنے دوست مجاز کی بہن ہونے کے ناطے صفیہ آپا سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ سلمیٰ آپا سے ان کی دوست کا ذکر بھی سن چکے ہوں گے۔ یہ شام بھائی اختر اور صفیہ آپا کی ملاقات کی پہلی شام تھی۔ ایک کھوئی کھوئی سی شخصیت۔ اپنے سے بے نیاز اپنے ارد گرد سے بے نیاز۔ لہجہ دھیما دھیما اور نرم سا۔ حلیہ شرمیلا سا۔ پیشانی پر پڑے ہوئے کچھ الجھے اور بکھرے ہوئے بال جنھیں گاہے گاہے گردن کو جھٹکا دے کر ہٹانے کی کوشش۔ اس وقت کون جانتا تھا کہ ان کی پوری شخصیت ہی کچھ ایسے الجھاؤ اور بکھراؤ کا شکار ہے کہ سمیٹے نہیں سمٹ رہی ہے پردہ تھک ضرور گئے ہیں اور سہارے کی خواہش رکھتے ہیں۔

غرض یہ کہ بھائی اختر کے شاعرانہ انداز شاعرانہ مزاج اور شاعرانہ حلیہ نے پہلی ہی ملاقات میں صفیہ آپا کے دل کو جیت لیا۔ عقل نے بھی حامی بھر دی کہ ایک ہم مذاق ہم ذوق ساتھی مل جائے۔ پیاسی زندگی کو اس سے زیادہ کیا چاہیے۔ بھائی اختر کی اس زمانہ کی ہلکی پھلکی اور رومانی شاعری نہ جانے کتنی ادب نواز نوجوان لڑکیوں کا دل موہ چکی تھی۔ غرضیکہ صفیہ آپا اس پہلی ملاقات میں ان کی ہو بیٹھیں۔ بھائی اختر بھی غالباً کوئی ایسا ہی مقصد لے کر آئے تھے۔

کچھ دنوں بعد باضابطہ شادی کا پیام پہنچا۔ پڑھا لکھا لڑکا شاعر سبھی پر برسر روزگار۔ کھاتے پیتے سید خاندان کا اور کیا چاہیے حامی بھر لی گئی۔ اس سلسلہ میں مجھے ایک بات پر حیرت رہی۔ انصار بھائی تو جیل میں تھے۔ ویسے بھی بھائی اختر کی دوستی اسرار بھائی سے تھی۔ مشورہ میں ان کی شرکت لازمی تھی ایسا ممکن نہیں کہ انھیں بھائی اختر کی گھریلو زندگی کی پیچیدگیوں سے واقفیت نہ رہی ہو اور انھیں فاطمہ بہن اور بھائی اختر کے درمیان قریبی تعلق کا علم نہ ہوگا۔ بھائی اختر کا اپنی بہن سے تو کچھ تعلق تھا بھی پر ماں سے شدید کشیدگی تھی اور اس کی وجہ غالباً فاطمہ بہن سے ان کے تعلقات تھے۔ اسرار بھائی نے ان باتوں کے ذکر سے قطعی گریز کیا آخر کیوں؟ اگر اشارہ کیا بھی تو بھائی اختر کی نازک مزاجی کا مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ برآمدہ میں ٹہل رہے تھے اور صفیہ آپا سے مخاطب ہو کر بولے تھے۔ ابھی سوچ لو مزاج بہت جناتی ہے۔ جیسے انھیں آنے والی دشواریوں کا احساس دلا رہے ہوں۔ یہ گتھی میں حرف آشنا پڑھنے کے بعد ہی سلجھا پائی پیام آنے سے پہلے ہی اسرار بھائی اور صفیہ آپا میں اس ہونے والے رشتہ کے سلسلہ میں تفصیلی گفتگو ہو چکی تھی۔ صفیہ آپا نے واضح طور پر اپنے بھائی پر اپنی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔ بھائی اختر کی زندگی کی پیچیدگیوں کو جانتے ہوئے بھی۔ ایسی صورت میں اسرار

بھائی نے گھر والوں کی لاعلمی ہی مناسب سمجھی۔ صفیہ آپا نے جس خار دار راستہ کو اپنانے کا ارادہ کرلیا تھا۔ اس میں رکاوٹ پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ جوان بیٹی ماں باپ پر کتنی ہی بھاری کیوں نہ ہو جانتے بوجھتے جیتی مکھی تو نہیں نگلی جاسکتی تھی۔ اما ابا کا فیصلہ ضرور ڈگمگا جاتا۔ تمھارے باپ کے ساتھ زیادتی ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ انھوں نے صفیہ آپا سے فاطمہ بہن کے ساتھ اپنے تعلق کو چھپانے کی کوشش کی۔ ۱۹ر اکتوبر ۱۹۴۳ء کے خط میں صفیہ آپا لکھتی ہیں "ایسے حالات میں اگر آپ کی گزشتہ زندگی ایک دوسرے کی نوازشوں کی بدولت جینے کے قابل بنی رہی اور آئندہ بھی اس دوستی سے آپ کی زندگی میں کسی کمی کے پورا ہوتے رہنے کا امکان ہے تو شاید آپ کی دوستی کو قابلِ قبول سمجھنے کے بعد آپ کی اس دوست (فاطمہ زبیر) کی دوستی قبول کرنے میں مجھے مسرت ہوگی۔ میں نے ان دو تین دنوں میں اپنے کو بہت ٹٹولا اور غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ سکی کہ اگر موصوفہ سے اس قدر پُر خلوص تعلقات رکھنے کے باوجود زندگی میں ایک خلا محسوس ہوتا ہے جس کو پر کرنے کے لیے میری ضرورت حقیقتاً اس شدت اور خلوص سے محسوس کی ہے۔ جس کا اظہار آپ نے کیا ہے تو میں اس خلا کو پر کرنے کے لیے اپنے کو تیار پاتی ہوں۔ میں اپنی طرف سے ایک فیصلہ پر پہنچ چکی ہوں اور اپنے کو ثابت قدم پاتی ہوں" اس ثابت قدمی پر کون انگلی اٹھا سکتا ہے۔ دوست کی دوستی کو جس خندہ پیشانی سے نبھایا اس کی مثال مشکل ہے۔

غرض یہ کہ رشتہ منظور کرلیا گیا۔ حامی بھر دی گئی رضامندی کا خط بھیج دیا گیا۔ مسئلہ تھا تاریخ کے تعین کا۔ لکھنؤ سے خط پر خط جا رہے ہیں گوالیار سے قطعی خاموشی۔ سوچو تمھارے نانا نانی کو کس اذیت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہوگا اور تمھاری ماں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ آخرکار صفیہ آپا نے وہ قدم اٹھایا جس پر بقول ان کے اپنے، روایات کو شاید لرزہ ہی آجائے "میرے یہ اقدام دیکھ کر" یہ جملہ ان کے اس خط کا ہے جو انھوں نے بھائی اختر کو شادی سے پہلے یکم اکتوبر میں لکھا تھا۔ ایسا نہ تھا کہ انھیں اپنے اس قدم کی جرأت آمیزی کا احساس نہ تھا۔ ان کے خط کا آخری جملہ یہ ہے "یہ نہیں معلوم کہ اس تحریر کو آپ کس قدر اہمیت دیں گے لیکن کم ازکم یہ توقع ضرور ہے کہ بے جا رسوائی نہ کیجیے گا۔" بہرحال کسی صورت دسمبر کی پچیس تاریخ شادی کے لیے طے پا گئی۔ ہر لڑکی کے لیے اس کی شادی کی تاریخ اس کی زندگی کی اہم ترین تاریخ ہوتی ہے۔ زندگی کا نقشہ بدل جاتا ہے لیکن جس اتھل پتھل کا سامنا صفیہ آپا کو کرنا پڑا اس سے خدا ہر کسی کو محفوظ رکھے۔

شادی کی تقریب کی داستان بھی کچھ انوکھی سی رہی تفصیل سے تم کو یقیناً فلمی دلچسپی کا مواد

ہاتھ لگ جائے گا۔ مدتوں بعد گھر میں تقریب کی نوبت آئی تھی۔ سب ہی کو اپنے ارمان پورے کرنے کا شوق تھا۔ غرض یہ کہ حسبِ حیثیت زور شور سے تیاریاں شروع ہو گئیں بارات کو ٹھہرانے کے لیے پڑوسیوں سے کمرے مانگ کر سجائے گئے۔ اسٹیشن سے بارات کو لانے کے لیے گاڑیوں کا انتظام ہوا۔ پانچ وقت کے کھانے کا مینو نہایت ہی سنجیدہ صلاح مشورہ کے بعد طے ہوا۔ زمینداری ختم ہو چکی تھی لیکن اپنے گاؤں میں ابا کی ہر دلعزیزی برقرار تھی۔ چھوٹے چودھری کی عزت ان کے پرانے رعیت کی عزت تھی شاہی ٹکڑے اور فیرنی تو سب ہی کھلاتے ہیں ایک وقت کے لیے رساول اور ملائی کا انتظام ہوا جو اسی دن گاؤں سے لائی گئی۔ اس زمانہ میں ہم جیسوں کے گھر میں فرج تو تھا نہیں۔ پروگرام یہ تھا کہ بارات چوبیس کو آئے گی اور دلھن کو رخصت کرا کے ناشتہ کے بعد چھبیس کو واپس ہو گی۔

اللہ کا شکر ہے کہ بارات پہنچ تو گئی مقررہ وقت پر اور مقررہ تاریخ پر۔ لیکن کار جب گھر پہنچی تو اس میں سے دولھا، فاطمہ ، بہن اور بھائی اختر کی بہن اترے۔ بارات کے بقیہ لوگ تو خیر آباد سے اور اس کے قرب و نواح سے پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ لیکن ماں اور خالہ تو گوالیار سے ہی آ رہی تھیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کدھر ہیں۔ تھوڑی دیر بعد گھر کے سامنے ایک تانگہ رکا اس میں سے دو گوری چٹی فربہ سی برقعہ پوش خواتین ہانپتی کانپتی اتریں۔ پتہ چلا کہ وہ دوسرے کمپارٹمنٹ میں تھیں بارات کا استقبال کرنے والوں کو ان کا علم نہ تھا۔ بہن غالباً بھائی کی نازک مزاجی سے اس درجہ خوفزدہ تھیں کہ انھوں نے بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ماں و خالہ بیٹے کی مرضی کے خلاف ساتھ ہو لی ہوں۔ اس وقت تک ماں بیٹے میں از حد تلخی تھی۔

چڑھاوے میں ایک جوڑا کپڑا تھا۔ بہن کی طرف سے وہ کرن پھول تھے جو میں نے اس امید کے ساتھ تمھارے سپرد کیے ہیں کہ وہ تمھاری بیٹی پہنے گی، جانے تمھیں اندازہ ہے یا نہیں کہ تمھاری بیٹی پر اپنی دادی کی نمایاں چھاپ ہے۔ ایک گول تھالی میں چاندی کے سکے تھے۔ کہاں استعمال ہوئے پتہ نہیں چلا صفیہ آپا کو تو کچھ خریداری کرتے دیکھا نہیں ممکن ہے کہ وہ ماں کی طرف سے رہے ہوں اور واپس کر دیے گئے ہوں۔ ایک آدھ دفعہ صفیہ آپا سے میں نے پوچھا بھی لیکن وہ ہمیشہ ٹال گئیں۔ میں جانتی تھی کہ زیادہ کریدنے سے کچھ حاصل نہیں۔

غرضیکہ شادی کی تقریب بخیر و خوبی انجام پا گئی۔ باراتیوں کی دل کھول کر خاطر مدارات

ہوئی۔ منتظمین نے اطمینان کا سانس لیا۔ بیٹی کی رخصتی سے پہلے قریبی عزیز و اقربا کیسے چلے جاتے۔ سو تیسرے دن بھی گھر خاصا بھرا ہوا تھا۔ لکھنؤ سے گوالیار کا سفر لمبا تھا ناشتہ ساتھ کرنے کے لیے کباب پراٹھوں اور مٹھائی کا انتظام ہو رہا تھا۔ اس دوران اندازہ ہوا کہ خواتین میں کچھ کانا پھوسی ہو رہی ہے اور چہرے پر کچھ بدحواسی کے آثار ہیں۔ کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ ماں خالہ بہن و بہنوئی و دیگر باراتی طے شدہ ٹرین سے چلے جائیں گے۔ لیکن دولھا دلہن اور فاطمہ بہن آج نہیں جائیں گے۔ سوچو ہمارے ماں باپ پر کیا گزری ہو گی۔ ان کے لیے تو یہ بالکل انہونی سی بات تھی۔ مراثنیں بابل کے گیت گانے پر اتارو۔ عزیز رشتہ دار بیٹی کو سینہ سے لگاکر آنسو بہانے پر آمادہ۔ ان کو یہ خبر دینا کہ بیٹی رخصت نہیں ہو رہی ہے ہم سب کے لیے ہی ایک مسئلہ بن گیا۔ آپا کی عقل نے کام کیا اور یہ بہانہ تراشا گیا کہ دونوں ملازمت پیشہ لوگ ہیں ابھی جائیں تو پھر لڑکی کو محرم کا چاند دکھانے واپس لانا مشکل ہو گا۔ خواہ مخواہ زحمت ہو گی۔ فاصلہ بھی کافی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ رواج کے مطابق بیٹی محرم کا چاند میکہ میں دیکھنے کے بعد ہی سسرال بھیجی جائے۔ گو کہ ہم میں سے کوئی بھی اس قسم کی توہم پرستی کا قائل نہ تھا۔ پر کوئی بات تو بنانی ہی تھی۔

اول دن ہی سے تمھارے باپ کے موڈ کے اتار چڑھاؤ کا تجربہ ہو گیا۔ بعد میں تو اکثر یہ ہوتا رہا کہ آمد کی تاریخ پر پہنچے نہیں۔ واپسی کی تاریخ پر گئے نہیں۔ ساس سسر اس انتظار میں نیچے بیٹھے ہوئے تھے کہ داماد کو خدا حافظ کہیں اوپر سے میرا بلاوا آتا تھا اور صفیہ آپا سے اطلاع ملتی تھی کہ پروگرام ملتوی ہو گیا ہے۔ مجھے آڑے آنا پڑتا تھا اور نیچے جاکر یہ بتاتی تھی کہ میں نے بہت ضد کی اور آج انھیں روک لیا۔ اندازہ تو سب ہی کو ہو گیا تھا کہ یہ ذات اپنی مرضی کی ہے اس پر زور زبردستی ممکن نہیں۔ مصلحت اسی میں ہے کہ پردہ پڑا رہے۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے بقیہ باراتیوں کے رخصت ہونے کے بعد بھائی اختر اور فاطمہ بہن کئی دن ٹھہرے۔ اور ہمارے مہمان اپنی حسرتوں کو دل میں لیے اپنے اپنے گھر واپس ہو لیے۔ ہاں ماں اور بہن کے جانے کے دوسرے ہی دن بعد فاطمہ بہن نے زنجیر میں پڑا ہوا دل کی شکل کا ایک لاکٹ تمھاری ماں کے گلے میں ڈالا یہ کہتے ہوئے کہ آج میں اپنی امانت تمھارے سپرد کر رہی ہوں۔ اس لاکٹ میں بھائی اختر کی تصویر تھی۔ اس امانت کی حفاظت میری بہن نے اپنی آخری سانس تک کس طرح کی یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ کن کن آزمائشوں سے نہیں گزریں اپنا سب کچھ ہی تو داؤں پر لگا دیا۔

دارالسراج چھوڑ کر صفیہ آپا گوالیار پہنچیں۔ اوروں سے سننے میں آیا کہ گھر کا تالا ان سے کھلوایا گیا اور اندھیرے گھر میں ان سے چراغ جلوایا گیا۔ اندھیرے سے ڈرنے والی اس لڑکی نے شاید اس لمحہ یہ تہیہ کیا ہو کہ اس بند گھر میں وہ تازی ہوا لاکر رہے گی اور روشنی کی اس لو کو تیز سے تیز تر اور اس کے دائرہ کو وسیع سے وسیع تر کر کے ہی چین لے گی۔ ارادہ کی مضبوط اس شخصیت نے اس کاوش میں اپنے جسم کے تیل کی آخری بوند صرف کر دی پر ہمت نہ ہاری۔

شادی ہر لڑکی کے لیے ایسا موڑ ہے کہ اس کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ نئے گھر کو اپنانا۔ نئے رشتوں کو نبھانا۔ انجانے لوگوں کو قریب لانا۔ صفیہ آپا کی زندگی کا یہ موڑ کتنا پیچیدہ تھا۔ اور کتنا الجھا ہوا تھا۔ اندازہ مشکل ہے۔ بڑی ہمت بڑی سکت چاہیے تھی اس رہ گزر پر چلنے کے لیے۔ سطحی طور پر دیکھنے والوں کو تو ایسا لگا جیسے ان کی شخصیت کے خدوخال بالکل ہی بدل گئے ہوں۔ جیسے ان کی ذات نے ایک نیا روپ دھار لیا ہو۔ اب وہ ایک ایسی عورت نظر آتی ہیں جس کو شوہر سے دیوانگی کی حد تک محبت ہو جو پتی ورتا کا مجسمہ ہو اور شوہر کو دیوتا بنا کر پوجا کر رہی ہو۔ جس کے لیے خدائے مجازی اور خدائے حقیقی کی درمیانی لکیر مٹ گئی ہو۔ اب اس ہستی کا جس کے سامنے آگے بڑھنے کا وسیع میدان دامن پھیلائے ہوئے تھا جس کو قدرت کی طرف سے بلندیاں فتح کرنے کی صلاحیتیں ملیں تھیں جرأت ملی تھی ہمت ملی تھی۔ زندگی کا صرف ایک مقصد تھا۔ شوہر کی ناز برداری، شوہر کی خدمت گزاری، شوہر کی خوشنودی شوہر کا تحفظ۔

محبت کے مختلف روپ ہوتے ہیں۔ ماں کی محبت بے لوث بے غرض جو سب کچھ دے کر ہی سب کچھ پا لیتی ہے۔ بہن کی محبت پیار و لگاؤ دیتی ہے اور پیار و لگاؤ چاہتی ہے۔ بیوی کی محبت سب کچھ دے دیتی ہے اور سب کچھ پانے کی دعویدار اور خواہشمند ہوتی ہے محبت کی اس لین دین کا سودا حساب کتاب ترازو کے پلوں کے اونچ نیچ سے بے نیاز ہوتا ہے۔ لیکن انتہائی لطیف و نازک انداز سے ایک دوسرے سے منسلک ہوتا ہے۔

شوہر کے ساتھ تمھاری ماں کی محبت میں سارے ہی رنگ یکجا ہو گئے تھے اور اس امتزاج سے ایک ایسا انوکھا رنگ پیدا ہو گیا تھا جس کی مثال مشکل ہے۔ اپنے ایک خط میں وہ لکھتی ہیں "آؤ تمھاری پیشانی پر ایسا پیار کر لوں جس میں ماں کی شفقت بہن کا فخر بیوی کا ایثار اور دوست کی ملائمت سب ہی کچھ شامل ہو۔ اب ان کی گفتگو کا محبوب ترین موضوع تھا اختر کا ذکر اور

زندگی کا عظیم ترین مقصد تھا اختر کی الجھی ہوئی شخصیت کو سلجھانا اور بکھری ہوئی زندگی کو سنوارنا۔ اس راہِ وفا میں جانے کتنی ٹھوکریں کھائیں۔ کتنی چوٹیں اٹھائیں پر رفاقت کے اس تقاضہ کو آخری سانس تک پورا کرتی رہیں۔

کون ہوگا ایسا جس کے دل پر حرف آشنا اور زیرِ لب پڑھ کر چوٹ نہ لگتی ہو جس کی آنکھیں پُرنم نہ ہو جاتی ہوں۔ جذبات واحساسات کی وہ شدت فکر وشعور کی وہ گہرائی جو ان خطوط میں ملتی ہے کون سا ایسا دل ودماغ ہوگا جو متاثر نہ ہو۔ ان کی تحریروں میں اگر جذبات کا بہاؤ ہے تو ساتھ ہی ساتھ فکر کا ٹھہراؤ بھی ہے۔ جیسے بیتاب محبت کا گلا گھٹ رہا ہو اور اس کار سخت کے لیے انھیں اپنے ہی ہاتھوں کی مدد کی ضرورت ہو۔

سنو ایک خط میں لکھتی ہیں "...... آج کل احساسات کچھ اس طرح کچلے ہوئے محسوس ہوتے ہیں کہ قلم اٹھانے کی بھی سکت پیدا نہیں ہوتی۔ بس وقت کے دھارے پر بے اختیار بہے جارہی ہوں۔ کوشش اور ارادے کے بغیر بعض وقت تو جنون سا پیدا ہونے لگتا ہے۔ پھر سوچتی ہوں کہ میں ماں ہوں دو بچوں کی۔ اور مجھے زعم ناقص ہے تمھاری زندگی میں بہتری کے اضافہ کا پھر کیا یہ تسلیاں کافی نہیں۔ لیکن سچ جانو ان سے مل کر بڑھ گئیں کچھ اور بھی بیتابیاں والا مضمون میرے حق میں درست ثابت ہوا ہے۔ تمھارے جانے کے بعد سے بھوپال کاٹنے کو دوڑتا ہے کب یہ تنہائی کا دور ختم ہوگا میرے اللہ"۔

چند دنوں کے بعد کے خط میں لکھتی ہیں "تمھارا خط ملا تھا۔ خط پاکر پوری شام مجھ پر عجب فاتحانہ انداز طاری تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کائنات مجھے حاصل ہے۔ دوسری صبح جو اٹھی تو اس کا ردِ عمل دیکھو کہ بات بات پر آنسو امنڈ آتے تھے قلم اٹھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ بھتیرا خود کو سمیٹنا چاہا پر قابو نہ حاصل ہوتا تھا۔ میری جان مجھے مضبوط رہنے دو اپنی خاطر۔ میں آہنی عزم اور استوار ارادہ چاہتی ہوں"۔

ایک طرف دل کی تڑپ دوسری طرف آہنی عزم کی خواہش۔ ان کے سامنے ہر لحہ عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب، والا مرحلہ رہا۔ اس کشمکش اور خلفشار کی شدت کو کون سمجھ سکتا ہے۔ دل محبوب سے قرب کے لیے بیتاب "آؤ اختر مجھے اپنے میں جذب کرلو۔ میری تشنگی دن بدن بڑھتی جارہی ہے اب میں تم سے زیادہ دن دور نہیں رہ سکتی"...... اور دماغ مصلحتوں کو نظر کے سامنے رکھنے پر کمر بستہ۔

ساتھ رہنے کی یہ خواہش تنہائی دور ہونے کا یہ مطالبہ کوئی ایسی انوکھی مانگ تو نہ تھی۔ کیا اس

مانگ کو ہر عورت اپنا جائز حق نہیں سمجھتی۔ انھیں تو صرف ایک چھوٹا سا گھر چاہیے تھا۔ جوان کو ان کے شوہر اور ان کے بچوں کو تحفظ دے سکے۔ انھیں تو صرف ایک چھت چاہیے تھی جس کے نیچے وہ اپنے کنبہ کو آرام و آسائش کی سہولتیں مہیا کر سکیں اور ان کے بچے اپنے باپ کے سایہ میں پنپ سکیں۔ جس کے سایہ تلے وہ اپنے شوہر کا سہارا لے کر اپنی ساری تکان دور کر سکیں ساری تلخیاں بھول جائیں۔ انھوں نے تو کبھی محلوں کے خواب نہیں دیکھے۔ اطلس و کمخواب کی تمنا نہیں کی۔ انھیں تو اپنی مزدوری پر ناز تھا۔ انھوں نے تو شادی سے پہلے اپنے ہونے والے شوہر کو بتا دیا تھا "تین سال سے مجھے مزدوری کی عادت ہے اور اس محنت سے مجھے اپنی قوت کا احساس ہوتا ہے میں اپنے کو اس محنت کے لیے آمادہ پاؤں گی جب تک میری خانگی زندگی کی مسرتیں اس کے سبب خطرے میں نہ پڑ جائیں"۔

کیا زندگی سے یہ مطالبہ اتنا انوکھا اتنا غیر واجب تھا کہ اس کی تسکین کے لیے وہ اپنی زندگی کی آخری سانس تک تڑپتی رہیں اور اپنی اس مانگ کی اونچی سے اونچی قیمت لگاتی رہیں۔ جیسے قسمت دور کھڑی طنز آمیز انداز سے مسکرا رہی ہو اور کہہ رہی ہو دیکھتے ہیں اس بازی میں تم کیا کچھ داؤں پر لگا سکتی ہو۔ آزماتے ہیں تمھاری سکت کو۔ وہ اپنی بھرپور قوت سے بولی کو اونچی سے اونچی تر کرتی گئیں۔ پر واہ ری قسمت۔ ان کا ہاتھ پھیلا کا پھیلا ہی رہ گیا۔ جیسے جیسے ان کی بولی اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ مانگ ان سے دور ہٹتی جا رہی تھی۔ آخر کار اس کھیل میں بازی ہار ہی گئیں۔

اپنی اس تمنا کو پورا کرنے کے لیے کیا ایثار نہیں کیا انھوں نے۔ علی گڑھ میں ان کا ایک معزز مرتبہ تھا۔ وہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے اسٹاف کی ایک مایہ ناز ممبر تھیں۔ ہم پسند حلقہ تھا۔ محبت و عقیدت رکھنے والے ساتھی تھے، قدردان ماحول تھا اپنایت تھی یگانگت تھی۔ سن چھیالیس آیا ہر طرف انتشار اور پریشانی پھیلی۔

تمھارے باپ کو گوالیار چھوڑنا پڑا اور تلاش روزگار میں بھوپال پہنچے۔ قربان جاؤ اس تغافل اور تساہل پر۔ ہر سانس کے ساتھ ان کی محبت کی مالا پڑھنے والی بیوی کو ان کی اس ہجرت کی خبر اپنے نندوئی کے ذریعہ ملی۔

علی گڑھ پھر بھی محفوظ جگہ تھی۔ شوہر کی کیسی کیسی خوشامدیں نہیں کی ہیں کہ وہ علی گڑھ آجائیں۔ مصلحت کا تقاضہ بھی یہی تھا۔ لیکن تمھارے باپ کی بیوی کے لیے ساری محبت اس نکتہ پر بک گئی صفیہ ساری مصلحتوں پر ٹھوکر مار کر اپنی جمی جمائی ملازمت سے ہاتھ دھو کر ان

کے پاس پہنچ جائے۔ حالات کی ابتری بچوں کی ذمہ داری شوہر کی بے روزگاری۔ مستقبل کا غیر یقینی پن۔ سوچو دل و دماغ پر کیا گزر رہی ہوگی اور کس کشمکش کا سامنا کرنا پڑ رہا ہوگا۔ تمھاری ماں سے عقل کہہ رہی تھی" دراصل میرا عقیدہ ہے کہ تمھارے قدم اکھڑ جانے کے بعد مجھے آخری دم تک محنت کرنا اور کچھ حاصل کرتے رہنا چاہیے۔ ورنہ یہ کشتی کیوں کر پار ہوگی""" (حرف آشنا) نازک مزاج شوہر کو مشورہ دینا بھی بڑی ہمت و جرأت کا کام تھا۔ پر وقت کا تقاضہ مجبور کر رہا تھا۔ "سنو تم علی گڑھ سے بہتر جگہ بھوپال کو نہ پاؤ گے۔ علی گڑھ سے بہتر اور زیادہ آسانیاں تمہیں بھوپال میں نہ ملیں گی۔ تم مجھ پر اعتماد تو کرتے ہو؟ میری طرف دیکھو تم ایسا خیال کر رہے ہو کہ میں اپنی ذاتی راحتوں اور آسایشوں کی خاطر علی گڑھ میں رک رہی ہوں۔ اختر میری جان تمھارے بغیر زندگی میں مجھے کوئی راحت نصیب نہیں ہو سکتی۔ میں تم سے کبھی اتنی ضد نہ کرتی اگر میری نیت میں خفیف سا بغض ہوتا۔ مجھے اپنی نیت کی صداقت پر یقین ہے اس لیے تم سے نڈر ہونے کی جرأت بھی پیدا ہو گئی" (حرف آشنا)

بیوی کی صداقت و مصلحت پر مبنی خواہش بھلا شوہر کے اس "جذبۂ ملکیت اور ذوقِ تحکّم کے سامنے جس کی طرف خود صفیہ آپا نے اپنے مضمون "گھر کے بھیدی" میں اشارہ کیا ہے کیا حیثیت رکھتی تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ اس عقل کو تو ہار ماننی ہی تھی۔ جس کی رہبری قبول کرنے میں بیوی نے جانے کتنی راتوں کی نیندیں حرام کی تھیں اپنے دل کا خون کیا تھا۔

۴۷ کا قیامت خیز زمانہ بیمار بچے کا ساتھ۔ تم تو لکھنؤ میں میرے پاس تھے۔ سفر کے خطرات مستقبل کے اندیشے لیکن تمھاری ماں نے بہت پہلے سے طے کر رکھا تھا "تم فیصلہ کرو میں عمل کروں اسی میں مجھے اطمینان نصیب ہوتا ہے" جذبات کی عظمت بھی انھیں تسلیم تھی لیکن ان غریب کو تو اپنے دل کو کچلنے کی عادت پڑ چکی تھی۔ پر اختر کی پیشانی کے بل ان کے قابو سے باہر تھے۔ ویسے تو ہر ہندوستانی عورت کے لیے شوہر کی انا کا مسئلہ ہوتا ہے، پھر تمھارے باپ کی انا۔ بھائی اختر کی شخصیت اس پہلو کا تجزیہ انھوں نے کس پیار بھرے انداز میں کیا ہے سنو۔ "ان سے وابستگی کا صرف یہی مطلب ہے کہ صرف ان کے لیے زندہ رہا جائے۔ گھر یا گھر کی دنیا اختر کی زندگی کو محور بنا کر اس پر رقص کرتی ہے۔ اگر ایک ذرہ بھی محور سے علیحدہ ہونے پر باغی نظر آتا ہے تو اس دنیا کی تنظیم کا شیرازہ برہم ہونا یقینی۔ اور کچھ دور نہیں قیامت کا نقشہ اہل دنیا کی عبرت کے لیے قیامت سے قبل ہی اس دنیا میں مرتب ہو جائے۔ اس مہلک اندیشہ کو دیر لگ رہی ہے اور لگتی رہے گی کیوں کہ محور اپنی ذاتی کشش سے مختلف ذروں کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور میری دلی آرزو یہی ہے کہ میرے جیتے جی محور کی

یہ کشش کمزور نہ ہونے پائے"۔ (گھر کا بھیدی)

غرض یہ کہ تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر صفیہ آپا نے وہ قدم اٹھایا جو اندیشوں اور خطروں سے بھرپور تھا۔ اور وہ بھوپال پہنچ ہی گئیں۔ چلو اچھا ہی ہوا۔ یہی دو ڈھائی سال اس خواب کی تعبیر کے تھے جس کے انتظار میں پچھلے سالوں کا ایک ایک لمحہ کس بے چینی اور بیتابی سے وہ گزار رہی تھیں۔ اب انھیں اپنے اس شوہر کا ساتھ ملا جس کے قدموں کی دھول ان کے ماتھے کا ٹیکہ تھی۔ لیکن واہ ری قسمت وہ اپنی شکست کیسے برداشت کرتی۔ سیاسی صورتِ حال نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ شوہر کو بھوپال بھی چھوڑنا پڑا۔ اب پھر وہ اکیلی تھیں تنہا اور بے آسرا۔ صحت کی طرف سے کھوکھلی لیکن عزم واستقلال کا دامن پکڑے ہوئے "عزم واستقلال Value of the week کیوں نہ کہلاتے ہوں میرا مسلک رہے ہیں۔ میں خود تمھیں زندگی کی اس جدوجہد میں ایک قدم پیچھے ہٹتے دیکھنا نہیں چاہتی۔ میں تمھارے ارادوں کو کمزور نہ کروں گی چاہے کچھ بھی گزر جائے ہم پر" (زیرلب)

ایک جگہ لکھتی ہیں "دوست اپنے گردوپیش پر نظر کرو۔ بمبئی میں بڑی آسانی سے تم کو ہزاروں مثالیں۔ خود سے زیادہ نا آسودہ خود سے زیادہ شکست خوردہ شخصیتوں کی مل جائیں گی میں تو شکر کرتی ہوں۔ ہم تو پھر بھی بہتوں سے بہتر حالت میں ہیں۔ تم خدانخواستہ کسی کے محتاج نہیں۔ تمھارے بچے آرام سے ہیں۔ اچھی طرح پل رہے ہیں۔ تم کو میری پوری زندگی پوری ہستی ملی ہے۔ مجھے تمھاری محبت تمھاری سرپرستی تمھارا اعتماد سب کچھ حاصل ہے۔ پھر ہم اپنے کو ہارے ہوئے انسانوں میں کیوں سمجھیں۔ خود فریبی نہیں حقیقت ہے آج نہیں تو کل ایک روشن سویرا ضرور چمک اُٹھے گا۔ یہ دو معصوم محبت بھرے نرم ونازک دل جو تمھیں اور مجھے برابر اعتماد سے اپنا سمجھتے ہیں ان کی محبت کا صلہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہم ان کے لیے ایک روشن دنیا پیدا کریں۔

جادو تمھاری ماں کو یقین تھا آج نہیں تو کل ایک روشن سویرا ضرور چمک اٹھے گا اور کون نہیں جانتا کہ ان کے جگر کے ٹکڑوں کی زندگی میں یہ روشن سویرا آیا اور بہت ہی آب وتاب سے آیا۔ لیکن اگر تم یہ سوچو کہ تمھاری خوشحالی تمھاری ترقی سے ان کی آرزو پوری ہو گئی ان کے خوابوں کی تعبیر مل گئی تو ان کے ساتھ ناانصافی ہو گی شدید زیادتی ہو گی وہ تو اس روشن دنیا اور اس روشن مستقبل کا خواب دیکھ رہی تھیں جس میں خوشی اور آسودگی سے گھر گھر جگمگا رہا ہو جس میں بھوک نہ ہو بے روزگاری نہ ہو۔ کہاں ہے وہ روشن دنیا وہ روشن مستقبل؟

اس کو قریب لانے میں تمھاری کاوشیں ہی اِس تڑپ اور اس محبت کا صلہ ہو سکتی ہیں جو انھیں تمھارے ساتھ تھی۔ ویسے تو ہر ماں صلہ سے بے نیاز ہوتی ہے پھر تمھاری جیسی ماں۔ جانے میں زندگی سے یہ شکایت بھی کر سکتی ہوں یا نہیں کہ اس نے کچھ انتظار کیوں نہ کیا موت کے سامنے اتنی جلدی پسپا کیوں ہو گئی۔ تم تھے ان کی زندگی خدا تمھاری عمر دراز کرے۔ اور تم دونوں کو دن دونی ترقی دے۔

جادو یہ نہ بھولنا کہ یہ خط اس وقت لکھے گئے تھے جب پھر سے تنہائی کا سامنا تھا۔ ملازمت کی ذمہ داری، بے روزگار شوہر کی ذمہ داری، صحت بھی دھیرے دھیرے ساتھ چھوڑ رہی تھی ان حالات میں تیسری چوتھی اولاد کی گنجائش کہاں تھی۔ اپنے دل پر جبر کر کے اس نوعیت کے مسائل کے حل کی خاطر دواؤں پر دوائیں کھاتی رہی۔ حالات موافق ہوتے تو ایک دو کا ذکر کیا اپنی جان سے زیادہ عزیز اختر کی خوشی اور خواہش کی خاطر درجنوں اولادوں کا بوجھ اٹھالیتی۔ دونوں کو ہی بیٹی کی آرزو تھی اس کا نام کاکل طے پا چکا تھا۔ غرضیکہ پے در پے ابورشنس سے وہ جسم جو پہلے ہی سے تھکا ہوا تھا اور بھی تھک گیا۔ پھر بھی اپنی ہمت کو سمیٹتی رہی۔ شوہر کی ہمت بڑھاتی رہیں کہتی رہیں اختر زندگی ایک بار ملتی ہے۔ آؤ جو کچھ نچوڑ سکتے ہیں نچوڑ لیں اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے۔

ان غریب کو کیا خبر تھی کہ مل کر، ساتھ رہ کر زندہ رہنے کا موقعہ کبھی ان کے ہاتھ نہ لگے گا۔ زندگی سے نچوڑنے کی بات تو دور رہی زندگی انھیں نچوڑ رہی تھی۔

کسی طرح جیسے تیسے زندگی گزرتی رہی۔ کبھی تم ان کے پاس کبھی ان سے دور۔ کیا گزرتی ہوگی ان کے دل پر تم کو اپنے سے دور کر کے ان کا دل ہی جانتا ہوگا۔ لیکن حالات کی مجبوری۔ خود بھی لکھنؤ آتی جاتی رہیں۔ علاج معالجہ ہوتا رہا پر مرض کسی صورت قابو میں نہ آیا بڑھتا ہی گیا۔ زندگی کی گاڑی کو تو کسی نہ کسی طرح کھینچنا ہی تھا۔ ان کی ہمت اور حوصلہ کی داد دو۔ اسپتال میں پڑی ہیں۔ ڈاکٹر حکیم مرض کی تشخیص سے معذور ہیں۔ طرح طرح کے تجربہ ہو رہے ہیں۔ تکلیفوں میں روز افزوں اضافہ ہے بستر سے لگ گئیں ہیں لیکن ہمت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں۔ "یہاں کا (یعنی میڈیکل کالج کا) نسخہ لے کر ڈاکٹر عبدالحمید کے پاس جانا ہے اور علاج تو انھیں سے تجویز کرانا ہے۔ اس کے بعد میری تجویز ہے کہ بھوپال روانہ ہو جاؤں گی۔ اپنے موجودہ حالات میں تغافل کی ادنیٰ سی گنجائش نہیں۔ علاج وہاں بھی جاری رکھوں گی البتہ جوائن کرنا ضروری ہے۔ وقت برا ہے یہ روٹی کا ٹھکانہ نہیں چھوڑنا ہے ورنہ ہم

دونوں کی فکریں بڑھ جائیں گی۔" ان کی صحت تیزی سے گر رہی تھی۔ بیماری کی سنجیدگی کا پوری طرح اندازہ تھا۔ اب تک تو ان کے لیے خارجی حالات ہی کے شکنجے تھے اس بیماری نے تو انکی کھال کی طنابیں کھینچ کر رکھ دی تھیں۔ اعصاب پر جو تناؤ تھا وہ تو تھا ہی کیسی تکلیف رہی ہوگی۔ کتنی معذوری رہی ہوگی۔ لیکن عزم و ارادہ میں وہی مضبوطی تھی جدوجہد پر بھروسہ تھا۔ شوہر کو یہی لکھتی رہیں "جب تک میری آخری سانس باقی ہے میری کوشش تمھارے سکون کے لیے ہوگی مجھ پر میرے پیار پر بھروسہ رکھو۔"

جادو تم سوچ رہے ہوں گے کہ ایک تو دور وہ تھا جب ان کی ہر ادا پر میری نگاہ رہتی تھی ان کی ہر جنبش پر میرے کان ہوتے تھے وہ میری آئیڈیل تھیں میری ہیرو تھیں۔ ایسا کیا ہو گیا کہ تمھارے باپ سے وابستگی کے بعد اپنی بہن کی زندگی کی کہانی سنانے کے لیے مجھے قدم قدم پر ان خطوں کا سہارا لینا پڑ رہا ہے جن پر میری نگاہ پڑے گی ان کے خواب وخیال میں بھی نہ رہا ہوگا۔ جادو تمھاری اس سوچ کو نہ تو میں غلط ہی کہہ سکتی ہوں نہ صحیح۔ ایسا نہ تھا کہ جن آزمائشوں سے وہ گزر رہی ہیں جن کٹھنائیوں کا وہ سامنا کر رہی تھیں اس کا ہمیں احساس نہ رہا ہو اندازہ نہ ہو۔

تم تو جانتے ہو۔ میرے حالات کے بھی کچھ ایسے تقاضے تھے کہ شادی کے بعد پانچ سال تک ہم میاں بیوی مل کر ایک گھر نہیں بنا پائے۔ سالم علی گڑھ میں اور میں لکھنؤ میں۔ تمھاری ماں کے یہ جملے آج بھی میرے کانوں میں گونج جاتے ہیں۔ حمیدہ تم پچھتاؤ گی گیا وقت واپس نہیں آتا تم نہیں جانتیں کہ تم کیا کھو رہی ہو تمہارے حالات تو نارمل ہیں تم سالم کے ساتھ رہو اگر تمھارا یہ خیال ہے کہ ان کے ان جملوں میں، میں ان کی سسکتی ہوئی آرزوؤں اور تڑپتی ہوئی حسرتوں کو محسوس نہیں کرتی تھی تو تم اپنی سوچ میں غلط ہو۔

منی اکتوبر میں پیدا ہوئی اور میری بہن تین مہینہ بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ ہاتھ ٹیڑھے ہو چکے تھے۔ چھوٹے بچے کو سنبھالنے کے لیے مدد کی ضرورت تھی۔ لیکن اپنی تمام سکت اکٹھا کر کے تھوڑی ہی دیر کے لیے سہی اُسے اپنی گود میں لینے کی کوشش کرتی تھیں ان کی نگاہیں یہ کہتی تھیں کاش وہ اس قابل ہوتیں کہ اختر کی کاکل ان کی گود میں ہمک سکتی۔ وہ جانتی تھیں کہ اس کی آس بھی ممکن نہیں ہے۔ سو انھوں نے منی کا نام کاکل تجویز کیا۔ بد نصیبی کہ ان کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہو سکی۔ ہماری ماں کو لفظ کاکل کڑاکل سے ملتا محسوس ہوا اور ردولی کی زبان بھی کڑاکل بد مزاج لڑاکو شخصیت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ سو ان کی

یہ چھوٹی سی خواہش بھی پوری نہ ہو سکی۔ اور منی کا نام انکے اور اسرار بھائی کے مشورہ سے سنبل رکھ دیا گیا۔ جادو جانتے ہو سنبل کی بہت سی باتیں مجھے صفیہ آپا کی یاد دلاتی ہیں۔

تمھاری سوچ ایک لحاظ سے صحیح بھی ہے۔ بہت کچھ جانتے اور محسوس کرتے ہوئے بھی ہم نے یہ پوز اختیار کر رکھا تھا گویا ہم کچھ نہیں جانتے۔ اگر کبھی بھی غیر ارادی طور پر ان کی زندگی کی کٹھنائیوں کی طرف اشارہ ہو گیا تو انھیں دکھ پہنچا۔ اگر ازراہ مذاق بھی تمھارے باپ کی معشوقانہ اداؤں پر رائے زنی کر دی تو ان کی خفگی کا خطرہ مول لیا۔ ان حالات میں ہمارے بس میں صرف یہی تھا کہ ان کی پردہ داری کا پاس رکھیں۔ میری شادی پر اپنے کنبہ کی جانے کن ضرورتوں کا گلا گھوٹ کر فیروزہ کی جڑاؤ کی مچھلیاں بنوا کر لائیں مجھے بہت پسند آئیں دل کھول کر تعریف کی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ کہہ دیا کہ اپنے ان حالات میں اتنے قیمتی تحفہ کی ضرورت نہ تھی۔ ناراض ہو گئیں۔ ان کی حمیّت اور غیرت کو یہ کب گوارا تھا کہ کوئی ان سے ہمدردی کرے۔ زندگی نے ان کے ساتھ جو ناانصافی اور ناقدری کی اس کی طرف اشارہ کرنے سے انگلی براہ راست نہ سہی بالواسطہ ان کے شوہر کی طرف اٹھتی تھی۔ یہ ان کی برداشت سے باہر تھا۔ اختر کو پا کر تو انھوں نے سب کچھ پالیا تھا۔ پھر کیسی تشنگی کیسی محرومی۔ جادو ہم سب کو بھی اپنے سے لڑائی کرنی پڑی ہے۔ ہمارا دل خون کے آنسو روتا تھا لیکن ہم اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ مزید صدمہ پہنچاتے اور حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ سچ ہے سب کو اپنی صلیب خود ہی اٹھانی ہوتی ہے۔

اپنے دکھوں کو یوں جھیلنا کہ کسی پر اظہار نہ ہو۔ دکھی ماں باپ کے دکھوں میں اضافہ نہ ہو، نازک مزاج شوہر کی طبیعت بدمزہ نہ ہو معصوم بچوں پر آنچ نہ آئے۔ دل گردہ چاہیے تھا، آخر ایسے کون سے آہنی اعصاب ہوتے جن پر اثر نہ پڑتا۔ دھیرے دھیرے صحت گرتی ہی چلی گئی۔ بیماری بھی ہوئی تو ایسی جو کروڑوں میں سے کسی ایک کو ہوتی ہے اور جو اب تک لاعلاج ہے۔

گرمی کی چھٹیاں آئیں۔ علاج کی خاطر شوہر سے لکھنؤ جانے کی اجازت مل گئی۔ لکھنؤ میں اپنا گھر تھا۔ ماں باپ ضعیف سہی پر کلیجہ سے لگانے کو ہر دم تیار تھے۔ دیکھ بھال کے لیے ہم سب تھے نوکر چاکر تھے۔ مصلحت کا تقاضہ یہی تھا ساری تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ از حد چاہنے والے شوہر کا تار پہنچتا ہے۔ لکھنؤ نہیں بمبئی آجاؤ۔ رہنے کا ٹھکانہ نہیں آمدنی کا سہارا غیر یقینی لیکن تقاضہ یہی کہ بمبئی آجاؤ۔ سوچو مجبوری سی مجبوری رہی ہوگی کہ شوہر کے حکم کی تعمیل نہ

ہو سکی۔ اختر کی خاطر تم بچوں کی خاطر بیماری سے تو لڑنا ہی تھا۔ یہ لڑائی بھی تو پوری یکسوئی سے ممکن نہ تھی۔ نافرمانی پر شوہر کے غم و غصہ کی فکر موڈ کی برہمی کا خوف آپسی اعتماد کی ان بنیادوں کے لرز جانے کا اندیشہ جن کی مضبوطی کے لیے خون پسینہ ایک کر رہی تھیں۔ خط پر خط جارہے ہیں ان کے جواب کے انتظار کی وہی بے چینی۔ لکھتی ہیں۔ "اختر تم جانتے ہو میں کن مجبوریوں کے تحت لکھنؤ آئی ہوں۔ دونوں بچوں کو اس بیماری کی حالت میں تنہا لے کر بمبئی آنا کیسے ممکن ہوتا۔ میری حالت ایسی نہیں کہ ان بچوں کو لکھنؤ چھوڑ کر دوبارہ بمبئی کے لیے روانہ ہو سکتی۔ تم مجھ پر غصہ کر سکتے ہو۔ برہم ہو سکتے ہو مگر ایسی بے تعلقی برداشت سے باہر ہے۔...... تمھاری اس خاموشی کا نتیجہ کیا ہے مجھے نیند نہیں آتی دل اس طرح دھڑکتا ہے جیسے چوری کی ہو جھوٹ بولا ہو۔ تم مجھ سے خفا ہو گئے اس بات پر کہ بچوں کو لکھنؤ چھوڑ کر تمھارے پاس کیوں نہ پہنچی۔...... مجھے بے سہارا نہ کرو ساتھی۔ اختر تمھاری محبت مجھ میں شگفتی پیدا کر سکتی ہے اور زندہ رہنے کی آرزو بھی"۔

ہفتہ عشرہ بعد جواب آتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ طبیعت کچھ خراب تھی اس لیے موڈ نہیں بنا چلیے بات ختم ہوئی۔ بیوی کے دل پر جو گزری سو گزری اس کی کیا اہمیت۔ چھٹی کب تک لیتی رہتیں۔ ملازمت کے سہارے کو کیوں کر چھوڑتیں اور کس برتے پر چھوڑتیں۔ ایک بھائی شاعری میں مبتلا اور دل شکستہ دوسرے بھائی سیاست کے میدان میں سرگرداں باپ ضعیف اور ریٹائرڈ۔ ساتھ ہی ساتھ غیرت کا یہ عالم کہ مجھ سے قرض بھی لیا تو اس کی ادائیگی میں جتنی بھی عجلت ممکن تھی کی۔ اکثر ادائیگی کے ساتھ یہ جملہ ہوتا تھا کہ اختر نے پیسہ بھیجے تھے اس لیے تمھارے پیسہ واپس کر رہی ہوں۔ نہ زیر لب کے خطوط چھپتے نہ یہ خبر ہوتی کہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر منی آرڈر بمبئی جاتا تھا۔ ہفتوں ایسے گزرتے تھے کہ گوشت ترکاری کے لیے پیسہ نہیں ہوتے تھے۔ ایک روپیہ دو روپیہ سیر اصلی گھی سے دال کو بگھار کر اویس کو بہلا لیا جاتا تھا۔ معصوم بچہ تو نہیں سمجھ سکتا تھا کہ کیا بات بتانی چاہیے اور کیا نہیں۔ اگر اتفاقاً کبھی کبھار بمبئی سے منی آرڈر آجاتا تو اس فکر میں اپنی نیند حرام کرتیں کہ جانے اختر نے اپنی کن ضروریات کی قربانی کی ہو۔ غرض یہ کہ علاج معالجہ کے بعد دواؤں کے پلندوں کے سمیت پھر بھوپال واپس ہوئیں۔ تکلیفیں بدستور اپنی جگہ تھیں پر ہمت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا تھا۔ ملازمت کا سلسلہ ہر قیمت پر جاری رکھنا تھا۔

زندگی لشتم پشتم چلتی رہی۔ ۳۰/اپریل ۱۹۵۲ء کو اس آس پر پھر بھوپال سے لکھنؤ روانہ ہوئیں کہ شاید کھوئی ہوئی صحت واپس مل جائے اور وہ اختر کی زندگی میں سکون اور خوشیوں کا باعث

بن سکیں۔ ان غریب کو کیا خبر تھی کہ وہ ابدی سکون کی طرف کھینچ رہی ہیں اور بھوپال کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ رہی ہیں۔ لکھنؤ پہنچیں ڈاکٹر حکیم ہومیو پیتھی سب کچھ آزمایا گیا۔ لیکن مرض تھا کہ بڑھتا ہی گیا۔ بوڑھے باپ کو خبر ملی کہ کلکتہ میں کوئی اچھے ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہیں اس امید پر کہ شاید وہ ان کی لاڈلی بیٹی کو اس اذیت ناک بیماری سے نجات دلا سکیں۔ وہ غریب اس انتظامات میں لگ گئے کہ کس طرح بیٹی کو کلکتہ جیسی اجنبی جگہ لے جایا جا سکے انھیں کیا خبر تھی کہ موت تیزی سے ان کی بیٹی کی طرف ہاتھ بڑھا رہی ہے۔ کتنا فخر تھا کتنا ناز تھا ہمارے باپ کو اپنی اس بیٹی پر۔

جادو تمھیں تو یاد ہوگا اپنے آخری دنوں میں تمھاری ماں نے جیسی تکلیف اٹھائی ہے بس خدا دشمن کو بھی محفوظ رکھے پورے جسم کی کھال خشک ہوتی جا رہی تھی سکڑتی جا رہی تھی جیسے ہڈیاں بالکل جکڑ کر رہ گئیں ہوں۔ ایک کوہنی کی ہڈی تو بغاوت پر آمادہ ہو گئی اور کھال کو چیر کر باہر نکل آئی تھی۔ سوچو کیسی تکلیف رہی ہو گی اس کیفیت میں۔ جس محبوب کے لیے دل کی ہر دھڑکن وقف تھی اس کو خط لکھنے سے معذور ہو گئیں۔ "آخر یہ خاموشی کیوں تمھارا یہ تغافل کل کا مرتا مجھے آج ہی مار ڈالے گا۔ تم میری حالت آکر تو دیکھو۔ میرے خط جلدی جلدی نہیں ملتے تو روٹھ جاتے ہو۔ میری جان میرا جسم اکڑ کر رہ گیا ہے۔ انگلیوں کا یہ حال ہے کہ قلم تک نہیں پکڑا جاتا۔ نہ جانے کیسے ہمت کر کے چند سطریں لکھ لیتی ہوں۔ اختراب حمیدہ سے خط لکھوایا کروں گی تم اس تجویز سے ناراض نہ ہونا پھر بھی کوشش کروں گی۔ میرا بخار کسی صورت سے کم نہیں ہوتا حکیم کا علاج سرے سے الٹا پڑ گیا۔" میرے بس میں تو نہ تھا کہ ان کی کیفیت ان کی حالت کا اظہار اس سے زیادہ پر تاثر طریقہ پر کر سکتی۔ پرواہ رہی صفیہ کے اختر کی معصومیت ان کے ریکارڈ کی سوئی تو ایک جگہ اٹک گئی تھی، "بمبئی آجاؤ" کیسے اور کیوں کر اس سے مطلب نہیں۔

خط کا آخری جملہ تھا ’آؤ پیار لو تم میرا ساتھ نہ چھوڑنا ساتھی جس نوعیت کا ساتھ ان حالات میں انھیں ملنا چاہیے تھا وہ انھیں ملا ہی کب تھا جو چھوٹنے کا سوال اٹھتا۔ ساتھی تو بیوی کی آخری سانس تک اس دھوکے میں رہے کہ ناز اُٹھوانے اور پھر روٹھ کر من جانے میں صفیہ کو جو لذت ملتی ہے وہ کافی ہے صفیہ کے لیے ان تمام آزمائشوں اور پریشانیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جس کا اسے سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ نازک اور حساس دل والے اختر کو اس کا احساس تک نہ ہوا کہ صفیہ کچھ ایسی ہی ٹوٹ گئی ہے کہ اپنا حال کھل کر لکھ رہی ہے۔ اس نے تو ہمیشہ ہی اپنے دکھ اپنی تکلیفیں اپنے ہی تک رکھیں۔ ان کی ہوا تک اختر کے پاس پہنچنے نہ دی۔ اس کے

اختر کی پریشانیوں میں اس کی طرف سے اضافہ ہو۔ اس کا تصور اس کے لیے کتنا اذیت ناک تھا تم کیا سمجھ سکو گے۔ پر یہ کیا ہو رہا تھا یہ بندھن کیوں ٹوٹ رہے تھے۔ یقیناً اسے یہ امید تھی کہ اختر اس کی بدحالی کی خبر پا کر ہر حالت میں کسی بھی قیمت پر اس کے پاس آ پہنچیں گے۔ اور دیدار کی تمنا پوری ہو جائے گی۔ لیکن انتظار اور مایوسی تو اس کا مقدر تھا۔ اس سے کیسے پیچھا چھٹتا۔ ۲۲ر دسمبر کو ان کی انگلیوں کی مدد سے جو مڑنے سے بھی انکاری تھیں یہ ٹیڑھی ترچھی آخری تحریر جاتی ہے۔ "ایک بار تو مجھے اپنی صورت دکھلا جاؤ۔ جنوری میں ضرور ہی آ جاؤ اس سے زیادہ انتظار کی مجھ میں سکت نہیں۔" کتنا صحیح تھا اندازہ انھیں اپنی حالت کا۔ جنوری کا مہینہ ان کے لیے انتظار کی بے چینی سے نجات کا پیام لے کر آیا۔

جادو اس سے انکار ممکن نہیں تمھارے باپ نے تمھاری ماں کی آخری خواہش کا پاس رکھا۔ وہ جنوری ہی میں لکھنؤ پہنچے۔ سنتے ہیں کہ ان غریب کو ٹرین کے ٹکٹ کے لیے کسی فلم ایکٹریس سے قرض لینا پڑا۔ حیرت بھی ہے اور افسوس بھی کہ اس تگ و دو کے لیے ڈاکخانہ کا یہ بے جان جملہ کارگر ثابت ہوا۔ Come soon condition serious ان کی صفو کے درد میں ڈوبے ہوئے الفاظ بے اثر تھے۔ مجھ کمبخت کو اگر بمبئی کے فلمی دنیا کے باسیوں کی سمجھ بوجھ کی اس سطح کا اندازہ ہوتا تو اپنے ان خطوں میں جو میں اس اندیشہ کے ماتحت کہ بیوی موت کے کنارے پہنچ رہی ہے اور میکے والے شوہر کو بے خبر رکھے ہیں صفیہ آپا کی بدحالی کھل کر مکمل طور پر لکھا کرتی تھی۔ اس جملہ کا اضافہ بھی کر دیتی "اس خط کو تار سمجھیو۔"

جادو مرنے سے چند دن پہلے انھوں نے مجھ سے کہا۔ جادو تو تمھارا ہے ہی۔ اولیس اتنا سیدھا ہے اسے کوئی بھی سنبھال لے گا۔ اختر کا کیا بنے گا۔ کون سی ایسی پتھر دل ماں ہو گی جس کو جو دو کمسن معصوم بچوں کو اس دنیا میں تنہا چھوڑنے کا غم نہ ہو فکر نہ ہو۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ تم میرے ہو۔ وہ تمھیں میرے پاس بھیجنے کے بعد راتوں کو آنسوؤں سے تکیہ تر کرتی تھیں تم سے یہ عاشقی بقول ان کے اپنے سلسلہ دراز عشق کی ایک کڑی تھی۔ اختر کے لیے ان کی ممتا کی تھاہ کو پہنچنا ممکن نہیں ان کے آخری خط کی چند سطریں سنو۔ دل پر کیسی چوٹ لگتی ہے۔ "اختر آؤ مجھے مرنے نہ دو میں مرنا نہیں چاہتی۔ البتہ تھک بہت گئی ہوں۔ ساتھی آؤ تمھارے زانو پر سر رکھ کر ایک طویل نیند لے لوں پھر تمھارا ساتھ دینے کے لیے ضرور ہی کھڑی ہو جاؤں گی۔" آخری وقت بھی وہ زانو نصیب میں نہ تھا جس کے بوتے ساتھ دینے کی سکت کی آس لگا رہی تھیں۔ البتہ تھکان دور کرنے کے لیے ایک طویل اور بے مدت نیند ضرور مل گئی۔ ایسی نیند جس سے کوئی بھی نہیں اٹھا ہے۔ اٹھارہ جنوری ۱۹۵۳ء وہ آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند

ہو گئیں جو ہر لمحہ اختر کی راہ پر لگی ہوئی تھیں۔ آخری وقت ان کا سر مجھ بد نصیب کی گود میں تھا۔ میں ان نگاہوں کو کیسے بھول سکتی ہوں جو بار بار دروازہ کی طرف اس امید پر جا رہی تھیں کہ شاید ان کا اختر آ ہی جائے اور ان کی زندگی کی شدید ترین آرزو کی تسکین ہو جائے۔ آخری دم تک میری اس بہن نے عزم، حوصلہ اور استقلال سے زندگی کی تمام تلخیوں اور آزمائشوں کا مقابلہ کیا لیکن موت سے کون بچتا ہے۔ آخر کو بے چین روح کو قرار آ ہی گیا۔

جادو کون نہیں جانتا کہ تمھاری ماں کی زندگی کا اول ترین مقصد تھا تمھارے باپ کی شخصیت کو سلجھانا سنوارنا۔ اِس حصول مقصد کے لیے ان کی موت ہی مجرب ترین نسخہ ثابت ہوئی۔ اگر ان کو یہ معلوم ہوتا تو شاید وہ بخوشی موت کو بہت پہلے بلاوہ دے چکی ہوتیں۔ ان کی تو زندگی شوہر کے مزاج کی ان پیچیدگیوں کی پتھریلی دیوار سے سر ٹکراتی گزری جو ان کے ماضی کی پیداوار تھی جانے بچپن میں بے جا لاڈ و پیار کا نتیجہ یا جوانی میں عشق و عاشقی کے کھیل میں تلخیوں کا۔ میری بہن بے چاری نہ ہی اپنی زندگی میں اس دیوار کو توڑ پائی نہ پھلانگ سکی۔ البتہ کچھ شگاف کچھ دراڑیں ڈالنے میں ضرور کامیاب ہوئی۔ ورنہ ایک سال کے اندر اندر تمھارے باپ میں وہ انقلابی تبدیلی نہ ہوتی جو ہوئی۔ میری بات پر یقین نہ ہو تو "خاموش آواز" کے اوراق پلٹو۔ اور مجھے بتاؤ کیا یہ وہی جان نثار اختر ہیں جو صفیہ جیسی محبت کرنے والی بیوی کو ہفتوں ہفتوں اپنی چند سطروں کے لیے ترساتے تھے وہ بھی جب وہ بستر مرگ پر اسپتال میں تھی۔ اب وہ اپنی چہیتی دوست کو ہر دن خط لکھتے ہیں وہ بھی طویل سے طویل تر۔ کیا یہ وہی اختر ہیں جو محبت و خیال کے بارے میں ضبط کے اس حد تک قائل تھے جو بچوں سے لگاؤ کے اظہار تک سے گریز کرتے تھے۔ اب ان دوست کو کن کن پیار بھرے القابوں سے مخاطب کرتے ہیں۔ میری خوب صورت دوست میری جان۔ جان سے زیادہ عزیز۔ میری رادھا۔ کاش اس نوعیت کے پیار کی ایک ہلکی سی جھلک میری بہن کے حصہ میں آ گئی ہوتی ان کی تو دنیا ہی جگمگا اٹھتی۔ شاید ان کو تازہ زندگی مل جاتی اور وہ موت سے بھی نبرد آزما ہو جاتیں۔ کیا یہ وہی کھوئے کھوئے سے اختر ہیں اپنے سے بے خبر - بال بچوں سے بے خبر - اب تو وہ اپنی اس عزیز از جان دوست کی ازدواجی زندگی کی الجھنوں کو سلجھانے کے لیے مقدمہ لڑنے کا منصوبہ تیار کرتے ہیں۔ وکیلوں کا انتظام کرتے ہیں۔ زیورات کو بینک میں گروی رکھوا کر اس مسئلہ کے اخراجات کا انتظام کرتے ہیں۔ اور قرض کی ادائیگی اور زیورات کی واپسی کے لیے دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ بھوپال میں زمین خریدنے اور گھر بنوانے کے منصوبہ بناتے ہیں اور تو اور سناروں اور درزیوں کی دکانوں کے چکر لگاتے ہیں۔ حسین دوست کی نازک کلائیوں کے لیے چوڑیاں

بنوائی جاتی ہیں۔ کان کی بالیوں کے ڈیزائن کے انتخاب میں سر کھپایا جاتا ہے۔ ساڑیاں خریدی جاتی ہیں بلاؤز سلوائے جاتے ہیں۔ سچ بتاؤ کیا یہ وہی اختر ہیں جنھیں اپنے کھانے پینے کا ہوش نہ تھا۔ اب تو وہ اپنے خطوں میں شاہد[1] تو الگ رہا۔ سعیدہ اور عذرا[2] کو بھی پیار بھیجنا نہیں بھولتے۔ بی آپا اور ابا جی کو سلام تو تہذیب کا تقاضہ کہا جاسکتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ صفیہ کی زندگی میں تہذیب کی یہ رگ سوتی رہی۔ سنو تم یہ تو نہیں سوچ رہے ہو کہ میں رقابت محسوس کر رہی ہوں اتنی چھوٹی بات تم میرے لیے نہ سوچنا میں صفیہ کی بہن ہوں گو کہ ان جیسی عظیم نہیں۔ میں یہ نہیں بھول سکتی کہ تمھارے خط کے جواب کے لیے تمھاری ماں کو ان کی خوشامدیں کرنی پڑتی تھیں۔ اویس غریب جو تمھارے مقابلہ میں بہت جذباتی اور نرم تھا کس طرح اپنے خطوں کے جواب کے لیے تڑپتا رہتا تھا۔ باپ کے ساتھ اس کی وابستگی اور اس کی مایوسی میری نظر سے چھپی نہ تھی میرے دل کو چوٹ لگتی تھی۔ لیکن میں بے بس تھی۔ اسے یہ بتا کر تو تسلی نہیں دے سکتی تھی کہ اس کی ماں کس طرح سے اپنے خطوں کے جواب کے لیے تڑپا کرتی تھیں۔ وقت گزر گیا یادیں رہ گئیں آج ماشاءاللہ وہ بھی بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔ کتنا فخر ہوتا تمھاری ماں کو تم دونوں پر اگر وہ زندہ ہوتیں۔

جو اختر صفیہ آپا کی زندگی میں اپنے کو کائنات کا محور سمجھے بیٹھے تھے اور خوش و نازاں تھے اپنے ارد گرد ذرّوں کے رقص سے کسے معلوم تھا کہ خود دل میں ذرہ بننے اور رقص کرنے کی آرزو پال رہے ہیں۔ جادو مجھے لگتا ہے جس شمع کے گرد مرحوم رقص کرنے کی آرزو پال رہے تھے اس کے لیے غیر شعوری طور ہی پر سہی ان کے لیے ظاہری حسن کی بہت اہمیت تھی اور تم جانتے ہو تمھاری ماں کا حسن انکا شعور تھا ان کی ذہانت تھی۔ اور اس سے تم بھی انکار نہیں کرو گے کہ خدیجہ بہن کا شمار حسینوں میں نہ ہو پر تھا ان میں ایک خاص قسم کا بانک پن ایک خاص قسم کی کشش۔ نازک اندام چھبیلی اور خوب صورت سی چیز۔ مجھے یاد ہے جب تمھارے باپ ہم سب سے ملانے انھیں علی گڑھ لائے تھے۔ ان کے پاؤں میں مہندی لگی ہوئی تھی اور پاؤں میں چاندی کی پائل تھی، بات بات پر بات یاد آتی ہے ہم دونوں بہنوں کی ہی شادی اس وقت ہوئی جب ہم پندرہ سولہ سال کی کچی کلی کی حد کو پار کر چکے تھے۔ ملازمت پیشہ اور سوچ و شکل

---

1. خدیجہ بہن یعنی بھائی اختر کی دوسری بیوی کا بیٹا۔
2. خدیجہ کی بہنیں۔
3. جان نثار اختر کے خطوط۔
4. خدیجہ کے نام۔

دونوں ہی میں پختہ۔ لیکن شادی کے بعد کئی دن تک صفیہ آپا اپنے ماتھے پر وہ جھومر لگائے رہی جو نہ چڑھاوے میں آیا تھا نہ ہی جہیز میں دیا گیا تھا۔ فاطمہ بہن اختر کی پسند کا خیال کر کے عاریتاً لائی تھیں۔ سچ جانو صفیہ آپا کے چہرہ پر یہ جھومر بالکل زیب نہیں دے رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ انھیں خود بھی احساس رہا ہوگا۔ لیکن والدارئ محبوب تو ایمان تھا اور اس ایمان میں آخری سانس تک لرزش نہ ہوئی۔

یقین کرو جب میں نے خدیجہ بہن کے نام تمھارے باپ کے خطوط پڑھے مجھے ذرہ برابر سعیدہ عذرا وغیرہ سے رقابت نہیں محسوس ہوئی میں نے بھی تو تمھارے باپ کی کلائی میں راکھی باندھ کر اور ماتھے ٹیکہ لگا کر ان کے چونچلے نہیں کیے تھے۔ سو مجھے شکایت کا کیا حق کہ میں اس قسم کے پیار اور تحائف کی حصہ دار نہیں بنی جو خدیجہ بہن کی بہنوں کے حصہ میں آئے۔ لیکن اس کا اعتراف ضرور کروں گی ایمانداری کا تقاضہ ہے مجھے غصہ آیا اور خدیجہ غریب سے ہمدردی بھی۔

تمھارے باپ کی علمی وادبی صلاحیتوں سے مجھے انکار نہیں۔ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ میری بہن اس ذہنی تربیت کی ضرورت سے بے نیاز تھیں جو بیچاری خدیجہ پر لادی گئی۔ اس لحاظ سے میری بہن اگر تمھارے باپ سے برتر نہیں تو ہم پلہ تو ضرور تھیں۔ لیکن کیا تم بچوں کو باپ کی رہبری کی ضرورت نہ تھی۔ اپنی نئی دوست کی ذہنی اور اصلاحی تربیت کے لیے وہ اپنے پر راتوں کی نیند حرام کر کے صفحہ کے صفحہ سیاہ کرتے رہے اردو ہندی اور انگریزی ادب سے انھیں روشناس کرانے کے لیے۔ خواہ شاعری ہو خواہ افسانہ نویسی یا ڈرامہ نگاری۔ یہاں تک کہ آرٹ اور مصوری کے نکات سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ زندگی کی ارتقائی تاریخ کو ظاہر ہے چھوڑا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ ہر موضوع پر کتابیں ڈھونڈ کر پارسل بھیجے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ چینی فرانسیسی اور روسی ادب سے ان کے ترجموں کے ذریعہ واقفیت کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جادو انکار نہ کرنا۔ احسان فراموشی ہوگی ۱۹۸۱ میں یہ کتاب چھپی اس وقت اگر تم نے پڑھی ہوگی تو تم نے بھی اس سے بہت کچھ حاصل کیا ہوگا دیر آید درست آید والی بات ہوئی۔ خاموش آواز میں خطوں کی ابتدا ۵۴ سے ہے تمھیں یاد ہوگا کہ اس وقت اور اس کے بعد تم ایسے دوراہے پر تھے کہ اگر قدم صحیح راہ پر نہ پڑتے تو کام سے گئے تھے۔

بہت زمانہ ہوا شبانہ نے مجھ سے پوچھا تھا اماں آپ نے کبھی سوچا تھا کہ جادو اس مقام پر ہوں گے میرا جواب تھا مقام کا تعین تو ممکن نہ تھا البتہ آثار یہ کہتے تھے کہ یہ لڑکا جیل کی سلاخوں

کے پیچھے ہو گا یا کچھ کر گزرے گا۔ جادو اعتراف ہے کہ تم بہت کر گزرے۔ تمھاری بہت سی باتوں سے دل دکھتا ہو لیکن اس سے انکار نہیں کہ مجھے تم پر فخر ہے۔ لیکن جادو تم دونوں بھائیوں کو اپنے باپ سے کتنی رہبری ملی تم خود اس سلسلہ میں مجھ سے بہتر فیصلہ کر سکتے ہو۔ مجھے تو صرف یہ یاد ہے کہ میں تمھاری حرکتوں کے سلسلہ میں خط پر خط لکھتی رہتی تھی اور جواب سے محروم رہتی تھی مجھے احساس تھا کہ اس عمر کے لڑکوں کو باپ کی کتنی ضرورت ہوتی ہے اور تم دونوں تو ماں سے بھی محروم تھے خدیجہ کے بہنوئی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے جو سو فیصدی صحیح ہے۔ خالہ خالہ ہی ہوتی ہے ماں کی جگہ نہیں لے سکتی۔ اردو زبان میں یہ کہاوت کتنی فضول ہے خالہ ماں سے اعلیٰ پر جادو میں نے تمھیں بہت چاہا ہے اپنی حد بھر۔ بس اتنا یاد رکھنا جانے میں کہاں سے کہاں بہک گئی۔ ذکر تھا تمھاری ماں کا۔

تمھاری ماں کی علمی ادبی صلاحتیں پنپ سکتیں اس کا زندگی نے انھیں موقعہ ہی کب دیا۔ انھوں نے اپنی پوری سکت اور صلاحیتوں کو تمھارے باپ کی دلداری میں صرف کیا ان کی شخصیت کے الجھاؤ کو سلجھانے میں لگا دیا۔ لیکن بلند پایہ ادب نوازوں کا یہ خیال ہے کہ ان کے خطوں میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے جو جواہر پارے مل جاتے ہیں وہ ان کی علمی معلومات اور فکری گہرائی کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔ انھوں نے سرور صاحب اور احتشام صاحب کی تنقید نگاری پر جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ سنو۔ "سرور صاحب کا حال تو بس یوں بھی ہے اور یوں بھی والا ہے۔ احتشام صاحب ٹھہرے شریف نقاد۔ در اصل ہمارے ادب کو ایک میلنکسی کی ضرورت ہے۔ نقاد کا رویہ مصنف کی طرف ہمدردانہ ہونا چاہیے لیکن تنقیدی اصولوں کو نرم کرنے کی اجازت تو نہیں دی جا سکتی۔" کیا کچھ نہیں کہہ گئیں تمھاری ماں ان چند جملوں میں۔ انھوں نے تو اس سلسلہ میں اپنی عزیز ترین ہستی پر بھی انگلی اٹھانے سے گریز نہیں کیا۔ ایک جگہ لکھتی ہیں تمھاری نظم سرور صاحب کی نظم سے اچھی ہے لیکن بعض بعض جگہ بمبئی کا رنگ جھلکتا ہے۔" کسی اور جگہ کہتی ہیں "غزل جو تم نے لکھی ہے تم سے کم از کم دو سو سال پرانے شاعر کا رنگ تغزل لیے ہوئے ہے تمھیں کیا سوجھی۔ پھر بھی اس کے چند اشعار میرے دل میں چبھ گئے۔" ان کے مضامین کا مختصر سا مجموعہ "انداز نظر" اور ان کے خطوط ان کی ادبی صلاحیتوں کا ثبوت ہیں۔ ان کی بے وقت موت سے اردو ادب کا کتنا نقصان ہوا یہ تو اہلِ ادب ہی بتا سکتے ہیں۔

شاید میری بہن کے لیے حاصل زندگی یہی تھا کہ وہ تمھارے باپ کو بقول فاطمہ بہن کے جینے اور مرنے کا سلیقہ سکھا گئیں محبت اور رفاقت کے صحیح معنوں سے واقفیت دلا گئیں۔

لیکن وہ ایک سبق سے نابلد رہے کہ جو چلا گیا وہ چلا گیا۔ بیچارے کتنے معصوم تھے خدیجہ کے اندر صفیہ کو تلاش کرتے رہے۔ جانے ان کو اس کا احساس ہو پایا یا نہیں کہ ان کے اس عمل سے بیچاری خدیجہ پر کتنا اور کس قسم کا بوجھ پڑا ہو گا۔ کون جانے اگر وہ خدیجہ میں صفیہ کے باطن کی تلاش میں تھے ان کی سوچ کی گہرائی۔ علم کی وسعت۔ اصولوں اور ارادوں کی پختگی کی۔ تو صفیہ میں انجانے طور خدیجہ کے ظاہری کشش اور حسن کے متلاشی رہے ہوں گے۔ میں بتا چکی ہوں ایک وقت خدیجہ انتہائی جاذب نظر تھیں صورت و شکل کے لحاظ سے۔ مرحومہ کی سیرت کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتی، ان سے میری واقفیت بہت کم رہی۔ تمھیں وہ قبول نہیں کر سکیں۔ یہ کوئی آسان کام بھی نہ تھا۔ بہر حال ایسا لگتا ہے کہ تمھارے باپ تشنہ ہی رہے۔ بے چارے۔

اپنی بہن کی زندگی کی محرومیوں اور مایوسیوں پر اگر غصہ کروں تو کس پر اور ملامتیں بھیجوں تو کس پر۔ اگر ان کی ناقدری کا شکوہ کروں تو کس سے اور الزام رکھوں تو کس پر۔ جیسے وہ میرے سامنے کھڑی ہوں اور کہہ رہی ہوں۔ تم کیا جانو کیا سمجھو۔ تم میں تو ہمیشہ سے تخیل کی کمی رہی۔ میں نے جس کو دل و جان سے چاہا جس کی پرستش کی جس کی پوجا کی تم اس کی طرف انگلی اٹھا رہی ہو اس پر کیچڑ اچھال رہی ہو، خدارا مجھے اس تکلیف سے تو محفوظ رکھو۔ میرے قلم کی راہ میں ان کی یہ تحریر حائل ہو جاتی ہے۔ "دوست مجھے تم سے جو ملا وہ دنیا میں تم ہی سے مل سکتا تھا۔ زندگی کے عظیم الشان تجربے، سماج کی عزت بچے، کردار شخصیت سب ہی کچھ تو میں نے تم سے پایا۔۔۔ تمہیں پا کر مجھے زندگی میں کسی کی بھی ضرورت باقی نہ رہی کتنی بھٹکی زندگی کتنے متلاشی جذبات کو پناہ مل گئی۔ اختر تم میرے لیے بہت قیمتی ہو زندگی کے برابر تم ہی سے جینا ہے تمھیں سے مرنا۔"

جو جذبات اور احساسات ان کے خطوں کے ہر ہر لفظ سے جھلکتے ہیں۔ کون ہے جس کی آنکھیں پرُنم نہ ہو جاتی ہوں۔ کون ہے جو ان کے ان الفاظ کی صداقت پر شبہ کرتا ہو۔ اس کے لکھنے والے نے اپنا سب کچھ راہِ وفا پر لگا دیا۔ میں تو میں ہوں کوئی بھی نہیں بتا سکتا کہ اس نے کیا کھویا کیا پایا۔

جادو کاش میرا یہ عقیدہ مضبوط ہو تا کہ میری بہن ستاروں کے پیچھے سے دیکھ رہی ہے اور مسکرا کر سر اونچا کر کے کہہ رہی ہے۔ دیکھو نا میرے بعد اختر کی شاعری نے کس بلندی کو چھوا ہے۔ "خاک دل۔ گھر آنگن جیسی تخلیق کی عظمت کو تم کیا پہچانو گی تم تو ہمیشہ سے شعر و

شاعری سے دور رہیں۔ لیکن دیکھو نا اختر کی شخصیت میں کتنی پختگی آ گئی ہے۔ شاید اپنے اختر سے یہ بھی کہہ رہی ہوں اب میری تلاش چھوڑ دو ورنہ آسودگی سے دور ہی رہو گے۔ دیکھو نا میرے بچے کس طرح پھل پھول رہے ہیں شہرت ہے دولت ہے عزت ہے اس میں شک نہیں کہ ان کے خواب بہت حد تک پورے ہوئے لیکن موت کے بعد کیا موت انتظار نہیں کر سکتی تھی، لیکن ان کے لیے کون کہہ سکتا ہے موت زیادہ ظالم ثابت ہوئی یا زندگی۔ انھوں نے اول دن ہی سے حصول مقصد کے لیے اونچی سے اونچی قیمت ادا کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ "میرے دل کی گرمی میرے سینہ کا گداز میرے ذہن کی روشنی میری کلائی کی مضبوطی یہ سب کچھ تمھارے راستہ میں صرف ہو گی۔ " یہ سب کچھ صرف کرنے کے بعد چند سانسیں ہی تو ان کے پاس رہ جاتی تھیں، ان کے حصول مقصد کی قیمت کی، یہ سانسیں تھیں آخری قسط۔ شاید اس آخری قسط کی ادائیگی کے بعد ہی انھیں سکون مل سکا ہو۔ کون جانے۔ لیکن جادو اپنی اِس سوچ سے میں اپنے دل کو کیوں کر سمجھاؤں جس کے سامنے ان کی تڑپتی ہوئی تمنائیں۔ ترستی ہوئی آرزوئیں دم توڑ رہیں تھیں۔ ان نگاہوں کو کیسے بھول جاؤں جو کہہ رہیں تھیں اختر کا خیال رکھنا۔

جادو مرنے والا چلا جاتا ہے اپنی یادیں اور کچھ پچھتاہٹیں ضرور چھوڑ جاتا ہے۔ پھر صفیہ جیسی بیوی، بھائی اختر کو اگر کچھ پچھتاہٹیں تھیں تو انھوں نے اپنے دل ہی تک رکھیں۔ اظہار سے حاصل کیا تھا۔ مزید رسوائی مزید بدگمانی، البتہ یادوں کا اظہار دل کھول کر کیا۔ "نئی بیوی کے نام خطوط" کے مجموعہ کے صفحات پلٹ کر دیکھو جگہ جگہ تمھاری ماں کی تحریروں اور گفتگو کے حوالے ملتے ہیں۔ یہ یادیں خوب صورت درد انگیز اور درد آمیز تمھارے باپ کی زندگی کے آخری لمحہ تک ان کے ساتھ رہیں۔ شاید اسی کو صفیہ کی فتح کہا جا سکتا ہے۔

خدیجہ کو مخاطب کر کے ایک جگہ لکھتے ہیں "اچھا خدیجہ تم کبھی خیال تو نہیں کرتیں کہ تم سے اچھی خاصی باتیں کرنے میں صفیہ کا تذکرہ نکال لیتا ہوں۔ بہر کیف اس کے لیے میں تم سے کوئی معذرت نہیں کروں گا۔ یہ تو میری زندگی کا راز بن گیا ہے شاید تمھیں چاہنے کا راز بھی یہی ہے، تمھاری بعض باتیں صفیہ کی یاد دلاتی ہیں۔ اسے تم میری کمزوری سمجھو یا کچھ بھی۔ مجھے جیتنے کا راز صفیہ کو چاہتے رہنے میں ہے۔ تم اس راز کو جانتی ہو۔ یہ مجھے معلوم ہے۔ پھر بھی تم اپنی اور میری باہمی محبت میں اس راز کو بھلا نہ دینا ورنہ اسی لمحہ مجھے کھو دو گی"۔
(خاموش آواز)

یہ بات الگ ہے صفیہ کی چاہت صفیہ کی بے زبان اور خاموش تصویر پر روزانہ صبح ایک تازے پھولوں کی مالا پہنانے ہی تک محدود رہ گئی۔ صفیہ جو دو اُدھ کھلی کلیاں چھوڑ گئیں تھیں وہ آبیاری سے محتاج رہیں۔ اسے تو صفیہ کی دلی دعاؤں کا معجزہ سمجھنا چاہیے یہ کلیاں اس طرح کھلیں کہ زمانہ حیران رہ گیا۔ خدا تم دونوں بھائیوں کو نظر بد سے محفوظ رکھے۔

اکثر بال بچوں والا مرد دوسری شادی کرتا ہے تو ان بے ماں کے معصوم بچوں کو نئی بیوی کے سپرد یہی کہہ کر کرتا ہے۔ اب تم ان کی ماں کی جگہ ہو اب تم ان کو اپنا جانو۔ اکثر مرد جانے جان بوجھ کر یا انجانے میں اپنے کو یہ دھوکا دیتے ہیں کہ وہ دوسری بیوی لا ہی رہے ہیں بچوں کی خاطر۔ یہ دنیا کا دستور ہے ایمان کی بات ہے بھائی اختر نے یہ نہیں کہا۔ ان کے یہاں ایک جدت ہے۔ شادی سے پہلے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "تم میرے لیے ایک نئی زندگی لے کر آ رہی ہو۔ مجھے نہیں معلوم تمھاری کیا کیا توقعات مجھ سے ہیں۔ تم مجھے چاہو یا نہ چاہو صفیہ کو ہمیشہ چاہتی رہنا اور صفیہ کو چاہنے کے ایک عملی معنی ہیں۔ تم اس کے بچوں کو وہ پیار و محبت دے سکو جس سے وہ محروم ہو گئے ہیں" شاید یہ ایک ناممکن سا مطالبہ تھا لیکن پھر بھی مطالبہ تو تھا۔

جادو ایسا کیوں ہے کہ یہ جانتے ہوئے کہ تلخ یادیں محض تکلیف دینے کے لیے ہوتی ہیں انھیں بھلایا نہیں جا سکتا۔ اسی بمبئی میں جس میں شاہد کے اسکول میں داخلے کے لیے تمھارے باپ نے کیا کچھ دوڑ دھوپ نہیں کی تھی تمھارا اٹھکانہ نہ بن پایا۔ تمھیں تو یاد ہو گا ہائی اسکول کرنے کے بعد کتنی ضدیں کر کے تم مجھے چھوڑ کر بمبئی گئے تھے۔ جانے تمھارے کمسن دل و دماغ میں کیا کیا امیدیں رہیں ہوں۔ بمبئی جیسے چمکتے دمکتے شہر کی زندگی کے کتنے سنہرے خواب دیکھے ہوں۔ مجھے نہیں معلوم۔ لیکن اس وقت تمھاری قسمت میں بمبئی میں اپنے باپ کا گھر نہ تھا تم بھوپال سسرال والوں کے سپرد کر دیے گئے۔ میرے دل کو جو دکھ پہنچا اسے چھوڑو۔ لیکن میرا دل کہتا ہے کہ اگر تمھاری ماں کی بے جان تصویر بول سکتی تو اختر کے تیور بھی برداشت کر لیتی اور بول اٹھتی۔ خدارا اس پھول کی مالا کو مجھ پر سے ہٹا لو میرا پھول تو میرا جادو ہے اس کو تازہ و توانا رکھو۔ پہلی اولاد سب ماؤں کو بہت زیادہ پیاری ہوتی ہے وہ عورت کی ممتا کے لیے ایک انمول کھلونا ہوتی ہے۔ پر تم تو اپنی ماں کے لیے بہت ہی اسپیشل تھے ان کے اختر کا اوتار تھے۔ کم از کم بھائی اختر تو یہ جانتے تھے۔

کئی جگہ بھائی اختر نے خدیجہ کو لکھا ہے میری صفیہ بن کر میرے پاس آؤ۔ آؤ تمھیں پا کر وہ

سب کچھ پالوں جو مجھ سے چھین لیا گیا ہے۔۔۔۔ خدیجہ صفیہ میرے لیے تم میں زندہ ہو گئی ہے وغیرہ وغیرہ، یہ تو وہ مرحوم ہی جانیں کہ صفیہ کو انھوں نے کتنا کھویا اور کتنا پایا۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ نہ ان کے بچوں کو ان کی ماں مل سکتی تھی نہ مجھے اپنی بہن۔ یہ ان ہونی بات ہوتی بھی تو کیسے!

کسی نے مجھ سے کہا جاں نثار اختر نے اپنی ان یادوں سے کفارہ ادا کر دیا۔ میں تو صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ اگر انھوں نے کفارہ کی ادائیگی کی ضرورت محسوس کی تو وہ ادائیگی ان یادوں سے نہیں بلکہ حرف آشنا، اندازِ نظر اور زیر لب کی اشاعت سے ہوئی۔ مجھے اس اعتراف میں جھجک نہیں کہ جب یہ خطوط چھپے مجھے بھی اپنی بہن کے بعض دوستوں کی طرح تکلیف پہنچی تھی، وہ راز جو انھوں نے اپنوں سے بھی چھپا رکھے ہر خاص و عام کے سامنے آ رہے تھے۔ وہ باتیں جو صرف محبوب کے کانوں کے لیے تھیں ایرے غیروں کی اشک باری کا سبب بن رہی تھیں۔ دوسرے ان کے حال پر آہیں بھریں آنسو بہائیں ان کی غیرت کو کتنی چوٹ پہنچ رہی ہوگی۔ یہ تھی میری سوچ جادو ایسا نہیں کہ میں نے اپنی بہن کو کبھی روتا نہیں پایا، انسان تھیں گوشت پوست کی تھیں پتھر کی نہ تھیں۔ لیکن آنسو بہائے تو چھپ کر اور پھر منہ دھو کر مسکراتی ہوئی باہر نکلیں اور پھر وہی اختر کا لاڈ و پیار سے ذکر۔ بارہا ایسے موقعہ آئے پر میں نے ہمیشہ اپنا منہ پھیرے رکھا۔ انجان بنی رہی۔ مجھے معلوم تھا کہ وجہ تکلیف ایسی ہی شدید رہی ہوگی جو میری باحوصلہ بہن کو لمحاتی طور پر کمزور کر گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کے لیے یہ احساس شدید تکلیف کا باعث ہوگا کہ ان کے زخم پر کسی اور کی نظر پڑی۔ ان خطوں کے چھپنے کے بعد ان کے زخم ہر کس و ناکس کے سامنے تھے۔

آج شاید عمر کی بات ہے جذبات سے پرے ہو کر سوچ سکتی ہوں۔ بھائی اختر کی جرأت سے انکار نہیں کر سکتی۔ بلا لحاظ اس کے ان خطوط میں ان کی کیا تصویر ابھرتی ہے۔ ایک شخصیت چاہت کی شدت سے بھوکی لیکن چاہنے کے سلیقہ سے قطعی ناواقف جس کے لیے چاہے جانا اور چاہنا ہم معنی تھا۔ زیر لب، حرف آشنا اور اندازِ نظر کی اشاعت نے ہی صفیہ کو اپنا مقام دیا اب وہ محض، جاں نثار اختر کی بیوی مجاز کی بہن اور جاوید اختر اور سلمان اختر کی ماں ہی نہ رہی۔ اس کی اپنی شناخت ہے اپنی پہچان ہے۔ اردو ادب میں وہ ایک ایسے اسلوب نگارش کی نمائندہ ہے۔ جس میں بقول باقر مہدی "درد کی آنچ اور شبنم کی خنکی کا امتزاج ہے" وہ ان ادیبوں میں سے ہے جس کی نگاہیں علمی اور ادبی مسائل پر دور رس ہیں۔ مطالعہ وسیع اور شعور پختہ ہے۔ گو کہ ان کے اپنے لیے تو صرف جاں نثار اختر کی بیوی ہونا کافی تھا۔ وہ نام و نمود سے بالکل بے

نیاز تھیں۔ شاعر کی بیوی ہونا اپنے لیے کافی سمجھتی تھیں پر ساتھ ہی ساتھ ان اقدار کی نمائندگی بھی کر رہی تھیں جو آج کی عورت کی منزل ہے جو آج کی فیمینسٹ تحریک کی بنیاد ہے خود اعتمادی، اپنے مسائل کا مقابلہ کرنے کی جرأت، اپنے قوت بازو پر بھروسہ اور مرد کے شانہ بشانہ چلنے کی سکت ساتھ ہی ساتھ نسائیت کی ملائمت و نفاست۔ ممتا کا جذبہ ایثار و قربانی۔ کہاں ہے اس امتزاج کی مثال۔ زندگی نے ان کے ساتھ انصاف نہیں برتا۔ آخر کیوں؟ ہے کوئی جواب۔

لوگ کہتے ہیں تمھاری بہن مری نہیں وہ تو حرف آشنا، زیر لب اور انداز نظر کے ذریعہ زندہ ہے۔ تمھارا بھائی بھی نہیں مرا "آہنگ" اس کی زندگی کی ضمانت ہے۔ جب تک اردو زبان زندہ ہے تمھاری بہن اور بھائی زندہ ہیں۔ جادو میں اس سطح پر نہیں کہ میرے لیے یہ تسکین کافی ہو، میں اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں وہ اندر ہی اندر روتا ہے ان جوان موتوں پر ان کی محرومیوں پر ان کی ناقدریوں پر ـــــ

جادو دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ میں اپنے ان بے ربط احساسات اور ان امنڈتی ہوئی دکھ بھری یادوں کو مضمون کی شکل کیوں کر دوں۔ خط بہت ہی طویل ہو گیا تم مجھے نہ ہی چھیڑتے تو اچھا تھا۔

تمھاری دعاگو

اماں